سوانح بہادر یار جنگ

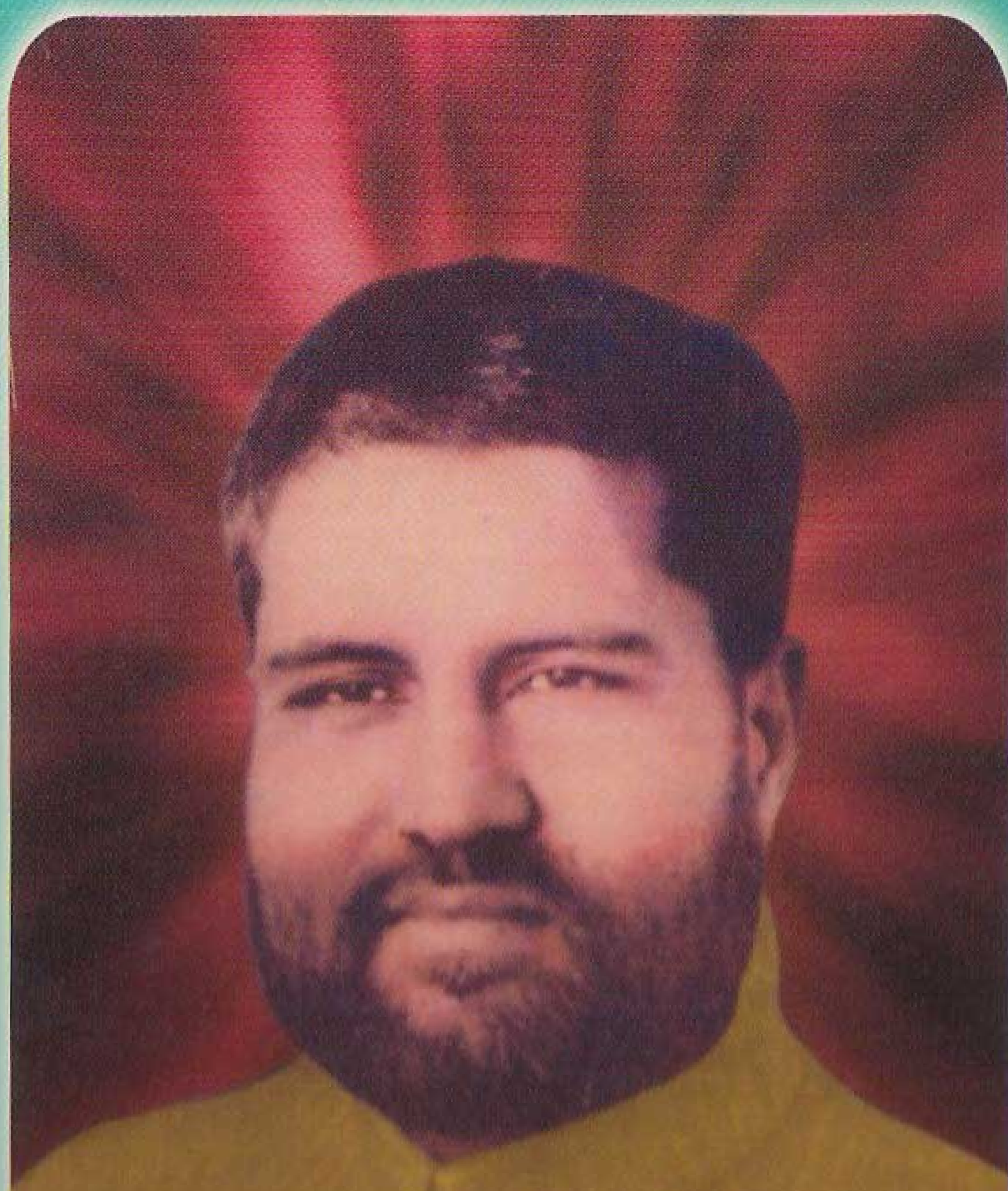

نذیر الدین احمد

اللہ اگر توفیق نہ دے
انسان کے بس کا کام نہیں

رضائے الٰہی کا حصول آساں ہے ہمارے نفس امارہ کی رضا ہی مشکل ہے۔ اللہ جن بندوں پر اپنے فضل کی بارش فرماتا ہے تو وہ صرف اپنے لیئے نہیں جیتے بلکہ اپنی اللہ کی دی ہوئی دولت کو کار خیر ہی میں خرچ کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دے کر قرب الٰہی کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رہنماوں کی یاد سے وابستہ ذکر وفکر اور ان کے ارشادات کی اشاعت‘ غریبوں کو ان کی ضروریات حصول تعلیم‘ غریب بچیوں کی شادیاں‘ بلاسودی قرض کی اجرائی کے لیئے باضابطہ ٹرسٹ بنا کر اس فیض جاریہ کو جاری رکھتے ہیں امریکہ میں مقیم ڈاکٹر حیدر محمد خاں صاحب نے نومبر 2010ء میں ٹیلفون پر مجھ سے کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں گفتگو فرمائی اور اپنی طرف سے اس کام کے لیئے ایک لاکھ روپیئے ایک ہفتے میں اپنے دوست صادق محمد خاں صاحب سابق معتمد انجمن مہدویہ اور ڈاکٹر صاحب کے برادر نسبتی کے ذریعہ روانہ فرمادے۔ ہماری خواہش تھی کہ کے ڈاکٹر صاحب کے اس عظیم احساس کے سلسلے میں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ لکھیں مگر وہ بمشکل صرف ان دو انجمنوں کا ذکر کیا جو امریکہ میں ہیں جس کے وہ سرگرم رکن ہیں ۔ (Currently I am affiliated with the following organizations in the US : Indian Muslim Council - USA (IMC-USA),www.imc-usa.org, and Indian Muslim Educational Foundation of North America (IMEFNA) وہ ہر ٹرسٹ اپنے والد مرحوم محترم نذر محمد خاں صاحب جو ایک ریل حادثہ میں شہید ہوئے ان کے ایصال ثواب کے لیئے دیتے ہیں۔ جس سے والد سے ان کی عقیدت ومحبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہماری دعا ہے اللہ محترم نذر محمد خاں صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے امین۔ نیک اولاد خود حشر تک ثواب جاریہ ہوتی ہے مگر

یہ داغ تا زندگی رہے گا
تیرا داغ دل میں نشانی رہیگا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلہ مطبوعات بہادر یار جنگ ۲

سوانح

بہادر یار جنگؒ

سوانح نگار

نذیر الدین احمد بی۔او۔ایل (عثمانیہ)

ناشر

بہادر یار جنگ اکیڈمی

حیدر آباد۔ آندھرا پردیش (انڈیا)

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	سوانح بہادر یار جنگ جلد دوم
سوانح نگار	نذیر الدین احمد بی-او-ایل (عثمانیہ)
طبع اول	جنوری ۱۹۸۸ء
طبع دوم	فبروری ۲۰۰۷ء
صفحات	۳۰۴
تعداد	پانچ سو
کمپیوٹر کتابت	الاکرم گرافکس، سعید آباد، حیدرآباد
طباعت	اے-ایس گرافکس، حیدرآباد
قیمت	-/150 روپئے

ناشر

بہادر یار جنگ اکیڈمی

'ایوانِ رضوان' 13-6-437/1/8/A بہادر یار جنگ کالونی

قادر باغ، حیدرآباد-008 500 آندھرا پردیش (انڈیا)

فون : 23513917 - 040

۲

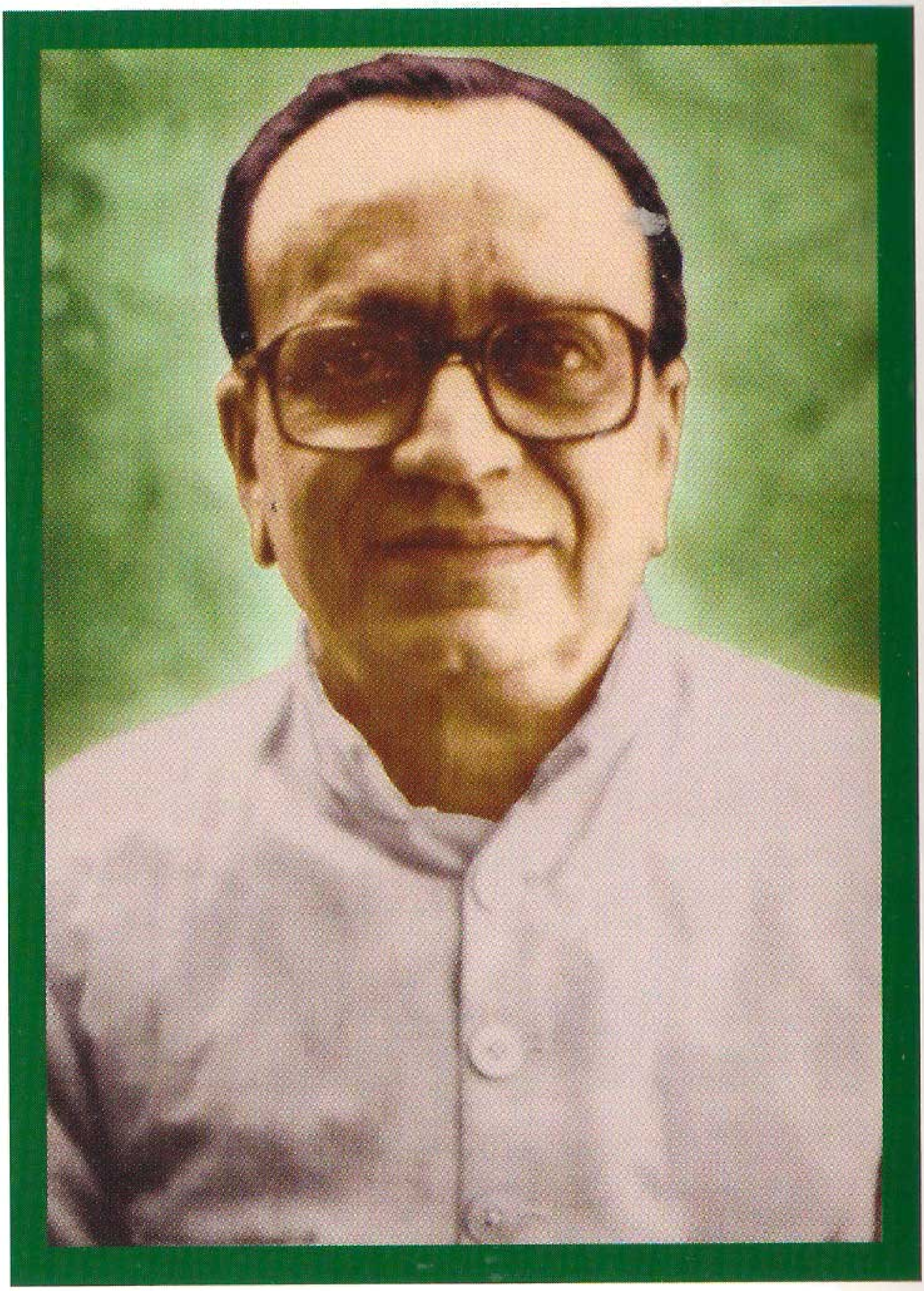

نواب عابد علی خاں مرحوم

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
قضا کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

تاریخ پیدائش
۱۹/مارچ ۱۹۲۰ء

تاریخ وفات
۱۲/نومبر ۱۹۹۲ء

انتساب

زیرِ نظر کتاب سوانح بہادر یار جنگ جلد دوم اپنے محسن اور قائدِ ملت کے شیدائی نواب عابد علی خاں کے نام معنون کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرر ہا ہوں۔نواب عابد علی خاں صاحب کو بہادر یار جنگ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی۔ میرے نواب سے ۴۰ سالہ روابط تھے۔

نواب عابد علی خاں کی شخصیت حیدرآباد کی ایک تاریخ ساز شخصیت تھی۔ عوام و خواص میں یہ اُردو زبان کی خدمت ، عوامی مسائل کے حل میں دلچسپی ، اہل ضرورت کی مدد اور اپنے اخبار سیاست کے ذریعے مسائل کے حل اور صحت مند صحافت کی زندہ مثال ، اپنی وضعداری ، شرافت نفس ، نوجوانوں کی ہمت افزائی جیسے اعلیٰ صفات سے متصف تھے۔ یہ ایک پر خلوص انسان تھے۔ اس ہنگامۂ ہستی میں قدرت نے خلوصِ سدا بہار کی نعمت سے انھیں نوازا تھا۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں اُردو کے اس خدمت گذار کا نام ، آج بھی آفتاب کی طرح روشن ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نذیرالدین احمد

◆◆◆

فہرستِ مندرجات

- تعارف ۵
- خطابت ۶
- قیادت ۲۵
- جیوری ۳۶
- ملکی تحریک ۳۸
- رکنیت مجلس صفائی ۴۰
- درسِ قرآن ۴۳
- درسِ اقبالؔ ۶۵
- درسِ تاریخ اسلام ۶۷
- اتحاد بین المسلمین —— اتحاد المسلمین ۶۸
- راہِ انقلاب —— مجلس کی نشاۃ ثانیہ ۸۰
- چند انتخابات ۸۸
- پہلی گفتگو مفاہمت ۱۰۲
- مہاراجہ کشن پرشاد کے بیان پر اظہارِ تشکر کا جلسہ ۱۰۷
- تحریک رضا کاراں ۱۱۳
- خاکسار تحریک ۱۱۷
- مؤتمر مسلم نوجوانانِ حیدرآباد دکن ۱۲۸
- ڈھول پیٹ کا فساد ۱۳۰
- آہ! اللہ بندہ میاں ونواز خاں شہداء سلام ہو تم پر! ۱۳۸
- قائدِ ملت کا مرتبہ ابتدائی لائحہ عمل مجلس اتحاد المسلمین ۱۴۱
- مجلس اتحاد المسلمین سے علماء ومشائخین کی علاحدگی ۱۴۸
- صدر جمعیۃ المشائخ کا بارھواں سالانہ اجلاس ۱۵۲
- نواب بہادر یار جنگ کا دورِ صدارت مجلس اتحاد المسلمین ۱۵۸
- یادداشت بابت اصلاحات دستوری ۱۷۴
- اے-آر-پی ۱۸۰
- خطاب وجاگیر سے دست برداری ۱۸۳
- تجارت گاہ مصنوعات دکن ۱۹۳
- کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ ۱۹۷
- مجلس اتحاد المسلمین مملکتی کا نظام نامہ ۲۰۰
- حیدرآباد کی مردم شماری ۲۱۱
- شرن بسپا کا دیول ۲۲۰
- دارالسلام ۲۲۴
- عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کی ہڑتال ۲۲۷
- اسلام کا معاشی نظام ۲۲۹
- اسیرِ گیسوئے اُردو ۲۳۳
- خطوط نویسی ۲۳۹
- خوش مذاقی ۲۴۷
- فضائل نفس ۲۵۶
- تعلیم تعلیمی مسائل اور طالب علموں سے قائدِ ملت کی دلچسپی ۲۶۳
- بلبل ہند سروجنی نائیڈو ۲۷۱
- گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور ۲۷۶
- آہ ٹیگو ۲۷۸
- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۲۸۲
- علامہ اقبالؔ اور قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ ۲۹۴

تعارف

نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں میں بالخصوص حیدرآبادیوں میں سیاسی بیداری اور سماجی شعور کی تخلیق میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ کہنے کو تو وہ مسلمانوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے لیکن پکے حیدرآبادی ہونے کے ناطے وہ حیدرآبادی تہذیب، روایات، باہمی رواداری، آپسی دوستی اور فرقہ وارانہ اتحاد و یگانگت کے علمبردار تھے۔ ان کی بے وقت موت سے نہ صرف حیدرآبادیوں کا نقصانِ عظیم ہوا بلکہ اہل وطن نے ایک سنجیدہ پختہ کار انسان دوست کو اہم وقت پر کھو دیا۔

جناب نذیر الدین احمد صاحب صحیح معنوں میں نواب مرحوم کے سچے پرستار کہلانے کے مستحق ہیں۔ گزشتہ ۲۵ سال سے نواب بہادر یار جنگ کی حیات وصفات پر تحقیق کی ہے اور ان کے مضامین وغیرہ کو مرتب و شائع کر کے ملک کی سیاسی تحریک اور مسلمانوں کی اصلاح و بہتری کے لیے ان کے عظیم خیالات کو زندہ رکھا ہے۔ نذیر صاحب نے بہادر یار جنگ مرحوم پر ۱۷ کتابیں شائع کی ہیں اور اب ۱۸ ویں تصنیف ''سوانح بہادر یار جنگ'' عوام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ نذیر صاحب کا یہ ایک بہت بڑا کام ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ کسی قائد پر شخص واحد نے شائد ہی اس قدر تحقیقی کام انجام دیا ہو۔ اقطاعِ عالم کے مسلمانوں کو ان کا رہین منت ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپنی شب و روز کی محنت سے نواب بہادر یار جنگ کی عظیم شخصیت اور ایک عصر سے آنے والی نسل کو روشنی حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ نذیر صاحب کو اس اہم خدمت پر میں مبارکباد دیتا ہوں۔ یقین ہے کہ قارئین ان کے اس عظیم کارنامہ کا اعتراف کریں گے۔

نواب عابد علی خاں مرحوم

مدیر روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد

◆◆◆

خطابت

تاریخ فن خطابت کا پس منظر

عقل کا کام سوچنا اور غور و فکر کرنا ہوتا ہے اور اس غور و فکر سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں انھیں جب عقل ظاہر کرنا چاہتی ہے تو وہ نطق کا سہارا تلاش کرتی ہے، اسی لئے نطق کو آلہ عقل بھی کہا جاتا ہے، یوں تو یہ آلہ عقل دیکھنے میں ایک ذرا سی چیز ہے مگر اس کی معجز بیانی و ساحری دم کے دم میں نظامِ عالم کو درہم برہم کرسکتی ہے۔ اس طرح خطابت نطق ہی کے استعمال کی ایک معراجی منزل ہے۔

تقریر ایک فن ہے جس کی ضرورت و اہمیت و افادیت کو ہر زمانے میں یکساں طور پر محسوس کیا جاتا رہا ہے، تب ہی تو سارجنٹ نے کہا تھا :

''مقررین نے ہر ملک اور ہر زمانے میں امتیاز حاصل کیا ہے''

مقدونیہ کے بادشاہ فلپ فلیقوس نے ایک مقرر کو اس کی خطیبانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں ۱۰ ہزار باشندوں کا ایک گاؤں عطا کرتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ :

''یہ کوئی قدر دانی نہیں ہے''

فن تقریر کی اہمیت و افادیت ہی کا نتیجہ تھا جس سے متاثر ہو کر مشہور فلسفی مسٹر لاک (۱۶۳۲ء-۱۷۰۴ء) نے اپنے مرتبہ نظامِ تعلیم میں اس کے حصول کو ضروری قرار دیا۔

یہی وہ قوت ہے جس سے متاثر ہو کر آج سے دو ہزار سال پہلے ایتھنز کی سرزمین میں دُنیا کے لائق ترین انسان اور ثقافت و تمدن کے امام پر ملیش، انتیس اور لیکوں نے (۳۹۹ ق-م) مقدمہ دائر کیا تھا۔

یہ ارسطو کی مخالفت نہ تھی بلکہ خطابت کے جادوئی اثر کا اعتراف تھا جو بظاہر ''ساتھیو ہوشیار رہو، دیکھو ارسطو ایک جادو بیان مقرر ہے'' کی صورت میں ظاہر ہوا، مگر ان الفاظ کے پردے میں

خطابت کی اثر پذیری کا اعتراف پوشیدہ تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مقرر حقیقت میں شیرازۂ زندگی ہے جو اثر کے کاغذ پر اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔

گذشتہ زمانے میں اس فن کے کرشمے زیادہ تر ان ایام میں ظاہر ہوتے تھے جب کسی وجہ سے جوش و انقلاب عوام میں پیدا ہو جاتا یا عوام میں جوش و انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ جنرل ڈیریپورا نے برسوں اہل ہسپانیہ کے قلوب پر قبضہ جمائے رکھا جب وہ کسی مہم کو سر کرنا چاہتا تھا اپنے محل سے نکلتا اور عوام کے قلوب کو مخاطب کرتا بالعموم وہی ہوتا جو وہ چاہتا۔ اس فن کے جادوئی کرشمے ہر زمانے میں اپنی اثر پذیری کا لوہا منواتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے جابر گورنر وارن ہیسٹنگز پر ہندوستانیوں پر نا قابل بیان مظالم اور اذیتیں پہنچانے کے الزام میں انگلستانی پارلیمنٹ کے چند وسیع القلب ارکان نے مقدمہ دائر کیا۔ اس مقدمے میں انگلستان کا مشہور جادو بیان خطیب شریڈن وارن ہیسٹنگز کا وکیل مخالف تھا۔ ۷ گھنٹے مسلسل ہیسٹنگز کے وکیل مخالف شریڈن نے تقریر کی اس جادو بیان تقریر کا اثر یہ ہوا تھا کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جس وقت شریڈن میں تجھ پر ملامت کرتا ہوں اس لئے کہ الفاظ ادا کرتا تو سارے ایوان میں نفرت و حقارت کی لہر دوڑ جاتی۔ وارن ہیسٹنگز کے جگری دوست نے بے اختیار ہو کر دیوانہ وار انداز میں کہا : ''ہیسٹنگز تو واقعی شیطان ہے'' خطیبانہ صلاحیتیں خدا کی دی ہوئی وہ طاقت و قوت ہے جو عموماً عطا کی صورت میں اور کبھی کسب کی شکل میں عطا ہوتی ہے۔ دُنیا کی متمدن اور شائستہ قوموں نے اس فن میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ قوم گونگی ہے جس قوم میں خطیب نہ ہو اور اس قوم کی قسمت کبھی سو نہیں سکتی جس قوم میں خطیب سحر البیان ہو۔ اقتضائے زمانہ نے تقریر کے مفہوم و منشا میں وسعت پیدا کی اور اس وسعت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تقریر کے لئے کوئی خاص موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ہر عنوان پر تقریر کی جا سکتی ہے۔

چودھویں صدی کے اواخر میں علم کے سورج نے اپنی نورانی کرنوں سے دُنیا کو منور کیا، علم و تہذیب کی دولت یونان و روم ہی کی سرزمین سے عام ہوئی۔ جو قبل مسیح ہی سے مختلف علوم و فنون کا مخزن و گہوارہ تھا۔ یونان میں فلیقوس کی شورشوں کو ڈیماتھینز اور لی سیاس نے اپنی نطق کے ساحری

سے متاثر کیا، قیصر جولیس نے روم کی بدامنی کے زمانے میں اپنی فصاحت ہی کو وقت کی ضرورت کا ہتھیار ثابت کیا، انقلابِ فرانس نے مرابو کو دُنیا کے سامنے لا کھڑا کیا، اٹھارویں صدی کے جوش انگیز واقعات نے برکس فاکس اور شریڈن جیسے نامور اور فصیح و بلیغ مقررین کے نام جریدۂ عالم پر ثبت کئے۔

رومی قرطاجنوں کو شکست دینے کے بعد یہ شرط پیش کی کہ فوراً شہر خالی کر کے ۱۰ میل کے فاصلے پر دوسرا شہر آباد کیا جائے، لوگوں پر مردانی چھا گئی۔ اس موقعہ پر ایک قرطاجنی خطیب نے مظلوموں کی طرف سے آواز اُٹھائی اور کہا:

''روم کے ذلیل النفس اور سنگ دل کمینے ہم سے حسد کرتے ہیں اور مدت سے ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، ہم نے خونریزی ختم کرنے کے لئے ایسی شرطیں منظور کر لی تھیں جس کی کسی شریف قوم سے توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن اب وہ ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا وطن بھی ان کے حوالہ کر دیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ہم مر جائیں گے مگر اپنا وطن اور یہ مقدس سرزمین دشمن کے حوالے نہ کریں گے''۔

اس تقریر نے دلوں میں آگ لگا دی، پھر سے ہمتیں بندھ گئیں، حوصلے اُبھر گئے، معرکے کی جنگ ہوئی، سڑکوں پر مورچے قائم ہو گئے۔ ہر گھر ایک مورچہ بن گیا، ایک ایک مکان کو فتح کرنے کے لئے ایک ایک قدم پر رومیوں کو اپنا خون بہانا پڑا، قرطاجن میں آگ لگا دی گئی جو سترہ دن تک جلتا رہا۔ یہ بھی فن خطابت کی ساحری تھی۔

فن خطابت کی ساحری کا باب ادھورا رہ جائے گا اگر قرۃ العین کی ساحری کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ ایران کی مشہور و معروف خطیبہ تھی جس کی ساحری نے مذہب کی آڑ میں بغاوت کے شعلے بلند کئے۔ حکومت ایران نے اسے سزائے موت کی سزا سنائی، کیوں کہ اس کی آتش نوا تقریروں سے حکومت ایران میں زلزلہ پیدا ہو گیا تھا۔

''دیکھو، دیکھو یہ تمہارے بھڑکتے ہوئے شعلے جہنم کی صورت نہ اختیار کر لیں، جلدی کرو جلدی کرو۔ اگر یہ چند لمحے اور سلامت رہے گی تو سلطنت کے اندر ایک اور طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا''۔

ان انفرادی واقعات سے قطع نظر تاریخ فن خطابت یونان، روم، انگلستان، عرب اور

ہندوستان کے خطبہ کے تذکروں سے مالامال ہے۔ یونان ——— یونان کی جمہوری ریاستوں میں جس ریاست نے علوم وفنون میں اپنے نام کے جھنڈے گاڑے وہ ایتھنز کی سرزمین ہے، ان کی طبیعتوں میں جمہوری حکومت کا جوش اور آزادی کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ ان کے افراد جمہوریت پسند تھے، متواتر و مسلسل انقلابات جو ان کی طبیعتوں میں رونما ہوتے ان کے ان جذبات کی رہبری کے لئے ان کے فصحاء کو وقتاً فوقتاً تقریر کرنے کی ضرورت پڑتی۔ بعض اوقات حسبِ دستور رعایا کی طرف سے اُمورِ سلطنت پر اظہار رائے کے لئے فصحاء وقت مقرر کئے جاتے تھے۔ پالی ٹریٹس کے بعد پریفلیز نے فن خطابت کو ایک مقام دیا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے یونان کی سرزمین پر چالیس برس تک اپنی خطابت کے زور پر اپنا اقتدار جمائے رکھا، اس کے زور واثر سے متاثر ہو کر اولمپس (جیوپیٹر کا دربار مراد قسمتوں کا دیوتا) کہا جاتا تھا اس کے بعد یونان کی سرزمین نے کئی ایک نامور خطیب پیدا کئے جن میں کلی زوں، السی ایڈنبر، کرسٹی اکس اور ڈیموتھینز اور سقراط مشہور ہیں، آٹسا کریٹینز کی اخلاقی تقریروں کا دور بھی یونان کی فن خطابت کی تاریخ کا ایک یادگار باب ہے۔ مختصر یہ کہ یونان جہاں تہذیب وتمدن کا امام اور علم وفن کا گہوارہ تھا وہیں فن خطابت کا مسکن اور اس کی ابتداء وترویج کا منبع۔ دُنیا میں یونان وہ پہلا ملک ہے جس میں فن خطابت پر سب سے پہلے ارسطو نے ''ریطوریقا'' کے زیرعنوان کتاب لکھی۔

روم

اہل روم ایک وحشی اور جنگجو قوم تھی جن کا علم وفن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر یونان کی فتح کے بعد ان کے رجحانات میں انقلاب پیدا ہوا۔ اس طرح یہ علم وفن کی طرف مائل ہوئے۔ ایک عرصے تک اہل روم میں کوئی باکمال مقرر پیدا نہ ہوا۔ لیکن عرصہ بعد آسمانِ خطابت پر ایک روشن ستارہ چمکا جس کو دُنیا سسرو کے نام سے جانتی ہے، یہ روشن ستارہ بھی دُنیا کو اپنی روشنی دکھانے کے لئے اُٹھا اور حق تو یہ ہے کہ ایسی روشنی دُنیا نے بہت کم دیکھتی تھی۔ فن تقریر کو فاتحین یونان کی سرپرستی حاصل رہی۔ یونان اور روم کی قدیم تاریخوں میں بعض ایسی روایات محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہر ضرورت پر خطابت کو آلہ کار بنایا۔ سسرو کی موت کے بعد روم کی آزادی خاک میں مل گئی اور یہ فن بھی روم کی سرزمین سے رخصت ہو گیا۔

انگلستان

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اہل انگلستان میں یونانی ولاطینی زبانوں کے سیکھنے کا شوق بے حد عام ہوا۔ ان زبانوں میں علم وفن کے خزانے چھپے پڑے ہیں، اہل انگلستان ان سے خاطر خواہ متمتع ہوتے رہے، جہاں انگریزوں نے مختلف علوم وفنون یونان وروم سے سیکھے وہیں فن خطابت میں بھی ان ہی ممالک کے خوشہ چین دکھائی دیتے ہیں۔ انگلستان نے کئی ایک نامور خطیب پیدا کئے، جن میں بالڈون، گلیڈ اسٹون، جان برائیٹ، شریڈن اڈمن، برگس فاکس، چرچل، بیوں اٹیلی، ایتھونی ایڈن اپنی خطیبانہ ساحری میں بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔

عرب

عرب میں تقریر کا رواج قدیم زمانے سے تھا۔ مختلف تقاریب کے موقعوں پر مختلف خطیبوں کا آپس میں مقابلہ ہوتا تھا، ان خطیبوں کو وہ اپنے قبیلے کی زبان سمجھتے تھے۔ قبیلہ عبدالقیس دو شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک حصہ عمان میں آباد ہو گیا اور دوسرا بحرین میں جابسا جو شاخ عمان میں آباد ہو گئی، اس نے شاعری میں کمال حاصل کیا تھا اور بحرین والی شاخ خطابت میں امتیازی شان رکھتی تھی۔ اس قبیلے کے علاوہ بنو ثعبان اور بنو تمیم کو خطابت کے فن میں کمال حاصل تھا، قبائل سے ہٹ کر بعض خاندان بھی اس فن میں نامور رہے ہیں مثلاً یزید بن ابان ایک خاندانی خطیب تھا، کعب بن نوی ارضیاء عرب کا مشہور خطیب تھا۔ بیعۃ الرائے جبیر، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن عامر، مصعب بن عمر ابو تمیر، ابراہیم بن طیار النظام عرب کے جادو بیاں خطیب گذرے ہیں۔

اہل عرب ان باکمال فصحاء کی بڑی قدر کرتے تھے، کعب بن نوی ارضیاء کا جب انتقال ہوا تو اہل عرب اس کے خطیبانہ خدمات کے اعتراف میں اپنے سنہ کی ابتداء اس کے انتقال کی تاریخ سے کی جو عام الفول تک جاری رہا۔

اہل عرب کی خطابت سے دلچسپی کا اندازہ ایک بدوی کے ایک خطیب کی تعریف میں ظاہر کردہ اس جملہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''اس کی زبان اُونٹنی کی دم کی طرح حرکت کرتی اور سانپ کی طرح چلتی ہے'' عرب فصحاء کی تقریریں بڑی پر جوش ہوا کرتی تھیں، ایک بار حضرت امیر معاویہ نے صحارا ابن عباس عبدی سے پوچھا ''تم میں یہ بلاغت کیوں کر پیدا ہوئی'' وہ بولا۔ ''وہ ایک چیز

ہے جس کو ہمارے سینے کا جوش ہماری زبان پر پھینک دیتا ہے، اہل عرب اگرچہ فطرتاً خطیب ہوتے تھے تاہم وہ بھی فن خطابت کی مشق و تعلیم سے بے نیاز نہ تھے۔ ابراہیم بن جبلہ بن محترمہ السکوں اپنے شاگردوں کو خطابت کا درس دیا کرتا تھا۔ عربی زبان میں ''البیان والتبیین'' نامی کتاب جو جاحظ نے قلم بند کی، فن تقریر پر ایک مسلمہ بے نظیر کتاب سمجھی جاتی ہے۔

حضور سرور کائنات صلعمؐ اور خلفائے راشدین اہم موقعوں پر خطبہ ارشاد فرماتے، سرکار دو جہاںؐ نے حجۃ الوداع، جنگِ بدر، بیعتِ رضواں کے موقعوں پر جو تاریخی خطبے ارشاد فرمائے وہ ہماری تاریخ کا عظیم انمول اور مقدس سرمایہ ہیں۔ اسلام کی تعلیمات سے ایران، ترکستان، مصر، شام میں تقریروں نے رواج پایا۔

ہندوستان

ہندوستان کسی کمال میں کسی اہل کمال سے پیچھے نہیں رہا، ہندوستان میں اس فن کی ابتداء کب سے ہوئی اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ راجہ اشوک نے اس فن میں بہت سی جدتیں کیں ۔ یہ مذہب کے پرچار کے سلسلے میں ایک بڑا ہتھیار سمجھا جاتا رہا ہے ۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے جو ردِ عمل ہوا وہ ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اس طرح ہندوستان میں تقریر کے مفہوم و منشا میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ مختلف قومی، مذہبی اور سیاسی اداروں کے وجود نے اس فن کو مختلف قوموں میں عام کیا، تحریکِ خلافت اور تحریکِ علی گڑھ مسلم لیگ، ریاستی مسلم لیگ اور اتحاد المسلمین نے ہندوستان میں اُردو کے با کمال خطیب پیدا کئے جن میں سر سید احمد خاں، محسن الملک نذیر احمد، عزیز مرزا، مولانا محمد علی، سر سپرو، سر علی امام، قائد اعظم، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، سر ظفر اللہ خاں کے نام زبان زد خاص و عام رہے۔

لیکن ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۴ء تک ہندوستان کے گوشے گوشے میں جس خطیب سحر البیان کی آواز صور اسرافیل بنی، جو کبھی شمالی سرحدی دروازے سے گونجی تو کبھی درہ ہائے خیبر و بولان کی وادیوں سے اُبھری۔

یہ خطیب سحر البیان محمد بہادر خاں تھا، جسے قوم لسان الامت، قائدِ ملت اور بہادر یار جنگ

کے نام سے جانتی ہے۔'' ان کی روح پرور تقریر کبھی سیل جوتھی کبھی جوئے نغمہ خواں، جہاں کہیں بہادر خاں کی زبان فیض ترجمان گویا ہوئی وہاں کے باشندے بلاامتیاز فرقہ وملت ان کے بندۂ بے دام ہو جاتے اس میں شمال وجنوب، مشرق ومغرب کی کوئی قید نہ تھی''۔

اس کی تقریر تقریر نہیں بلکہ پہاڑی ندی ہے۔اس کے جملے جملے نہیں شرارے ہیں، جو کسی قوم کے صدیوں سے منجمد لہو کو رگوں میں پگھلا رہے ہیں۔

اس کی آواز آواز نہیں تھی بلکہ ایک چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی تھی جس نے قلب ودماغ کے بوڑھے اندھیرے کو ہلاک کر دیا تھا۔وہ خطیب نہیں تھا بلکہ وہ ایک جادوگر تھا جس نے خطابت اوراعجاز نطق سے ہزاروں جیتے جاگتے انسانوں کو پتھر کی طرح ساکت وصامت بنا دیا تھا۔

عجیب آتش نفس خطیب تھا، صرف اپنی شعلہ نوائی سے اس نے جنوبی ہندوستان کے بھیانک سیاسی اندھیرے کو منور کر دیا وہ جیسے اندھیرے کا دشمن تھا، جہاں اس نے اندھیرا دیکھا وہاں اس نے اپنی شعلہ نوائی سے نور کی شمعیں جلائیں۔

جہاں تاریکی دیکھی وہاں بجلی کی طرح کوند گیا، پہلے پہلے تو اس کی آواز کی گھن گرج صرف بندھیاچل اور ست پڑا کی وادیوں میں گونجتی رہی لیکن جیسے جیسے اس کی آواز جوان ہوتی رہی اس کا جادو بھی سر چڑھتا گیا۔

ایورسٹ اور ہندوکش کی چوٹیاں لرزنے لگیں۔

خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب میں تموج پیدا ہونے لگا۔

اس کی آواز کے حربے سے اس نے سارا ہندوستان فتح کر لیا تھا وہ جب بھی کسی ڈائس پر کسی مائیکروفون کے آگے آتا خطیبوں اور مقرروں کا کیا ذکر۔

لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے (سابقہ) پنجاب میں حکومت اور خاکساروں کی ہنگامہ آرائیوں نے مسلم عوام میں بے چینی پیدا کر دی ہے، مجمع میں انتشار پیدا ہو چلا تھا۔مضطرب مجمع کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا، قائداعظم کی جبیں پر شکن پڑ گئی وہ اُٹھے اوراعلان کیا۔

''اب بہادر یار جنگ تقریر کریں گے''۔ یہ جملہ جیسے سارے مجمع کو سانپ کی طرح سونگھ گیا۔ بہادر یار جنگ اپنے تنومند قد آور جسم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔اپنے نطق معجزۂ اثر سے پردۂ

سکوت کو چاک کیا اور بولتا ہی رہا، مجمع پر گہرا سناٹا طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا لاہور گونگا ہو گیا ہے، جیسے سارا لاہور چپ ہو گیا ہے۔

مسلسل کئی گھنٹے بولنے کے بعد جب وہ چپ ہوا تو ہر گوشہ شکوہ سنج تھا کہ ابھی سماعت کی پیاس نہیں بجھی ہے، ابھی کان تیری آواز کو ترس رہے ہیں۔ بہادر خاں جب چپ ہو گیا تو مجمع نے قائدِ اعظم سے درخواست کی کہ اب ہم آپ کی مخاطبت کے لئے بے چین ہیں مگر قائدِ اعظم نے اُٹھ کر بھرے مجمع میں حقیقت کا اعتراف کیا کہ : ''بہادر یار جنگ کے بعد کسی کا بولنا غلطی ہے''۔

(حوالہ : ابراہیم جلیس مضمون بعنوان بہادر یار جنگ)

لسان الامت کی اوائل عمری سے فن خطابت سے دلچسپی

نواب صاحب کو اوائل عمری سے فن تقریر سے دلچسپی رہی۔ ۷ سال کی عمر سے یہ شوق ان میں پیدا ہوا۔ اسی طبعی رجحان کا اثر تھا کہ اچھے مقررین کی تقریر سنتے اور ان تقریروں سے استفادہ کرتے۔ ۱۹۲۷ء سے قبل کی تقریروں کے بارے میں کوئی مواد نہیں ملتا۔ البتہ ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء کی ڈائری سے جب کہ نواب صاحب کی عمر ۲۲/ سال تھی، ان کی تقریروں کے بارے میں کچھ مواد ملتا ہے۔ ۱۹۲۸ء کے ایک بڑے جلسے میں تقریر کا بطورِ خاص ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں :

کل ڈاکٹر محمد حسین صاحب اسٹاف سرجن مہاراجہ بہادر کے مکان پر مجلس میلاد مقرر تھی، ان کے فرزند مولوی عبدالمنان صاحب نے مجھے بھی تقریر کرنے کو کہا تھا، حیدرآباد کے چنندہ و منتخب علماء و مقررین نے تقریریں کیں۔ مجھے اتنے بڑے مجمع میں تقریر کرنے کا پہلا موقعہ تھا۔ مگر الحمدللہ ''حبِ رسولؐ'' کے زیرِ عنوان میری تقریر پر لطف دلچسپ و مرتب رہی، سب نے پسند کی''۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی ڈائری مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۹، ۱۰)

۱۹۲۸ء تک نواب صاحب خطیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

''نواب مرحوم جادو بیاں مقرر تھے، کم عمری ہی سے اس کی عادت ڈالی تھی''۔

(حوالہ : ڈاکٹر حمید اللہ روح ترقی حیدرآباد رجب ۱۳۶۷ھ)

۲۰، ۲۱ سال کی عمر میں ان کی خداداد صلاحیتوں نے انھیں عوامی میدان میں لا کھڑا کیا اور

۲۴ سال کی عمر میں یہ بارہ اسلامی علمی اور اصلاحی انجمنوں سے وابستہ تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انجمن مہدویہ کے صدر بنے، ۱۹۲۷ء میں مجلس تبلیغ اسلام کی بنیاد ڈالی، ۱۹۲۷ء ہی میں حیدرآباد سوسائٹی کی عاملہ کے رکن بنائے گئے، ۱۹۲۹ء میں مجلس وضع قوانین کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں مجلس جاگیرداران کے معتمد، نظم جمعیت سرکار عالی کے صدر اور مجلس اتحاد المسلمین کے قائد کی حیثیت سے گویا ۱۹۲۶ء سے ان کی عوامی تقریروں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور اہل وطن کے کان (عوام اور خواص) ان کی مذہبی، ادبی، سیاسی تقریروں کے لطف سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔

۱۹۲۸ء میں ٹاؤن ہال باغ عامہ میں تعلیم کا ''صحیح مطمع نظر'' کے زیر عنوان تقریر فرمائی اور ۱۹۲۹ء میں جب کہ وہ جنگ کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ہی کے اجلاس میں ''دینیات کی تعلیم'' کے زیر عنوان ٹاؤن ہال میں تقریر فرمائی تھی جب کہ ان کی عمر صرف ۲۴ برس تھی، حیدرآباد ایجوکیشنل سوسائٹی کے ان اجلاسوں میں ماہرین تعلیم، علماء اکابرین، رہنمایانِ ملت شریکِ اجلاس ہوا کرتے تھے، کیوں کہ یہ اجلاس خالص علمی و تعلیمی مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ اس موقعہ پر نواب صاحب نے تالیوں کی گونج اور صدائے تحسین کے دوران موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا :

''علم دین ایک دریا تھا جو جب تک بہتا اور ایک قلب سے دوسرے قلب میں بلا روک ٹوک منتقل ہوتا رہا، اس کا پانی صاف اور اس کی تاثیر جلد اثر کرنے والی رہی۔ لیکن جب ہم نے اس سے پہلو تہی کی اور جن کے قبضہ میں تھا انھوں نے بند بنا کر اس کو روک دیا تو ایک طرف پانی خود ان کے قلوب کی گندگی سے سڑنے لگا اور دوسری طرف خود ان کے علماء و مشائخ نے دُنیا کی گردن عقیدت کو اپنے سامنے جھکانے اور اپنے جیبوں کو دوسروں کی محنت کی کمائی سے بھرنے کے لئے اس کو اپنی رائے اور قیاس کی دقیقہ پسندیوں سے معمور اور نا قابل فہم بنا دیا۔ برخلاف اس کے ایک زمانہ فاروق اعظم حضرت عمرؓ کی حکومت کا بھی تھا جب کہ کمزور سے کمزور انسان بھی جنگلوں میں سونا اچھالتے پھرتے تھے اور ان کے دل میں چور کا خیال بھی نہ ہوتا تھا، کیا ان لوگوں نے اپنی قوت وحکومت سے یہ سب کچھ کیا؟ کیا صنعاء سے مدینہ کا سفر کرنے والے بوڑھیا کے سونے کی حفاظت حکومت کا کوئی فوجی دستہ کر رہا تھا جب کہ وہ عرب کے لق و دق صحراؤں کو عبور

کررہی تھی۔ نہیں یہ سب اپنی اپنی رعایا کے ہر فرد کے دل میں ایک ایسی غیبی قوت کے ادراک نہیں بلکہ ایقان وایمان کے پیدا کردینے کا نتیجہ تھا جو چلتے پھرتے اُٹھتے جلوت وخلوت میں ان کے اعمال علانیہ وپوشیدہ ہی کی نہیں بلکہ ان کے قلوب کے وساوس واحساسات کی بھی نگرانی کررہی ہو، اور نہ صرف نگرانی کررہی ہو بلکہ اس کو ان اعمال کی سزا وجزا کا بھی کامل اختیار حاصل ہو، اسی قادر مطلق کا نام خدا رکھا گیا اور اسی قدرت کے تیقن واقرار کا نام ایمان اور اسی قوت کی عبادت یعنی تعمیل حکم کا نام دین ہے، اور انھیں احکام کی تعلیم کا نام تعلیم دینیات ہے جو اس قادر مطلق کے بھیجے ہوئے رسولوں اور نیک بندوں نے ہم تک پہنچاتی۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تشریف فرما تھے اور ایک ۲۴ سالہ نواب زادے کی تقریر کو بڑے غور سے سن رہے تھے، اس تقریر کے تعلق سے اپنے احساساتِ قلبی کا اظہار کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں :

''نواب صاحب سے میں سب سے پہلے اس وقت واقف ہوا۔ جب ۱۹۲۹ء میں مجھ کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ نواب صاحب اس وقت تقریر فرمارہے تھے اور میں ان کے نام سے تک ناواقف تھا، تھوڑی دیر تقریر سنتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں عام مقررین سے مختلف ایک شخص سے دوچار ہوں جو خطابت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، سلجھے ہوئے خیالات، مرتب اور مربوط بیان، الفاظ کا صحیح انتخاب اور برمحل استعمال، جملوں کی صحیح نشست اور ان میں ادب کی لطیف چاشنی، ان سب چیزوں نے مل کر مجھے مقرر کی شخصیت سے فوراً متاثر کیا اور ہم نشینوں سے دریافت کرنے پر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ نواب بہادر خاں صاحب حیدرآباد کے ایک جاگیردار ہیں تو مجھ کو اور زیادہ حیرت ہوئی، کیوں کہ میں حیدرآباد کے جاگیردار طبقہ سے جو واقفیت رکھتا تھا، اس کی بناء پر مجھے توقع نہ تھی کہ ایسا اچھا خطیب اور ایسے پاکیزہ خیالات اور وسیع معلومات رکھنے والا شخص اس طبقہ میں پیدا ہوگا۔

(ماخوذ ''آفتابِ دکن'' ازشیدا)

۱۹۲۹ء کی نواب صاحب کی ایک معرکتہ الآراء اور یادگار تقریر سارداا یکٹ کے سلسلے میں بہ مقام ڈیوڑھی نواب فیاض الدین خاں (سلطان بازار) میں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں ازدواج

کم سنی سے متعلق سارداا یکٹ پاس ہو گیا تھا، جس قانون کے تحت ۱۴ سال سے پہلے لڑکی کی شادی اور ۱۸ سال سے قبل لڑکے کی شادی جرم تعزیری قرار پائی۔ آریہ سماجی یہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں بھی یہ قانون پاس ہوجائے مگر ہندوؤں میں سناتن دھرم کے لوگ اس کی مخالفت میں تھے۔ حیدرآباد میں اس بل کی شدید مخالفت ہوئی۔

نواب صاحب کی یہ تاریخی تقریر جو دس ہزار ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ جلسہ میں کی گئی اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ رائے شماری کی منزل میں صرف دو ہاتھ ایکٹ کی تائید میں اُٹھے اس تقریر کے بارے میں ملک کے مؤقر اخبار ''رہبر دکن'' نے لکھا کہ : اس تقریر کے عام خدوخال کے متعلق شاید اتنا تذکرہ کافی ہوگا کہ مخالفین بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

(بحوالہ ''رہبر دکن'' ۲/ڈسمبر ۱۹۲۹ء)

ہر سال وکٹری پلے گراؤنڈ پر عظیم الشان جلسہ میلاد النبی صلعمؐ بڑے اہتمام سے منعقد کیا جاتا۔ جس میں بیرونِ دکن کے علماء بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ یہ نومبر ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے کہ جو جلسہ میلاد حسبِ روایات قدیم منعقد ہوا۔ اس جلسے کو محمد بہادر خاں جاگیردار بھی مخاطب کرنے والے تھے، جلسے کا آغاز ہو چکا تھا، جس وقت محمد بہادر خاں جاگیردار تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اس وقت تک شاہ دکن اس محفل میلاد میں تشریف فرما نہیں تھے، تقریر کے نصف تک ہلچل مچ گئی، سیٹیاں بجنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے حضور نظام محفل میلاد میں تشریف فرما ہوگئے۔ ۲۵ سالہ محمد بہادر خاں کی تقریر جاری تھی۔ نظام نے صورت دیکھی۔ جان لیا فرزند نصیب یاور جنگ ہے۔ ایک لمحہ نہیں گذرا۔ سارے مجمع پر طاری کیفیت نظام پر بھی طاری ہوگئی، ایک عاشق رسولؐ اپنے آقا کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کر رہا ہے، بصیرت افروز اور ایماں آفریں تقریر کا ہر جملہ قلب کو جگر سے ٹکرا دینے پر مائل تھا۔ اسی دوران بادشاہ وقت کو مخاطب کرتے ہوئے محمد عربیؐ کے اس غلام نے کہا : ''اے محمد عربیؐ کے، اے تخت نشیں و تاج پوش غلام، آ میں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہ کونین کی نظر میں اندازِ ملوکیت کیا تھے''۔

اعجازِ خطابت نے سحر باندھا، بادشاہ وقت کی پلکوں کے کنارے آنسو تھے۔ وہ بار بار زانو پر ہاتھ مارتے اور جملوں کو دہرانے کی فرمائش کرتے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سارا مجمع کسی

جلسہ میلادؐ میں نہیں بلکہ حضور صلعمؐ کے روضۂ اقدس کے سامنے کھڑا ہے، قلب کی حضوری نے سرکار دوعالمؐ کی محبت سے سرشار کردیا۔

بہادر خاں کی تقریر ختم ہوئی مگر نظام پر ایک کیفیت طاری تھی۔ گویا قلبِ نظام، حضور انور صلعمؐ کے حضور میں تھا، شاید نظام کی زندگی میں یہ پہلا لمحہ تھا جب انھیں قلب کی حضوری کے ساتھ دربار رسالت کی حاضری نصیب ہوئی۔

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں

اس تاثر کا نتیجہ عطائے خطاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ موروثی خطاب سے الگ بہادر یار جنگ کے خطاب سے نوازے گئے۔ نواب صاحب کے نام جو فرمان اس خصوص میں جاری ہوا اس کا مضمون تھا :

''ذاتِ شاہانہ اس مذہبی وعظ سے محظوظ ہوئی اور بہ تقریب سالگرہ مبارک تم کو خطاب بہادر یار جنگ بہادر سے سرفراز فرمایا گیا''۔

اب جہاں کہیں مخصوص میلاد ہوتے نظام ان سیرت کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ اس طرح نواب بہادر یار جنگ بہادر حیدرآباد کے عوام اور خواص میں ابتداءً بہ حیثیت خطیب متعارف ہوئے، جلسہ ہائے میلاد سے ان کی خطابت کا شہرہ ہوا۔ ان کی مقبولیت روز افزوں ہوتی گئی اب شہر کے گوشے گوشے میں اور سارے ممالک محروسہ سرکار عالی میں فرزندانِ توحید ہزاروں کی تعداد میں والہانہ جوش اور عقیدت کے ساتھ ان کے جلسوں میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے۔

آپ نے پہلی دفعہ بہ مقام لال دروازہ میلاد النبیؐ کے ایک بہت بڑے جلسے کو مخاطب کیا جس میں حیدرآباد کی خلقت ہزارہا کی تعداد میں جمع تھی۔ محمد بہادر خاں نام کے ایک بلند و بالا سرخ وسفید، قوی وتنومند خوشرو وخوش لباس نوجوان تخت خطابت پر ایستادہ ہوکر آیۂ ان کنتم تحبون اللّٰہ کی توضیح وتفسیر میں گل افشانی فرمانے لگا۔ اندازِ بیان، الفاظ کا درو بست، ترکیب اور بندش کی چستی معانی اور مطالب کی فراوانی صاف پتہ دے رہی تھی کہ کوئی صاحبِ علم اور کہنہ مشق مقرر حاضرین کو قرآن مقدس کا درس دے رہا ہے۔ یہ پہلی تقریر نواب صاحب کی اعجاز بیانی کا اشتہار تھی، اہل شہر کا ذوقِ سماعت بھی کافی بلند ہو چکا تھا، پھر کیا تھا کہ ہاتھوں ہاتھ نواب صاحب کا

استقبال کیا گیا۔ایک دواور تین، مسلسل کئی جلسوں میں آپ کی تقریریں ہونے لگیں، نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوتا گیا۔

ایک عرصے تک میلادی جلسے آپ کی تقریروں کی جولانگاہ بنے رہے، بعد میں جوں جوں آپ کی مقبولیت بڑھتی گئی آپ کو علمی مجالس (اور پھر سیاسی پلیٹ فام سے) تقریریں کرنے کا موقعہ ملا۔

بلادِ اسلامیہ کے سفر سے مراجعت (۱۹۳۱ء) کے بعد نواب صاحب نے حجاز، ایران، ترکی اور افغانستان پر (حیدرآباد) میں مسلسل چار تقریروں کے ذریعے تاثرات سفر بیان کئے اور دلی میں 'ایشیاء کدھر سفر کررہا ہے' کے زیر عنوان تقریر فرمائی۔ ان تقاریر سے ہزارہا سامعین نے استفادہ کیا، تقاریر جس طرح خطابت کا بہترین نمونہ تھیں۔اسی طرح دلچسپ معلومات کا گنجینہ بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے بعد نواب صاحب کی بصیرت و آگہی کے حدود وسیع تر ہو گئے اور عالم اسلام کا مستقبل خصوصیت کے ساتھ آپ کی فکر و تدبیر کا نقطۂ منتہیٰ بن گیا۔

(لسان الامت از مولوی عبدالرحمٰن سعید صفحہ ۳۱ تا ۳۳)

''محمد بہادر خاں کی ساری زندگی صرف ایک محور کے گرد گھومتی رہی جسے عشق رسولؐ کہتے ہیں، ان کی زندگی سن وسال کے حساب سے قلیل تھی مگر اسے فکر کے لحاظ سے وقیع اور عمل کے لحاظ سے طویل کہہ سکتے ہیں''۔

قدرت کی دریا دلی سے انھیں زبان و بیان کی طاقت بھی ان کے علم کی وسعت کے حساب سے عطا ہوئی تھی۔ محمد بہادر خاں نے ایک عمر حضورؐ کی حیات اور سیرت کے مطالعہ اور اس پر غور وفکر میں صرف کی۔ جو وقت بچا وہ ذکر میلاد اور سنت کی پیروی میں بسر ہو گیا۔حضورؐ کی سیرت نے انھیں سیاسی بصیرت اور حضورؐ کے ذکر نے انھیں اعجاز بیانی عطا کی۔

بہادر یار جنگ کی زبان کی گرہ ذکر حبیب نے کھولی۔ وہ نام ہر وقت ان کی زبان پر رہتا تھا جس کو ادا کرنے کے لئے شاعر نے ہزار بار مشک و گلاب سے غسل دینا بھی ناکافی سمجھا ہے۔ اس کی ورد کی برکت ان کے حصہ آئی اور اس کا اظہار ان کی تقریروں میں ہونے لگا۔

ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار، بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع

ہو جاتیں۔ وہ تقریریں جن میں برعظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا فکر وعمل اور سرفروشی و جانبازی کی تلقین ہوتی بالکل آتش فشاں کی مانند ہوتیں، آگ اور حرارت کا سیل بے پناہ جو ہر مقابل پر حاوی ہو جائے اور ہر رکاوٹ پر غالب آ جائے، جو تقریریں اسوۂ رسول، مسلمانوں کی نا مسلمانی، ایمان کی کمزوری، اتحاد کی کمی، فکرِ صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو، اچھا تم میری سطح تک بلند نہیں ہوتے تو لو میں بلندیوں سے اُتر کر تمہاری کشت ویراں کو سیراب کرتا ہوں۔

ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔ نہ دیکھا اور نہ سنا۔

(حوالہ : آواز دوست، مختار مسعود)

صدق کے دریا بہا ڈالے جنوں کے ساز پر

خرمن باطل جلایا شعلۂ آواز سے (سکندر علی وجد)

اپنی جس خوبی اور مقبولیت کی بنا پر بہادر یار جنگ یکتا تھے وہ ان کی خطیبانہ شان تھی۔

میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر انگیز تقریریں سنی ہیں، مولانا سبط حسن لکھنوی کی مجلیس سنی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا بولنے والا جادوگر ہے اور سننے والے اس کے طلسم میں اسیر ہیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریریں سننے کا شرف بھی مجھے حاصل ہے اور کوئی شبہ نہیں اپنے فن میں وہ یکتا تھے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی رات رات بھر کی لمبی اور طویل اور دل میں اُتر جانے والی تقریریں بھی سنی ہیں، مولانا محمد علی ان کو ساحر کہا کرتے تھے، دوسرے خطیبوں کے کمالات بھی دیکھے ہیں لیکن بہادر یار جنگ کی خطابت میں ادب، علم، سیاست، دین اور قومیت کا ایسا حسین امتزاج اور کچھ ایسا جوش اور ولولہ تھا کہ سننے والے پر سکتے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی''۔

(حوالہ : یہ ایک نام نہیں ایک تاریخ ہے از رئیس احمد جعفری)

''اس بے بہا در عدیل نے جس کی زبان آبِ رواں سے تیز تھی اور جس کا قلم شمشیر شکافی کا کام دیتا تھا، اپنی خداداد قابلیت وجبلی جدت طبع کے باعث ایک انقلابی جوش کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کیا اور اپنی اس بلند و باوقار آواز سے پروازِ وقت کا رُخ بدل ڈالا۔ ان کی یہ آواز ایک سوختہ دل وجگر کی آواز تھی، ان کے دل و دماغ میں اسرارِ حیات قومی، قوم کی نباضی، ان کی اجتماعی فکر و

باہمی رابطہ وعلاقہ کی کشش کی بے پناہ قابلیت وشخصیت قدرت نے ودیعت فرمائی تھی ، ان کی قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ جس عنوان پر زبان کھولی اس کو قال سے حال بنادیا۔ الفاظ کے پیکر بے جان میں ڈال دی، ان کے ندرتِ بیان کی شگفتگی ان کا حاصل ہنر تھی، ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ہر آواز سننے والے کے قلب و دماغ میں پیوست ہوجاتی اور دانائی و ہوشمندی کے سامان پیدا کردیتی تھی۔

لیلائے ملتِ اسلامیہ دکن کے اس مجنوں نے اپنے وفورِ شوق، اپنی بے تابیوں، سرگرمیوں، آتش نوائیوں ، شعلہ سامانیوں ، اپنے بے باک و انوکھے اندازِ خطابت کے سلیس اور عام فہم ، بے تکلف چھوٹے بڑے سادہ فقروں کی بول چال سے برسہا برس کے سوئے ہوئے مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا، ان کے سرد لہو کو گرمایا، ان کے اذہان، معتقدات رجحانات میں علمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی وتمدنی، دینی و دُنیوی، اخلاقی حاکمانہ ومحکومانہ سربلندی وسعت وثابت قدمی پیدا کردی، اسلامی مساوات وسیاست کے مطابق ملک کی آزادی وترقی کے گر بتلائے''۔

(حوالہ : متاعِ گراں مایہ از مولوی محمد اکبر حسین صفحہ۶۹)

''حیدرآباد کے مشہور رہنما نواب بہادر یار جنگ ایک زوردار اور مشہور مقرر تھے، شستہ اُردو میں بڑی فصیح وبلیغ تقریر کرتے تھے''۔(حوالہ : آتش چنار از شیخ عبداللہ صفحہ۲۵۶)

بہادر یار جنگ کی تقریریں مجاہدانہ قوتوں سے بھرپور اور دلوں کے جذبات کی ترجمانی ہوا کرتی تھیں اور یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجھے بہادر یار جنگ کی تقریریں سننے پر مجبور کیا۔

(حوالہ : مولانا عبدالحامد بدایونی روزنامہ مشرق کراچی ۲۶/جون ۱۹۶۸ء)

غالباً ۱۹۴۲ء تھا اور گرمی کی دوپہر ،لوچل رہی تھی، دوپہر کے کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ جے پور ریاست میں چھوٹی پٹری کے ریلوے کا ایک درمیانی درجے کا اسٹیشن تھا۔ خاصا وسیع وعریض مگر لوگوں کا ایسا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔ اس ہجوم میں سلطانہ ڈاکو پکڑنے والے آئی۔ جی پور پولیس مسٹر ایف-ایس- ینگ سے لے کر (جو ہر وقت اور ہر جگہ پائے جاتے تھے) جہانگیر پٹن جی تک (جو اپنی سوڈا واٹر کی مشہور دوکان کے علاوہ کہیں نظر نہ آتے تھے) تقریباً ہر عمر، ہر پیشے، ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ دلی سے آنے والا میل شاید آدھ گھنٹہ لیٹ تھا۔ عین بے تابی کا عالم تھا

کہ اسٹیشن کے گھنٹے نے اعلان کیا کہ چند منٹ میں گاڑی پہنچنے والی ہے، بالآخر گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی ۔ پرجوش ہجوم نے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، قائدِ ملت زندہ باد کے نعروں سے پلیٹ فارم گونج اُٹھا۔ اس موقعہ پر اسٹیشن پر عوام کے اصرار پر قائدِ ملت نے چند منٹ حاضرین کو مخاطب فرمایا (قائدِ ملت کو اس بات کا علم تھا کہ جے پور کے سرکردہ شخصیتوں اور عوام میں بلا کا سیاسی انتشار ہے اور رنگ برنگی پرچم ان کی سیاسی علاحدگی کے مظہر، اسٹیشن پر استقبال کے لئے آئے ہوئے عوام کے ہاتھوں میں تھے)

ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک میری یہ تمنا تھی کہ اپنے آبائی وطن میں آؤں ۔ الحمداللہ کہ آج تمنا پوری ہوئی ہے ، ریاستی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے آپ کو میری مصروفیات کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن آپ کے سیاسی حالات اب اس منزل میں ہیں کہ میں ان سے چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کر کے اپنے اور میرے کام کو آسان بنائیں گے۔ میں مجمع میں کئی رنگ کے پرچم دیکھ رہا ہوں اور آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ پرچم اتحاد کی علامت ہے، اسے انتشار کے لئے استعمال نہ کیجئے۔ میں یہاں تین دن قیام کروں گا اور انشاءاللہ آپ سے طویل ملاقاتیں ہوں گی۔ میں طے کر کے آیا ہوں کہ آپ کا انتشار ختم کر کے واپس جاؤں گا''۔

اس تقریر کے دوران ہی مجمع نے کئی پرچموں کو اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اسے خطابت کی معراجِ کمال کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہادر یار جنگ کی خطابت کا پہلا یہ نقش تھا جو میرے دل پر ہوا۔ (حوالہ : جن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ازالیاس عشقی)

ان کی تقریر ایک دریا معنی ہوتی جس موضوع پر بولتے الفاظ موج در موج رواں دواں ہوتے لیکن جس طرح دریا بہتا ہے تو کنارے کے کھیتوں کو بھی سیراب کرتا ہوا گذرتا ہے اسی طرح موضوع سے متعلق ضمنی عنوانات بھی تشنہ نہ رہتے ، ان کی تقریر میں ضمیر لالہ میں چراغ آرزو اور چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کرتیں۔ فکرِ رسا کے ساتھ لفظوں کا قافلہ ہوتا۔ ان کے آئینہ خیال کا ہر سخن خطابت کا جادو جگاتا۔ تقریر میں الفاظ کا انتخاب گویا ایسا کہ ؎

الفاظ رکھ دیئے ہیں کہ موتی پروئے ہیں

ان کی تقریر افکارِ عالیہ کی تقدیر اور ذہنی پرورش و تربیت کا وسیلہ ہوا کرتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ قائدِ ملت نے اپنی تقریروں کے ذریعے عقل کو ہوش کی نعمت عطا کی، ان کے جذبہ اندوں کی تڑپ کا اندازہ ان کی تقریر کے الفاظ کے چہروں کی نمی سے ہوتا ہے جو زبان خاموش سے اظہار مدعا کرتے ہیں۔

ہر لفظ کے چہروں پر اشکوں کی نمی ہوگی

اور یہی الفاظ روح کی پیاس کو لفظوں سے بجھاتے ہیں، ان تقریر میں ان کا ہر موئے بدن بولتا۔ ان کی آواز جب فضاؤں میں بلند ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوہِ صفا پر کھڑا کوئی پیامِ حق سنا رہا ہو۔ وہ آواز۔

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہی وہ آواز ہے جس آواز نے نصف صدی کی آرام پسند تاریک زندگی کو روشنی دیکھائی تھی، پل کی پل میں رات کٹ گئی لیکن اس رات کا نشہ زندگی کی آخری سانس تک باقی رہا۔

"کبھی بھول سکتا ہوں میں وہ رات؟ جب نصف صدی کی آرام پسند تاریک زندگی بسر کر لینے کے بعد اس تاریکی میں مجھے ایک روشنی دکھائی دی پل کی پل، بجلی کی سی چمک، خاموش خواب اور اندھیرے میں ایک بیدار کن روح پرور چاندنا! اس رات، اس رات کا کچھ نشہ اب تک باقی ہے!

ایک مضمحل قوم کا کہن سال لیکن تازہ دم قائد، اس کی دل نواز پکار پر ایک مردِ بہادر کی لبیک جسے ایک لاکھ انسانوں نے سنا اور اس طرح دل کے کانوں سے سنا کہ آنکھیں کہتی تھی "دیکھو دیکھو، کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں" تیار بیٹھے ہیں! چلنے کو تیار لیکن کہاں؟ اس نئی جانی پہچانی سرزمین کو جس کا قائد نے نام لیا، ملکوں کی محفل میں ایک نو وارد نوزائیدہ پاک بستی! اور اب اس مردِ بہادر نے چند اشاروں میں چلنے والوں کو سمجھا دیا کہ رستے پر ان کے قدم کیسے پڑے کہ وہ موعودہ سرزمین محض کہنے کو نہیں بلکہ ہر لحاظ سے واقعی پاک وصاف بن کر نظر آئے!

ایک لاکھ آدمیوں کے مجمع میں ایک وجیہہ بلند قامت تنومند جوان کھڑا ہے، کھدر کا سادہ لباس مختصر سیاہ بال پکار رہا ہے.................. دائیں بائیں پکار رہا ہے!! اس کے لفظوں کی پرزور

دلکشی، اس کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ، اس کی آنکھوں کی بولتی شیرینی آج رات اس محفل پر چھا رہی ہے، تیرتی پھرتی ہے۔ جابجا دلوں میں اُتر رہی ہے۔ اس کی زبان ایک ایسے دل کی ترجمان ہے جو قربانی دینے والی محبت کا بے باک علمبردار ہو۔ دولت میں پل کر دولت سے بے نیاز، خدمت کا پروانہ ایک سچا بہادر یار ملت، آج کی رات ایک لاکھ آنکھوں کا مطمح نظر!

اپنی قوم سے محبت ہے اور کسی اور سے نفرت نہیں بلکہ اس قوم کی محبت نوعِ انسان کی خدمت پر مجبور کرتی ہے کہتی ہے کہ اسلام وہ نہیں کہ محض مسلمان کے مفاد کے لئے وقف ہو، خدا مسلم غیر مسلم سب کا خدا ہے! یہ کہا بہادر نے اور سوتے جاگتے مسلمانوں کو یہ کہہ کر جگایا اور سمجھایا کہ تم سچے انسان نہ بنوگے جب تک پہلے سچے مسلمان نہ ہولو۔ ان لوگوں کا ذرا سا نمونہ جنھوں نے آج سے تیرہ صدیاں پہلے ایک غلام دُنیا کو اسلام کی سچی روحانی اشتراکیت کا پیغام دیا تھا، اسلام جس نے غریب امیر کے فرق کو خوش اسلوبی سے کم کیا، اسلام جس نے بڑے چھوٹے کے امتیاز کو نیکی کی کسوٹی پر پرکھا، جس نے روح میں ایمان کی لو لگادی، رواداری کو ایمان کا جزو بنادیا، اسلام جس نے اُمیوں کے ہاتھ میں علم کی مشعل دے دی اور کہہ دیا کہ جاؤ اور محبت سے مسخر کرلو دُنیا بھر کے دلوں کو!

مردِ میدان بڑھے، کبھی پہاڑوں پر چڑھے کبھی میدانوں میں اُترے یہاں تک کہ پہاڑ غار بن گئے اور میدان گڑھے ہو کر رہ گئے، ان میں ایک گڑھا ہندوستان تھا جس کے کم از کم ایک حصے کا ہموار کرنا اب ہمارا کام ہے۔

مجھے کچھ یاد نہیں بہادر نے کیا کہا میرے ٹوٹے پھوٹے جملے کیا بتا سکتے ہیں اس کے لفظ سوئے ہوئے دلوں کے لئے انگارے تھے، کیا میرا آرام پسند دل ہی آخر وہاں سے بچ نکلا، محض یہ کہانی سنانے کے لئے؟ مانا کہ میں پھر مصروف ہو جاؤں گا، اپنے بے مصرف کاموں میں پھر بیٹھ جاؤں گا اپنی میز پر قلم سنبھالے ہوئے لیکن یقیناً یاد کر اُٹھوں گا، کبھی کبھی اس لمبی لیکن مختصر شیریں رات کو جب ایک نیک دل کی پکار سن کر میرا بھی جی چاہا کہ اُٹھوں اور کہوں کہ لے میں پھر ایمان لاتا ہوں۔ تیرے ہاتھ پر۔ ایسا ہوتا ہے لاکھوں کو ایک نئی زندگی بخشنے والا دلیر انسان!''

(حوالہ : تازہ بہ تازہ نو بہ نو از میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں)

دم تقریر اک طغیاں کہ باطل غرق طغیانی
تگاپوئے دمادم ہر نفس اک موج طوفانی

''ملہم غیب کی عطا کردہ وہ لافانی آواز جس نے لاکھوں انسانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ کر بے دار کیا تھا۔ اگرچہ آج خاموش ہے لیکن اس کی لہریں اب بھی فضائے بسیط میں مرتعش ہیں۔ (ڈاکٹر رضی الدین صدیقی)

سحر نغمہ بھی گیا شانِ خطابت بھی گئی

◆◆◆

قیادت

عظیم ہستیاں اقوام کے باطن میں چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کے ڈھکن کھول دیتی ہیں اور اس قوت کو تاریخ کا رُخ متعین کرنے اور اسے نئی شکل وصورت عطا کرنے میں خرچ کرتی ہیں۔

کارلائل کہتا ہے ''خوش نصیب ہے وہ انسان جس نے اپنا کام پالیا'' کارلائل کا مدعا یہ ہے کہ قدرت کے فضل سے جس انسان کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ قدرت نے اسے کس کام کے سرانجام دینے کی اہلیت عطا کی ہے وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے قدرت کے عطا کردہ جوہر صلاحیت کو کام میں لاتا اور مقصدِ حیات کو پالیتا ہے۔

ہمارا ایمان یہ ہے کہ پاک وطاہر انسان کے منصبِ حیات کا تعین قدرت کرتی ہے۔ایسا شخص ایمان، اخلاص، عمل صالح، خیرات، ایثار نفس، صبر وصلاحیت اور دل دردمند جیسی صفات سے متصف ہوتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں مقصد ومسلک کا تعین بہت اہمیت رکھتا ہے اور بغیر مسلک ومقصد کے کسی قوم کا آگے بڑھنا، قوم کی کشتی کو موجوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ صرف تعین مقصد اہم نہیں ہوتا بلکہ اس کے حصول کے لئے فکرِ صحیح اور فراست ایمانی کی روشنی میں مواقع واسباب کا پیدا کرنا اس سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جس کی ہو بے داغ ضرب ہو کاری

ہندوستان میں قیادت کا تصور اس وقت اُبھرا جب بہادر شاہ ظفر کے اقتدار کا بت پارہ پارہ ہو چکا تھا اور ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز تباہ کاریاں، مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور ان کے معاشی زوال کا سبب بنی۔تب سے ان میں اپنی بے بسی اور سیاسی شیرازہ بندی کی ضرورت کا احساس پوری طرح جاگ اُٹھا۔

مسلمانوں کی سلطنت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کے مسائل و مصائب کے حل کی ذمہ داری حکومت کی جگہ قیادت نے لے لی۔

اس خصوص میں شمالی ہند میں سر سید نے تعلیمی میدان میں مسلمانوں کو اُبھرنے اور اُبھارنے اور ان کو بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ وقت کے تقاضوں نے سیاسی جماعتوں کو جنم دیا۔ کانگریس، مسلم لیگ، احرار، خلافت کمیٹی کا وجود عمل میں آیا، معاشی اقتصادی تحریکوں سے زیادہ سیاسی تحریکوں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے۔ ۱۹۴۲ء سے ہندوستان چھوڑ دو تحریک نے انگریز اقتدار کے قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء سے شروع کردہ نعرہ انقلاب نے ایسا سیاسی اضطراب پیدا کیا کہ حصولِ مقصد کے لئے قربانی رسم عام بن گئی جو اس ساری سیاسی جدوجہد میں ہند کا مسلماں قومی دھارے میں ساحل سے دور اور منجدھار کے اندر ایسا بے دست و پا ہوا کہ عبرت کی آنکھ کا آخری آنسو بھی مادرِ وطن کی گود میں گرا ——— جب قوموں پر جمود و تعطل کا دورہ پڑتا ہے اور ان کی قوتِ عمل ان سے چھن جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار اور آثارِ حیات سے ان کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور ایسے وقت جب قدرت فضل فرمانا چاہتی ہے تو ان ہی میں سے نابالغہ روزگار ہستیوں کا ظہور ہوتا ہے جو قوم کی ڈوبتی کشتی کو بے حسی جمود اور تعطل کے سمندر سے نکال کر، موجوں سے بچا کر خودی، خود اعتمادی کے پتوار کی مدد سے ساحل مراد کے کنارے سے لگا دیتے ہیں۔ ان ہی نابالغہ روزگار ہستیوں میں علامہ اقبالؔ، جمال الدین افغانی، قائدِ اعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی اور قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کا شمار ہوتا ہے جو عالم اسلام کے اُفق پر نمودار ہوئے اور صالح قیادت سے یہ عملی پیکر ایمان کی حرارت سے باطل کی ستیزہ کاریوں کا ایسا مقابلہ کیا کہ ہندوستان کا سیاسی موسم ہی بدل گیا اور ایک نئی صبح اور نئے سورج کی نوید نے باطل کے اندھیرے کو حق کے نور سے بدل دیا۔ یہ ایسی عظیم تبدیلی اور ایسا عظیم انقلاب تھا کہ حدود کے درمیان جب حدیں بدل گئیں تو تاریخ و جغرافیہ کے ساتھ اقدار بھی بدل گئے۔

نابالغہ روزگار شخصیتوں میں قائدِ ملت، لسان الامت نواب بہادر یار جنگ کی قیادت کا تذکرہ اس باب میں مذکور ہے۔ جن کی قیادت نے دیانت کو فراست سے مربوط کر دیا جس نے

کتاب وسنت پر قوم کو مجتمع کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے، اپنے وطن میں بے وطن مسلمانوں کو ان کا اپنا وطن دلانے کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا۔

جماعت کی آستینوں سے بتوں کو نکالنا اور کھلے عام ہر بت خانے میں صدائے حق بلند کرنا کہ ؎

کہ مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

کوئی آسان بات نہ تھی۔

مسلمانوں کی فکری کم مائیگی، معاشی بدحالی، سیاسی ابتری، انفرادی کردار سے اجتماعی اقتدار تک بے راہ روی، نفسا نفسی، مفاد پرستوں، طاغوتی طاقتوں سے ٹکر، بے حسی، بے قراری، نامساعد حالات، اقتدار کے بتوں کی شیطانی عفریت کے دنوں میں دل کو ہلا دینے والے مخالف حالات میں حوصلہ مندوں کا حوصلہ بڑھانا، آگ خوں اور خباثت کے عفریت پر قابو پانا، یہی منصب قیادت کی ذمہ داری تھی، سچ تو یہ ہے کہ یہ ذمہ داری لہو کے دیپ جلانے کے مترادف ہے اور ؎

لہو کے دیپ جلانا کوئی مذاق نہیں

اس مردِ حر کی ذہنی بے داری اور فکری شعور کا آغاز اوائل عمری میں ہوا۔۱۹۲۰ء میں جب کہ قائدِ ملت کی عمر ۱۵ سال تھی، سمرنا پر یونانیوں کے مظالم اور انگریز سامراج کی استبدادیت کے خلاف مظلومین سمرنا کی امداد کے لئے اس جواں سال رئیس زادے نے گھر گھر کے چکر لگا کر اس قومی خدمت کو انجام دیا۔۱۵ سال کی عمر میں جس کا قومی شعور اس منزل پر ہو وہ وہی ہو سکتا ہے جس کو منزل کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ منزل جسے تلاش کرتی ہے۔

صاحبِ طرز انشاء پرداز مولانا خواجہ حسن نظامی سے (۱۷ سال کی عمر میں) جس وقت پہلی بار ملاقات کی وہ اس مجاہد سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنے روزنامچہ میں لکھا ''نواب نصیب یاور جنگ کے صاحبزادے بہادر خاں صاحب سے ملنے آئے۔ یہ بڑے ذی علم پر جوش، دیندار اور دانشمند صاحبزادے ہیں، اسلامی درد رگ رگ میں بھرا ہوا ہے''۔۲۱ سال کی عمر میں کل ہند انجمن مہدویہ کی صدارت پر فائز ہوئے۔۲۲ سال کی عمر میں مجلس تبلیغ اسلام کی بنیاد ڈالی اور ۲۴ ہزار

نفوس انسانی کو مشرف بہ اسلام کیا۔

۲۳ سال کی عمر میں حیدر آباد ایجوکیشنل سوسائٹی کی عاملہ کے رکن بنائے گئے جو خالص علمی ادارہ ہے۔

۲۴ سال کی عمر میں مجلس وضع قوانین کے رکن منتخب ہوئے ۔ ۲۵ سال کی عمر میں مجلس جاگیرداراں کے بلا مقابلہ معتمد قرار پائے ۔ نظم جمعیت کے صدر بنے ۔ ۲۵ سال کی عمر ہی میں فرمانروائے دکن نے جلسہ میلاد میں ان کی تقریر کے سحر سے مسحور ہو کر انھیں نواب بہادر یار جنگ کا خطاب دیا۔

۲۶ سال کی عمر میں بلادِ اسلامیہ کی سیر کی ،نواب صاحب کی سیاحت کا یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جب کہ بلادِ اسلامیہ میں ہنوز جنگِ عظیم کا شدید ردِ عمل جاری تھا اوران کی سیاسی قسمت گری ہو رہی تھی ۔ اپنی حکیمانہ نظر سے جو کچھ دیکھا وہ دیدہ عبرت نگاہ کے لئے دعوتِ فکر تھی ۔ شاید قدرت قیادت کے منصب کے لئے چنے گئے ۔ اس مردِ حق کی نگاہ کو چشم بینا بنا کر اسے مسلمانوں کے شاندار مستقبل کی ضمانت قبول کرنے کے قابل بنانا چاہتی تھی ۔ اس سفر کا مقصد عالم اسلام کے حال واحوال سے آگاہی، مسلم عمائدین، اکابرین، سربراہانِ حکومت، سلاطین، علماء، صحافی ہر مکتب فکر و نظر کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں فرمائیں اور نورانی ضابطہ حیات کی روشنی میں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے بارے میں مشاورت فرمائی اور عالم اسلام کے اجتماعی مسائل، اسلامی ممالک کے درمیان اتحاد (رابطہ عالم اسلامی) مسلمانوں کی پستی کے اسباب اوران کی ترقی کی راہوں کا تعین اور جائزہ اس سفر کا مقصد تھا۔

اس سفر نے نواب صاحب کی بصیرت وآگہی کے حدود وسیع تر کر دیئے۔ سفر بلادِ اسلامیہ نے انھیں منصب قیادت کی ذمہ داریوں، ہندی مسلمانوں کے مسائل و مصائب، انگریز سامراج اور ابنائے وطن کی ریشہ دوانیوں کو بین الاقوامی سیاسی حالات کی روشنی میں سمجھنے کا موقعہ فراہم کیا۔

سفر بلادِ اسلامیہ سے واپسی کے بعد مجلس اتحاد المسلمین کی جانب اپنی پوری توجہ مبذول فرمائی۔ کیوں کہ ہندوستانی سیاست کا اُونٹ انگڑائی لے رہا تھا اور حیدر آباد سے بمبئی کا ساحل کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

قائدِ اعظم سے تعلق و تعارف کے بعد مسلم لیگ اور اسٹیٹ مسلم لیگ کے مسلمانوں کی بے زبانی کو جس زبان فیض ترجمان کی ضرورت تھی وہ انھیں لسان الامت کی صورت میں مل گئی۔

ان کے ہم عصر مذہبی سیاسی قائدین، اکابرین اور رفقاء کار کے اذہان میں اس عظیم شخصیت کی جو منہ بولتی تصویریں محفوظ ہیں، وہ ان ہی کی آنکھوں دیکھی جاسکتی ہیں اور ان ہی کے زبان و قلم ہماری آگاہی کا واحد مستند وسیلہ ہیں۔

قائدِ ملت کے دوست اور رفیق کار نواب دوست محمد خاں جاگیردار اس خصوص میں فرماتے ہیں :

''جوں ہی نواب محمد بہادر خاں نے اپنے اوائل زندگی میں پبلک مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی تو میں نے ان کو اولاً طبقہ جاگیرداران کی خدمت کے لئے متوجہ کیا جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ طبقہ جاگیرداران کی اصلاح اس سلطنت کا سنگِ بنیاد ہوگا جس کو وہ بہ خوشی قبول کرنے آمادہ ہوگئے اور سات سال تک انھوں نے اس طبقہ میں بیداری اور شیرازہ بندی کی کوشش کی۔ امراء اور جاگیرداروں کے درمیان خلیج کو پاٹتے ہوئے ایک دوسرے سے ملانے اور مسائل حاضرہ سے واقف کرانے کی کوشش کی اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوجاتے۔ اگر درمیان میں مخالفانہ قوتیں کارفرمانہ ہوتیں۔ بالآخر وہ تنگ آگئے اور اپنے مساعی کا رُخ وقت کی سب سے اہم ضرورت یعنی مسلمانوں کے لئے پھیرلیا اور اس کے بعد ایک قلیل عرصہ میں وہ سب کچھ کر دکھایا جس سے آپ اور ہم سب واقف ہیں حتیٰ کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح خود ان کو اپنے اصحابِ یمین میں شمار کرنے لگے تھے''۔ (حوالہ : خطبہ استقبالیہ ازنواب دوست محمد خاں ۱۳۶۴ھ)

مولوی عبدالرحمٰن سعید رفیق قائدِ ملت، جنوبی گوشہ دکن کے قلب مضطر و دیدہ ور کی قیادت پر اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

چمن زار ہند میں نہ معلوم ''نرگس'' کتنی طویل مدت تک اپنی ''بے نوری'' پر روتی رہی،
تب کہیں جاکر اس کے جنوبی گوشہ دکن میں بہادر خاں کے قالب میں ایک ''دیدہ ور'' پیدا ہوا۔

بہادر خاں نے جو گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا۔ اپنی صلاحیت خداداد علمی اور عملی استعداد اور بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے تجربہ سے لیس ہو کر امارت کے تفوق اور منصب و اعزاز

کے وقار کو بالائے طاق رکھ کر اہل دول کی صفوں کو چیرتا ہوا نسل و خاندان کے امتیاز کو روندتا ہوا، انسان اور انسان کے مابین مصنوعی حد بندیوں کو توڑتا ہوا، خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ ملتِ بیضاء کو جس کا چہرۂ زیبا تفرقہ اندازی کے داغوں سے مسخ ہو چکا تھا، اپنی روح پرور خطابت سے چونکایا جو کبھی ''سیل تندرو'' بھی تھی اور کبھی ''جوئے نغمہ خواں'' بھی ان کی تقریریں کتاب و سنت کے معارف تاریخ اسلام کے حقائق اور ڈاکٹر اقبال کے رموز و نکات سے عبارت تھیں۔ خطابت کے سحر کے ساتھ جب ان عناصر کا امتزاج ہو جاتا ہے تو اہل ذوق اس کے تاثر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، چنانچہ جہاں کہیں بہادر خاں کی زبان فیض ترجمان گویا ہوئی وہاں کے باشندے بلا امتیاز فرقہ و ملت ان کے بندۂ بے دام ہو گئے۔ اس میں شمال و جنوب، مشرق و مغرب کی کوئی قید نہ تھی۔

مبدأ فیاض نے بہادر خاں کے روپ میں اہل ہند کو ایک بے نظیر خطیب مقبول عام قائد اور بے مثال ترجمانِ قرآن عطا کیا تھا۔ وہ ''در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق'' کا مصداق بن کر اُٹھے، ملتِ اسلامیہ کی فرقہ بندی نے ان کے دل میں درد پیدا کیا اور وہ اتحادِ ملت کا مشن لے کر میدانِ عمل میں آئے۔ ایک طرف تبلیغ اسلام کے فریضہ کی تکمیل میں بندگانِ خدا کو اپنے دستِ حق پرست پر حلقہ بگوش اسلام بنا کر ان کو ''خلود فی النار'' سے نجات دلائی۔ دوسری طرف دکن کے خوابیدہ مسلمانوں میں ہر جہتی شعور پیدا کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، مجلس اتحاد المسلمین کا قیام ان ہی کی فکر و عمل کا نتیجہ تھا۔ کردار اور باکمال شخصیت کا اثر یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں اتحاد المسلمین ایک وسیع اور مستحکم ادارہ بن گیا۔

اس صاحبِ بصیرت معمارِ قوم نے کمزور ملبہ میں اپنے خلوص اور سعیٔ پیہم کا مسالہ آمیز کر کے چشم زدن میں بلند و بالا عمارت تعمیر کر ڈالی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ برطانوی ہند کی عملی سیاست کی صدائے بازگشت نے دیسی ریاستوں کے طول و عرض میں بھی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ ریاستی حکومت کی معینہ پالیسی کے خلاف ہر فرقہ کی جانب سے سیاسی مطالبات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ اتحاد المسلمین کی جانب سے بھی جس نے مسلمانوں کے سیاسی معاشرتی اور سماجی حقوق کے تحفظ کا بیڑا اُٹھایا تھا۔

مجلس کی پالیسی چوں کہ ہندوستان کے مسلمہ اُصول جمہوریت کے مغائر تھی ۔ حیدری حکومت نے مجلس کے صدر نواب مرحوم کے خلاف معاندانہ حربے استعمال کرنے شروع کئے ۔ ان کی زبان بندی کی گئی ۔ جاگیردار اور نظم جمعیت کے عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے چوں کہ وہ معاشدار اور ملازم سرکار تھے اس لئے سیاست سے ان کے تعلق کو خلافِ قانون قرار دیا گیا تا کہ عوام ان کی قیادت سے محروم ہوجائیں ۔ ان سے ربط و ضبط گھٹے اور مجلس کی فعالیت متاثر ہوجائے ۔ قانون معاشداران کے نفاذ کے ساتھ ہی جو صرف نواب صاحب کی ذات کو بنیاد بنا کر مرتب کیا گیا تھا، اس ''طائر لاہوتی'' نے اپنی جاگیر، مناصب اور اعزاز کو حضور نظام کی خدمت میں لوٹا دیا۔

ریاستی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کے باوجود نواب صاحب کی مشغولیت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ ان کی قیادت کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا رہا۔ دکن کے ۸۵۰۰۰ مربع میل کا رقبہ ان کے عزم بلند کے مقابلہ میں بہت تنگ تھا، وہ کل ہند مسلم اسٹیٹ لیگ کے صدر منتخب ہوئے جس کے اجلاس ہر سال کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر نواب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا کرتے تھے ۔ ہر سال قائدِ ملت ہی کی تقریر دل پذیر مسلم لیگ کے اجلاس کا مہر خاتمہ ہوا کرتی تھی اور وہ اجلاس ناکام متصور ہوتا جس میں یہ خطیب شعلہ نوا اپنی گفتار سے گرمیٔ محفل کا باعث نہ بنتا۔

برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں نواب صاحب کی روزافزوں مقبولیت کے باعث حیدری حکومت لرزاں و ترساں تھی ۔ اس کا منصوبہ تھا کہ نواب صاحب کو کچھ اس طرح پابند کیا جائے کہ ان کی مساعی بے نتیجہ ہو اور قیادت کا اثر زائل ہوجائے چوں کہ نواب صاحب کی شخصیت ہند گیر اہمیت کی حامل تھی اس لئے ریاستی حکومت کو یہ اندیشہ بھی پیدا ہوگیا تھا کہ ان کے خلاف تشدد برتنا کل ہند احتجاج کو دعوت دینے کے برابر ہے ۔ اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے مشورے سے نواب صاحب کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی کی جائے ۔ اِدھر حضور نظام کو ان کے خوشامدی درباریوں نے باور کرایا کہ نواب صاحب کی بے پناہ مقبولیت سے اس امر کے آثار پیدا ہوگئے ہیں کہ اٹلی کے مسولینی اور جرمنی کے ہٹلر کی طرح وہ دکن میں آمریت اختیار کرلیں، اس لئے مناسب یہی ہے کہ مرحلہ اول ہی میں اس اندیشہ کا ازالہ کر دیا جائے ۔

غرض سازش کی تکمیل کے بعد حکومت نے نواب صاحب کی ذات کو ریاست کے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھ کر حکومتِ ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو مطلع کیا کہ وہ نواب صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس زمانہ میں سر فرانسس وائلی حکومتِ ہند کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے انچارج تھے اور نواب صاحب کی قیادت کی روز افزوں مقبولیت سے بھی وہ آگاہ تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں عجلت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا، اولاً بطورِ احتیاط برطانوی ہند کے مسلم قائدین سے نواب صاحب کے اثر ورسوخ اور مجوزہ گرفتاری کے بعد اس کے ردِعمل کے بارے میں دریافت کرایا گیا، ان قائدین نے نواب مرحوم کی قیادت کے بارے میں مثبت قسم کی رائے ظاہر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ بلکہ اپنی رپورٹ میں ان کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی۔ ان آراء کے بین السطور سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ پر نواب مرحوم کے ساتھ ان قائدین کی رقابت واضح ہوگئی اور نواب صاحب کے بارے میں صحیح نتیجہ پر پہنچ کر اس نے ریاستی حکومت کو جواب ادا کردیا کہ وہ نواب صاحب کو اپنی ذمہ داری پر گرفتار کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جواب سے اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے معمود ذہنی کا پتہ چلتا تھا اس لئے حیدری حکومت کو گرفتاری کی تجویز پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حکومت کی ان ساری کارروائیوں سے واقفیت کے باوجود نواب مرحوم اپنے مشن کی تکمیل میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف رہے۔ جب کبھی آپ کے ہمدردوں نے یہ مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد کا قیام ترک کرکے برطانوی ہند کے کسی شہر میں اقامت اختیار کریں تو آپ نے ان کو یہ جواب دیا کہ ''سپاہی اپنا محاذ نہیں چھوڑ سکتا'' راستہ کی مشکلات نے کبھی ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کی۔ اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو نہ معلوم آج صورتِ حال کیا ہوتی؟

ایک جری اور حق پسند رہنما جسے قدرت نے قلوبِ انسانی کی رہبری کے لئے بھیجا تھا ان کی آواز غرور وقوت کی نہیں، عظیم اعمال اور بلند مقاصد کی آواز تھی، ان کا ہر لفظ ایک سچے اور مخلص دل کی صداقت اور نور کا آئینہ دار تھا۔

رات کی تاریکیوں میں انھوں نے سحر کا جلوہ دیکھ لیا تھا اور اپنے لئے زندگی کی وہ راہ اختیار کی جو موت کو بھی شکست دیتی ہے''۔ (حوالہ : نواب بہادر یار جنگ ازنواب سر نظامت جنگ صفحہ ۳۲۳ تا

بہادر یار جنگ کو سب کچھ حاصل تھا، رہنے کو قصر فلک نما، خرچ کرنے کو سیم وزر کی تھیلیاں، اگر رنگین مزاج ہوتے تو بادۂ وساغر اور حسن روح افزا کی بھی کمی نہیں تھی، لیکن جس نے امارت و ثروت کی گود میں آنکھ کھولی تھی اسے غریبوں سے پیار تھا وہ مذہب کا شیدائی تھا۔ اسے اپنی قوم سے عشق تھا، ان خدمات نے اسے درویش منش بنادیا تھا۔ دُنیا کے نعائم سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، وہ اپنے لئے مایۂ فخر اسے سمجھتا تھا کہ جیل جائے اور خدا کی راہ میں گردن کٹا کر شہداء کے زمرے میں شمار ہو۔ (حوالہ : ایک نام نہیں، ایک تاریخ از رئیس المورخین رئیس احمد جعفری مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

'' قائدِ ملت جس کسی نے کہا اس نے کوئی شاعری نہیں کی، ادبی صنعت گری، لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا، ایک حقیقت بیان کر دی، تاریخ کی طرح خشک، سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اکھل کھری، کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا''۔

(حوالہ : قائدِ ملت از علامہ عبدالماجد دریابادی مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

دکن کے قدیم فرماں رواؤں نے سلطان المجاہدین ابوالفتح ٹیپو کے ساتھ جو سلوک کیا تھا جس سے دکن کی تاریخ داغدار ہوگئی تھی۔ اسے نواب بہادر یار جنگ نے اپنی قابلیت، اپنے ایثار اور اپنی جدوجہد سے مٹا ڈالا، یوں لگتا ہے کہ جیسے سرزمین دکن نے ایک دوسرے بے تاج وتخت ٹیپو کو جنم دیا ہے جس نے بے شمار محاذوں پر اسلام دشمنوں سے بے تیغ وسنان جنگ کی اور سرخرو ہوا۔ اس نے ٹیپو شہید کے خون کی آبرو رکھ لی۔ (حوالہ : کچھ یادیں کچھ باتیں از مولوی نصراللہ خاں صاحب صفحہ ۳۱۴ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

ان کے عزائم جواں اور ان کے ارادے بلند تھے۔ انسانی عزائم کے آگے سمندر بھی کف بہ دہن ہو کر رہ جاتے ہیں، نپولین سے جب یہ کہا گیا کہ ایلپس کو عبور کرنا ناممکن ہے تو نپولین نے جواباً کہا تھا یا تو ایلپس کو جگہ دینا پڑے گا یا وہ میرے راستے میں نہیں رہے گا، تاریخ بتاتی ہے کہ دشوار گذار ایلپس نے اس کے بلند ارادوں کو دیکھ کر اسے راستہ دے دیا۔

قائدِ ملت کے عزائم اور ارادے ہمالیہ کی طرح اٹل تھے، ان کے عزم کا ثبات اور

استقلال، ہر مشکل کا حل ثابت ہوتا۔ انھیں اپنے اس خدا پر پورا بھروسہ تھا جس نے انھیں قیادت کے لئے پیدا کیا تھا۔

''مجھے اطمینان ہے کہ انشاءاللہ اس وقت تک نہ مروں گا جب تک اپنے مقاصدِ زندگی کی تکمیل نہ کرلوں۔ میری فکر نہ کیجئے، ہزاروں بہادر خاں پیدا ہوں گے اور مریں گے، فکر کے قابل زندگی اسلام کی اور مسلمانوں کی ہے''۔ (حوالہ : مکتوب نمبر ۴۳ مکاتیب بہادر یار جنگ)

''کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا کہ میرے دوش پر جو فرائض عائد ہیں، ان کی تکمیل کروں۔ انشاءاللہ خدا مجھے قیامت کے دن اپنے حبیب کے سامنے شرمندہ نہ کرے گا''۔

(حوالہ : مکتوب نمبر ۹۴ مکاتیب بہادر یار جنگ)

''جس راستے پر میں گامزن ہوں وہ کانٹوں اور دلدلوں سے بھرا ہوا ہے اور اس علم کے باوجود بحمداللہ قدم میں لغزش اور عزائم میں فرق نہیں ہے، اس راستہ کا واحد سہارا خدائے قدوس کی ذاتِ اقدس ہے۔ (حوالہ : مکتوب نمبر ۳۹۱ مکاتیب بہادر یار جنگ)

قدرت نے انھیں قیادت کے منصب سے سرفراز کیا تھا، طالبِ علمی کے زمانے میں اس جوان صالح نے ایک خواب دیکھا کہ ایک تازہ قبر کھدی ہوئی ہے جس میں انھیں کفنا کر لٹایا گیا ہے اور خلق خدا کا اژدہام ہے۔

صبح جب یہ خواب اپنے استاد بحر العلوم علامہ شمسی کو سنایا تو علامہ نے یہ خوش خبری دی کہ ''تمہیں مسلمانوں کی قیادت حاصل ہوگی''۔ (حوالہ : بہادر یار جنگ از محمد عظیم الدین محسن مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد)

اس جواں صالح کا خواب اور علامہ شمسی کی تعبیر کا عکس جمیل، دکن کی سرزمین سے مسلمانانِ ہند کی سیاست و قیادت کا نیرہ اقبال، آفتاب جہاں کی صورت میں اُبھرا۔

عمر میں تھا جواں اور تجربے میں پیر تھا
صدر ہر مجلس کا تھا، ہر انجمن کا میر تھا

جب تک زندگی سے دست برداری حاصل نہ کرلی، مسلمانوں کی خدمت سے دست بردار نہ ہو سکے ——— ان کی قیادت کا عروج اتنا برق رفتار تھا کہ جگر کی زبان میں صرف اتنا کہا

جا سکتا ہے کہ ؎

کمال سخن کے دیوانو
ماوراءِ سخن بھی ہے ایک بات

ارتقاءِ قوم کے مقدس فرض کی تکمیل کے لئے جو اولوالعزم نفوس قدسیہ مبعوث ہوتے ہیں، ان ہی نفوس قدسیہ کا یہ آخری چراغ تھا۔

قیس سا اُٹھا نہ کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی فرد

◆◆◆

جیوری

۱۹۳۱ء

لفظ JURY عبرانی لفظ JURARS سے مشتق ہے۔ ہندوستان کی عدلیہ میں جیوری کا رواج انگریزوں کی وساطت سے رواج پایا۔ جیوری کے نظریے کے بارے میں عدلیہ کا ایک خاص نقطۂ نظر رہا اور اسے اینگلو امریکن مشترکہ قانون کی اہم بات سمجھی گئی کے فوجداری مقدمات میں ان کی معاونت شریک کار رہے۔

BLACK STONE (1723 TO 1780) نے اس طریقۂ کار کو سراہتے ہوئے لکھا تھا :

THE JURY IS THE PRINCIPAL CRITERION OF TRUTHS IN THE LAW OF ENGLAND.

''برطانیہ میں انگریزی قانون کی شان، جیوری کے قیام سے ہے'' ساتھ ہی جیوری کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ ''جیوری قانون کی سچائی کی کسوٹی ہے لیکن انگلینڈ کے ماہر قانون و دستور DICEY نے اپنا ایک علاحدہ تصور پیش کیا ہے :

"WHAT TWELVE SHOPKEEPERS SAY RIGHT IS RIGHT AND WHAT THEY SAY WRONG IS WRONG". (DICEY)

جیوری کے مقررہ تعداد کے ارکان تحت قانون، حلف لیتے تھے اس بات پر کہ تحقیق کریں گے واقعات کے حقائق کی اور حقیقت پر مبنی اپنی رائے کا اظہار کریں گے اس ثبوت کے پس منظر میں جوان کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس طرح ارکانِ جیوری حقائق کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کرتے اور عدلیہ کے لئے یہ امر موجبِ سہولت ثابت ہوتا رہا۔

۱۹۴۹ء میں جیوری ایکٹ کے تحت انگلینڈ میں ارکانِ جیوری کو معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں ریاست حیدرآباد میں انگریزوں کی عمل داری تھی اس سب سے بڑی دیسی ریاست میں بھی انگریز حکام کے منشاء کے مطابق، مروجہ انگریزی قانون کا ترجمہ، اس ریاست کا بھی قانون تھا۔

ممالک محروسہ سرکار عالی (حکومت نظام) میں دفعات عظمت مدار ۴۶۹ اور قانون فوجداری سرکار عالی کی دفعہ ۴۱۴ کے تحت جیوری کے ارکان کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ جیوری کے ارکان کو اس کا اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو صدر مقرر کریں۔ اس طرح جیوری کا صدر جیوری کے ارکان ہی میں سے ہوتا۔

جیوری کے ارکان عام اور خاص کے زمروں میں تقسیم تھے۔ ایک فہرست عام اشخاص کی ہوتی اور دوسری فہرست خاص ارکان کی۔ خاص ارکان جیوری میں معاملہ فہم صاحبِ حیثیت لوگ جن کا سماج میں سماجی رتبہ ہوتا اخلاقی، مالی، علمی حیثیت سے، جن کی شناخت ہوتی، ایسے لوگ شامل کئے جاتے۔

نواب صاحب ابتداءً جیوری کے رکن رہے لیکن ۱۹۳۳ء میں جب انھیں ذریعہ مراسلہ نشان ۹۱۹ ۳۷ مؤرخہ ۲۳/ ستمبر ۱۹۳۳ء جیوری خاص کی رکنیت کی اطلاع دی گئی۔

یہ ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا۔ بلادِ اسلامیہ کے دورے سے واپسی کے بعد نواب صاحب کی قومی مصروفیات اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ وہ جیوری کی رکنیت کو قبول کرنے کے موقف میں نہیں تھے، معتمد صاحب مجلس عدالت عالیہ کے نام اس خصوص میں حسبِ ذیل خط روانہ فرمایا۔

''میں اپنے خانگی، قومی اور سرکاری مشاغل کی وجہ سے اتنی فرصت نہیں رکھتا کہ جیوری کے اجلاسوں میں شرکت کرسکوں، اس لئے براہِ کرم ارکانِ جیوری کی فہرست سے میرا نام خارج فرما کر ممنون فرمائے''۔

''بہادر یار جنگ''

اس طرح ان کی اہم قومی مصروفیات نے انھیں کسی بھی غیر اہم سرکاری کمیٹی کی رکنیت یا صدارت سے ہمیشہ دور رکھا۔

ملکی تحریک

۱۹۳۱ء

جمعیت رعایاءنظام

حیدرآباد کا سیاسی سمندر ہمیشہ سے بہت ہی پرسکون رہا ہے، اس میں لہریں بہت کم اُٹھتی ہیں اور جب اُٹھتی ہیں تو چند اُونچے ٹیلوں کے اِردگرد گھوم کر خاموش بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن ہماری آنکھوں نے جس سیاسی لہر کو حیدرآباد کے سمندر میں پہلی مرتبہ اُٹھتا ہوا دیکھا وہ ملکی تحریک تھی۔ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے نواب علی نواز جنگ بہادر چیف انجینئر کے استعفیٰ نے اس تحریک میں نئی جان ڈال دی تھی۔ اس سلسلہ میں حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے زمرد محل کے تاریخی ہال میں بانیانِ تحریک کی جانب سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا، کئی لوگوں نے تقریریں کیں، ملکیوں کے حقوق و مفادات کی حفاظت پر زور دیا، ملازمتوں میں ان کے حق ترجیح کو ثابت کیا ——— لیکن اہل ملک کے دلوں کی آواز کسی کی زبان سے گونجی تو وہ یہی اٹھائیس سالہ کڑیل جوان بہادر خاں تھا ——— جلسہ کی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر باندھا گیا اور ملکی تحریک بہادر خاں کا سہارا ڈھونڈنے لگی۔ چنانچہ جب اسی تحریک نے جمعیت رعایاء نظام کے نام سے منظّم صورت اختیار کی تو بہادر خاں اس کے سرگرم حامیوں میں تھے ——— یہاں میں یہ واضح کردوں کہ بہادر خاں کی ملکی تحریک کا تصور کسی طرح اُخوتِ اسلامی سے متصادم نہ تھا، اتحادِ اسلامی کا تصور ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ اُخوتِ اسلامی کے نام سے اس طرح ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے کہ اسلامی سلطنت کے رہنے والوں کے لئے ترقی کی شاہراہیں مسدود ہوجائیں۔ (حوالہ : ہمارا قائد از محترم مولوی محمد احمد خان صاحب صفحہ ۲۶، ۲۷)

اس تحریک کے دوسرے پہلو پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے نہایت دیانت دارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے ”شمالی ہند سے بعض نہایت قابل لوگ دکن آئے جنھوں نے یہاں

بڑی خدمات انجام دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی آکر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے جو شمالی ہندوستان میں نائب تحصیلدار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ دراصل ان ہی کی وجہ سے شمالی ہندوالے دکن میں غیر مقبول ہوئے اور اسی سے ملکی تحریک کو فروغ پانے کا موقعہ ملا''۔

(حوالہ : یادوں کی دُنیا از یوسف حسین خاں صفحہ ۳۲۹)

جمعیت رعایا نظام کی یہ تحریک کچھ دنوں بڑے جوش وخروش کے ساتھ جاری رہی، لیکن اس کے پس پردہ عہدوں کی کشمکش اور اعزاز ومناصب کی کھینچا تانی کام کررہی تھی اس لئے یہ تحریک کبھی عوامی نہ بن سکی، پھر شمالی ہند کی فرقہ وارانہ فضاء نے اندر ہی اندر دکن کے اس پرامن خطہ میں جو ریشہ دوانیاں شروع کردی تھیں انھوں نے اس تحریک کی روح ہی کو ختم کردیا۔

(حوالہ : ہمارقائد از محترم مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۲۷)

دل سے دیتے ہیں دُعائیں آپ کو ابنائے ملک
ملکیوں کے آپ ہیں ماوا تو ہیں ملجائے ملک

◆◆◆

رکنیت مجلس صفائی

چادرگھاٹ میونسپل بورڈ

شہر حیدرآباد کی بلدی تاریخ کا آغاز ۱۸۶۹ء سے ہوا۔ ابتداءً حکومت کی طرف سے ایک صدر اور ۶ ارکان نامزد کئے جاتے تھے جو معزز امراء و جمعداران کے طبقوں سے متعلق ہوتے، ۱۸۹۰ء میں محکمہ صفائی کا نام چادرگھاٹ بلدی کمیٹی (چادرگھاٹ میونسپل بورڈ) کے نام سے تشکیل پایا پھر ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے نام سے کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا جو بلدی مسائل و وسائل کے پس منظر میں وسیع اساس پر قائم کیا گیا، ۱۳۲ سکوائر میل حدود سے متعلقہ بلدی مسائل اس کارپوریشن سے متعلق تھے، ارکان کی تعداد ۳۶ مقرر کی گئی جن میں ۱۳ رائے عامہ سے منتخب شدہ، ۱۳ حکومت کی جانب سے نامزد اور مزید ۱۰ بھی حکومت کی جانب سے نامزد کردہ ہوتے نامزد کردہ ارکان میں امراء پائیگاہ، اعلیٰ عہدہ داران حکومت، جاگیردار و جمعداران حکومت، گرایجویٹ، تاجر، بینکر اور سماج کے طبقاتی اور پیشہ ورانہ بنیادوں سے متعلقہ معزز افراد ہوتے۔

اگرچہ حیدرآباد میونسپلٹی کا نام ۱۹۵۱ء تک چلتا رہا۔ لیکن حیدرآباد میونسپل کارپوریشن ایکٹ کے تحت ۱۹۵۱ء میں اس بلدی ادارے کا نام ''حیدرآباد میونسپل کارپوریشن'' قرار پایا۔ اس ایکٹ کے بموجب ارکان کی تعداد ۶۶ قرار پائی، جس میں ۶۰ ارکان عوام سے منتخب ہوکر آتے اور ۶ حکومت کے نامزد کردہ ہوتے، لیکن ۱۹۵۶ء میں مرممہ قانون کے تحت نامزدگی کا سلسلہ ختم کردیا گیا اور ۶۶ ارکان عوام سے منتخب ہوکر رکن قرار پاتے۔ ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد اور سکندرآباد میونسپل کارپوریشن کو ذریعہ G.O.M.S No 1033 M.A.G مؤرخہ ۲۵/ جولائی ۱۹۶۰ء ایک ہی کارپوریشن میں متبدل کردیا گیا۔

یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے، طبقہ جمعدار کی نمائندگی کے تعلق سے حکومت نے حسبِ ذیل مراسلہ نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔

نقل-مراسلہ دفتر معتمد مجلس صفائی-واقع ۲۵-۶ ماہ الٰہی ۱۳۴۲ھ ف

نشان (۵۰۷۳) (۲۹/مارچ ۱۹۳۳ء)

نشان مثل (۷۰) بابتہ ۱۳۴۲ف م (۱۹۳۳ء)

مہر

منجانب راجہ تریمبک راج بہادر اعزازی معتمد

مجلس صفائی حیدرآباد مقدمہ

بخدمت جناب نواب بہادر یار جنگ بہادر انتخاب رکنیت مجلس صفائی

یہ تحریک معزز مجلس صفائی منعقدہ ۱۲/ آبان ۱۳۴۱ف (۱۷/ستمبر ۱۹۳۱ء) بجائے محمد عبدالجبار خاں صاحب جمعدار عروب آپ کا نام رکنیت مجلس صفائی پر سرکار نے منظور فرمایا ہے۔ حسبِ قاعدہ ہر اجلاس کمیٹی میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی۔ اطلاعاً نگارش کی گئی ہے۔

فقط

شرح دستخط

اعزازی معتمد مجلس

۱۹۳۳ء میں پہلی بار ابتداءً نواب صاحب مجلس بلدیہ کے رکن قرار پائے اور انھیں اس طرح شہریانِ حیدرآباد کے بلدی مسائل سے آگاہی اور ان مسائل کے حل کے سلسلے میں وسیع پیمانے پر راست عوام کی خدمت کے مواقع حاصل ہوئے۔ بلدیہ کے رکن کی حیثیت سے نواب صاحب نے اس امر کو ضروری سمجھا کے قانون بلدیہ کو وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس خصوص میں ایک تحریک اجلاس میں پیش فرمائی جس کی تائید مولوی احمد محی الدین صاحب رکن بلدیہ نے فرمائی اور متفقہ طور پر نواب صاحب کی حسبِ ذیل تحریک منظور کی گئی۔

بخدمتِ شریف جناب معتمد صاحب مجلس بلدیہ حیدرآباد

قانون بلدیہ کے نفاذ کو ایک سال کا زمانہ منقضی ہوا۔ اس عرصہ مدت میں تجربہ اور عمل سے عام طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے گو قانون بلدیہ سالہا سال تک مجلس وضع قوانین کے ملاحظہ میں زیرِ غور رہا مگر دُنیا کے ہر قانون کی خامیاں اور حقیقی ضروریات

تجربہ اور عمل کے بعد ظاہر ہوا کرتی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ گذشتہ انتخاب اور عمل کے مدنظر ترمیمات کا ایک مسودہ مرتب کیا جائے۔ اس کی نسبت میری تحریک ہے کہ ایک سب کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کی جائے کہ وہ عام اعلان کے ذریعہ قانون سے متعلق ترمیمات کو جمع کرے اور غور کر کے اپنی رائے کے ساتھ مجلس بلدیہ میں پیش کرے تا کہ مجلس وضع قوانین میں پیش کروا کر اس کی منظوری حاصل کی جاسکے۔

۲۰/دے ۴۴ف (۲۴/نومبر ۱۹۳۴ء)

شرح دستخط۔نواب بہادر یار جنگ بہادر

میں تحریک کی تائید کرتا ہوں۔ مولوی احمد محی الدین صاحب

حکومت نے اس اہم تحریک کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک سلکٹ کمیٹی تشکیل دی۔

مسودہ قانون صفائی

مسودہ قانون صفائی مجلس وضع قوانین میں پیش ہے، اس پر غور وخوض کرنے کی غرض سے ایک سلکٹ کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔

حکومت کے اس اعلان کے بعد کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ نواب صاحب کے بھرپور تعاون سے مسودہ قانون بلدیہ کو ایک جامع شکل دی گئی اور بعد منظوری حکومت، یہ نافذ العمل قرار پایا۔

ابتداءً مجلس بلدیہ کے رکن ہوئے اور بعد ازاں نائب میر مجلس کی حیثیت سے شہریوں کی راست خدمت کے آپ کو مواقع حاصل ہوئے۔

''شہر میں آپ کی قوتِ عمل کی اَن گنت نظیریں قائم ہوگئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر ادارہ میں آپ کی طلب بڑھنے لگی۔ تعلیمی مجالس، معاشرتی انجمنوں، سیاسی اداروں اور موقتی جلسوں میں خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری نواب صاحب کی کسی نہ کسی ذمہ دارانہ حیثیت میں شرکت ناگزیر سمجھی جانے لگی اور ملک کے ہر مکتبِ خیال میں یکساں اعزاز حاصل ہوا۔ مقبولیتِ عام کی یہ وہ سندِ امتیاز تھی جس کے حصول کی تمنا ہر سینہ میں بے چین ہے۔ لیکن بہت کم کسی کو حاصل ہوتی ہے''۔ (بحوالہ لسان الامت از سعید صدیقی)

درسِ قرآن

۱۹۳۵ء

قرآن حامل قرآن کو کیا دیتا ہے؟

''کیا ایسی قوم کا تباہ ہونا ممکن ہے جس کے پاس قرآن دستور العمل ہو'' جو تمام دُنیا کے لئے شمع ہدایت ہے جو اپنی سادی اور آسان تعلیم میں شخصی و قومی اصلاح، انفرادی و اجتماعی فلاح و بہبود کے زریں اُصول رکھتا ہے جو اپنے مکمل ہونے کے ثبوت میں چیلنج کرتا ہے۔

ان کنتم فی ریب ما نزلنا علی عبدنا فأتو بسورة من مثلہٖ .

کیا ایسی کتاب جس قوم کے پاس ہو وہ تباہ ہو سکتی ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر ذلیل و حقیر عرب، گمراہ عرب، وادی غیر ذی زرع کے باشندے افتراق و انشقاق کے دالدادہ، عداوت و دشمنی کے شیدائی، قمار بازی و شراب خوری کی متوالی، بداخلاقی و جہالت کے علمبردار ایسے عرب جو اپنے عزیزوں اور بھائیوں کے گلے کاٹنے میں مصروف ہوں، چند ہی دنوں میں تہذیب و تمدن کے موجود، علوم و فنون سے مالا مال ہو گئے۔ جب صحرائے عرب سے نکلے اور قرآن کو بغلوں میں دباتے ہوئے آگے بڑھے تو فتح و کامرانی ان کے آگے آگے، اقبال و ظفر ان کے ساتھ ساتھ، دولت و حکومت ان کے پیچھے پیچھے، تہذیب و تمدن ان کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے، ان کو ایران نے اپنا تاج و تخت پیش کیا، روم نے اپنی شان و شوکت بخشی، یونان و ہند نے اپنے علوم و فنون نذر کئے، مصر نے اپنی دولت و حکومت ان کے قدموں میں ڈال دی، کیا یہ قرآن کا کھلا ہوا معجزہ نہیں کہ صحرائے عرب، تہذیب و تمدن، علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا اور صحرا نشین عرب علم و حکمت کے بانی قرار پائے۔

عزیزو! وہی قرآن اب تک موجود ہے وہی کتاب اللہ ہمارے ہاتھوں میں ہے اس پر عمل کر کے ہم پھر میدانِ ارتقاء کے شہسوار بن سکتے ہیں۔(حوالہ : جمعیت انصار المسلمین صدر بازار

ناگپور کے زیر اہتمام یوم القرآن کا انعقاد عمل میں آیا تھا، نواب صاحب نے اس جلسے میں ''قرآن حامل قرآن کو کیا دیتا ہے'' کے زیر عنوان تقریر فرمائی تھی اسی تقریر کو جناب دین الحق صاحب ندوی نے مرتب فرمایا تھا اور برار کے رسالہ انیس میں یہ تقریر شائع ہوئی تھی)

''ہماری حیاتِ ملی کا واحد سرچشمہ قرآن حمید رہا ہے اور رہے گا کوئی شک نہیں کہ فتوحاتِ اسلامیہ نے جب قرنِ اول کے مسلمانوں کو بیت المقدس اور انطاکیہ راہبان واحبار سے دوچار کیا اور ان کی طرف سے قرآن کے مقابلہ میں ارسطو کی منطق اور یونان کے فلسفہ کو استعمال کیا گیا تو عالمین قرآن دشمن کے ان ہی ہتھیاروں کو چھین کر اس سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہوئے اور یہیں سے ان علوم متداولہ کی بنیاد پڑی، جو آج قرآن فہمی اور قرآن دانی کے لئے لازمی خیال کئے جاتے ہیں اور جن کا سیکھنا اور ان کے ذریعہ قرآن کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھنے کی کوشش کرنا میں بھی ضروری سمجھتا ہوں، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور کیا اس سے کوئی انکار کرسکتا ہے کہ خدائے علیم و حکیم نے نزولِ قرآن کے لئے دُنیا کی سب سے زیادہ بنجر زمین اور سب سے زیادہ جاہل قوم کا انتخاب کیا۔ کیا خدا کو اس رسالتِ کبریٰ کو پہچاننے کے لئے کوئی عالم فاضل منطق اور فلسفی نہیں مل سکتا تھا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے نبی آئے عموماً علوم دُنیوی سے نابلد تھے اور خصوصاً اس کا آخری پیغام لانے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) لوح وقلم سے اس طرح بے نیاز کرکے پیدا کیا گیا تھا اور خود قرآن نے اس کے نبیؐ ہونے کی شہادت دی۔ کیا مکہ کے مزدور، مدینہ کے مزارع، گھروں کی عورتیں، صحراؤں کے بدو اور دامن کوہ کے وحشی اپنی ساری جہالتوں اور بے علمیوں کے ساتھ مسجد نبویؐ کے صحن میں جمع نہیں ہوتے تھے اور زبان محمد (ارواحنا وابادانا فداہ) سے چند آیتیں سن کر اپنے قلب و دماغ کی کہنہ اور نسبی گندگیوں سے پاک نہ ہوجاتے تھے اور پھر کیا وہی جاہل وہی اُمی فلسفہ و منطق سے نابلد سب سے پہلے معلم قرآن نہ بنے جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں قرآن ابرِ باراں اور چشمۂ آفتاب کی طرح خدا کی ایک رحمتِ عام ہے''۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء وھداکم وھدانا الی صراط مستقیم .

(حوالہ : رہبر دکن ۲۲/ آذر ۱۳۵۰ف م ۲۸/ اکتوبر ۱۹۴۰ء)

''کیا کسی قوم کی اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی جیب میں اکسیر رکھتی

ہواور پھر بھی دُنیا و دیں کے امراض میں مبتلا رہے۔ مجھے عالم انسانیت کی وہ مصیبت یاد ہے جب کہ آج سے تیرہ سو سال قبل معاشرت ہی نہیں بلکہ اس کی روح بھی ہر قسم کے امراض قبیحہ کا شکار تھی، حکیم مطلق اور خالق کائنات نے اس کی بے بسی پر رحم کھایا اور اپنے سب سے اچھے اور آخری رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ وہ نسخۂ شفا اولادِ آدم کو عطا فرمایا جس کی تعمیل کے نتائج دُنیا نے حیرت واستعجاب کی آنکھوں سے دیکھے۔ دُنیا کے پست اُٹھے اور معراجِ کمال کو پہنچ گئے۔ عالم کے ذلیل جن کے لئے کوئی مقام ہماری معاشرت میں باقی نہ رہا تھا ''**ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم**'' کا سہارا لے کر قیصر و کسریٰ کے دعوے ہمسری کرنے لگے، بے وسیلہ عورت نے اپنے سر سے ردائے ذلت اُتار کر مرد سے آنکھیں ملا کر کہہ دیا کہ اپنی بے جا بڑائی رہنے دو، قرآن کریم نے ''**ھن لباس لکم**'' کا پیغام سنا دیا ہے۔

جب تک یہ جبل متین مسلمانوں کے ہاتھ میں اور یہ شمع ہدایت ان کے سامنے رہی وہ ''**انتم الاعلون**'' کی بشارتوں سے پوری طرح بہرہ اندوز ہوتے رہے اور جس وقت سے اعراض کیا ''**فان له معیشة ضنکاً**'' کی وعید کا شکار ہیں''۔

(حوالہ : دعوتِ عمل از مولانا عبدالحامد بدایونی تقریظ نواب بہادر یار جنگ بعنوان ''شمع ہدایت''
مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۹۳، ۹۴)

نواب صاحب کو بچپن ہی سے قرآن سے گہرا اور قلبی لگاؤ تھا اس کا پس منظر یہ تھا کہ وہ پیدا ہوئے اور ایک ہفتے کے اندر ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، ان کی نانی فتح خاتون نے نواب صاحب کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، وہ اپنی نانی کی حیات تک (یعنی ۱۴ سال کی عمر تک) ان ہی کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ یہ ایک دین دار اور خدا ترس پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ نواب صاحب کو مطالعہ کا شوق نانی کے گھر ہی سے پیدا ہوا، یہ بے حد مذہبی قسم کی خاتون تھیں، اپنے نواسے کو بھی مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ اس طرح بچپن سے ہی ادائے نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کی پابندی نواسے پر لازم کر دی۔ کسی دن تلاوتِ قرآن پاک کے بغیر صبح کے سلام کو نانی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سلام کا جواب نہ ملنے پر استفسار فرمایا تو جواب ملا :

''تم نے اللہ میاں سے آج باتیں نہیں کیں اس لئے نہ میں تم سے بات کروں گی اور نہ

تمہارا سلام لوں گی‘‘۔

ان کی علمیت کے بارے میں دُنیائے علم کی شہرۂ آفاق ہستی ڈاکٹر رضی الدین (جونواب صاحب کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں) نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی علمیت کے بارے میں ارشاد فرمایا :

فن تجوید وقرأت کی تعلیم اس فن کے امام مولوی قاری روشن علی صاحب سے حاصل فرمائی، غرض قرآن اوراس سے متعلقہ اُمور میں انھیں قدرت حاصل تھی، قرآن کے ساتھ گہرا قلبی لگاؤ ہی تھا جس تعلق نے انھیں علوم ومعارف قرآن کا ایک جید عالم اوراس کی اشاعت کا ایک پرجوش مبلغ بنادیا۔

بہادر یار جنگ مفسرقرآن

قرآن اوراس سے متعلقہ علوم میں تفسیر صفِ اول میں آتی ہے اور علم تفسیر پر مہارت کے لئے اہل فن نے پندرہ علوم پر مہارت کوضروری قرار دیا ہے۔

اول لغت جس سے کلامِ پاک کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہوجائیں۔مجاہدؒ کہتے ہیں کہ جوشخص اللہ پراور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو جائز نہیں کہ بدون معرفت لغاتِ عرب کے کلامِ پاک میں کچھ لب کشائی کرے اور چند لغات کا معلوم ہوجانا کافی نہیں ۔اس لئے کہ بسا اوقات لفظ چند معانی میں مشترک ہوتا ہے اور وہ ان میں سے ایک دو معنی جانتا ہے اور فی الواقع اس جگہ کوئی اور معنی مراد ہوتے ہیں۔

دوسرے نحو کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ اعراب کے تغیر وتبدل سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں اوراعراب کی معرفت نحو پر موقوف ہے۔تیسرے صرف کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ بنا اور صیغوں کے اختلاف سے معانی بالکل مختلف ہوجاتے ہیں۔ابن فارسؒ کہتے ہیں کہ جس شخص سے علم صرف فوت ہوگیا اس سے بہت کچھ فوت ہوگیا، علامہ زمخشری اعجوبات تفسیر میں نقل کرتے کہ ایک شخص نے کلامِ پاک کی آیت (یوم ندعوا کل اناس بامامھم)(ترجمہ) جس دن کہ پکاریں گے ہم ہر شخص کواس کے مقتداء اور پیش رو کے ساتھ، اس کی تفسیر صرف کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ کی کہ جس دن پکاریں گے ہر شخص کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔امام کا لفظ جو مفرد تھا اس کو اُم کی

جمع سمجھ لیا اگر وہ صرف سے واقف ہوتا تو معلوم ہوجاتا کہ اُم کی جگہ امام نہیں آتی ۔ چوتھے اشتقاق کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ لفظ جب کہ دو مادوں سے مشتق ہوتو اس کے معنی مختلف ہوں گے جیسا کہ مسیح کا لفظ ہے کہ اس کا اشتقاق مسح سے بھی ہے جس کے معنی چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہیں اور مساحت سے بھی ہے جس کے معنی پیائش کے ہیں، پانچویں علم معانی کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کی ترکیبیں معنیٰ کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں ۔ چھٹے علم بیان کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کا ظہور وخفا تشبیہ وکنایہ معلوم ہوتا ہے۔ ساتویں علم بدیع جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں، یہ تینوں فن علم بلاغت کہلاتے ہیں، مفسر کے اہم علوم میں سے ہیں اس لئے کہ کلامِ پاک جو سراسر اعجاز ہے اسی سے اس کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ آٹھویں علم قرأت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ مختلف قرأتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں اور بعض معنی کے دوسرے معنی پر ترجیح معلوم ہوجاتی ہے۔ نویں علم عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے اس لئے کہ کلامِ پاک میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے ظاہری معنی کا اطلاق حق سبحانہ و تقدس پر صحیح نہیں۔ اس لئے ان میں کسی تاویل کی ضرورت پڑے گی جیسے کہ **یداللہ فوق ایدیھم** دسویں اُصول فقہ کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوسکیں ۔ گیارھویں اسباب نزول کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ شانِ نزول سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوں گے اور بسا اوقات اصل معنی کا معلوم ہونا بھی شانِ نزول پر موقوف ہوتا ہے۔ بارھویں ناسخ و منسوخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے تا کہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہوسکیں۔ تیرھویں علم فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں ۔ چودھویں ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جو قرآن پاک کی مجمل آیات کی تفسیر واقع ہوئی ہیں۔

ان سب کے بعد پندرھواں وہ علم وہبی ہے جو حق سبحانہ وتقدس کا عطیۂ خاص ہے اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتا ہے جس کی طرف اس حدیثِ شریف میں اشارہ ہے۔ **من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم** (جب کہ بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ، ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا)

ایک حدیث میں ملا علی قاریؒ نے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے کلامِ پاک کو حاصل کرلیا اس

نے علومِ نبوت کو اپنی پیشانی میں جمع کرلیا۔(حوالہ : فضائل قرآن ازمولانا حافظ محمد زکریا شیخ الحدیث صفحہ ۸)

قرآن پاک کے معانی میں غور وفکر، اولین وآخرین علم قرار پایا۔" ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اگر علم چاہتے ہو تو قرآن پاک کے معانی میں غور وفکر کرو کہ اس میں اولین وآخرین کا علم ہے"۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاننے والے کے لئے دوسروں کو سکھانے کا حکم فرمایا :

عن عثمانؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر کم من تعلم القراٰن وعلمہ . (رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ ھذا فی الترغیب وعزاہ الی مسلم ایضاً لکن حکی الحافظ فی الفتح عن ابی العلاء ان مسلماً سکت عنہ)

حضرت عثمانؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

قرآن حکیم سے شغف اور قرآنی علوم پر عبور کا تقاضہ یہ تھا کہ درسِ قرآن کی جانب توجہ کی جائے۔اسی احساس نے نواب صاحب کو اس جانب متوجہ کیا اور ۱۹۳۵ء سے ان کا مشغلہ صبح گاہی تفسیر قرآنی تھا۔

عالم خاں کے والد کے مکان کے احاطے میں قدیم سے ایک مسجد تھی۔محکمۂ آرائش بلدیہ نے بضمن توسیع روڈ مکان مذکورہ کو حاصل کرلیا مکان کا انہدام عمل میں آیا اور مسجد روڈ پر آ گئی (یہ مسجد نواب صاحب کی ڈیوڑھی سے دوسو گز کے فاصلے پر واقع ہے)

یہ چھوٹی مگر پختہ مسجد ہے،نواب صاحب نے پہلے اس مسجد کی درستگی کا اہتمام فرمایا۔لوہے کی جال لگوائی ،شیڈ ڈالے ،صحن کی دیواریں اُونچی کروائیں ،نل لائٹ ، بیت الخلاء اور حمام کا انتظام فرمایا۔۱۹۳۵ء سے اپنی حیات کے آخری دن کی صبح تک تفسیر کا سلسلہ قائم رہا،باوجود تفاسیر پر قدرت کے ہر روز پوری تیاری کے ساتھ تفسیر بیان فرماتے ، فجر کی نماز خود پڑھاتے ،دُعا ہوتی ، پھر چند آیات کی تلاوت فرماتے ، پھر تفسیر بیان کرتے ،معنی ومطلب ،شانِ نزول کے ساتھ ساتھ اس آیت سے متعلقہ مضمون پر عالمانہ روشنی ڈالتے ، جب سورت ختم ہوجاتی تو اس کا خلاصہ بھی بیان فرماتے۔

"تفسیر کا جب سلسلہ شروع کرتے تو آنسوؤں میں گندھے ہوئے الفاظ ہر سننے والے

کے لئے موتی کا مالا بن جاتے''۔(حوالہ : مصلح قوم، مفکر ملت از مولوی سید خلیل اللہ حسینی)

نواب صاحب کے دستِ مبارک سے لکھی ہوئی تفسیر اور تعوذ، سورۂ فاتحہ کی (ادھوری تفسیر) ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس طرح ہمیں ان کے درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔

تفسیر

تفسیر و تاویل

تفسیر کا مادہ فسر سے مشتق ہے اور فسر چھپی ہوئی چیز پر سے پردہ اُٹھانے یا اس کو ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور جہاں کسی آیت میں جملہ یا لفظ کی تفسیر کی جائے تو یہاں اس کے معانی معقولہ کا بیان کرنا مراد ہے پس ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شئی یا اس کے معانی معلوم ہوں وہ تفسیر ہے۔ بعض نے صرف مفرد و غریب الفاظ کے معنیٰ بیان کرنے ہی کو تفسیر کہا ہے اور بعض کہتے ہیں تفسیر لفظ تفسیرۃ سے مشتق ہے اور تفسیرۃ وہ دلیل ہے جس میں غور کر کے طبیب مرض کا پتہ چلا لیتا ہے، پس اسی طرح مفسر آیات اور ان کی شان میں غور کر کے معانی و اسرار و حقائق کو معلوم کر لیتا ہے۔

تاویل اول سے مشتق ہے اور اول کے معنیٰ اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ پس تاویل بھی معانی آیت اور الفاظ آیت کے وجوہ مستنبطہ کا بیان کرنا ہے لیکن تفسیر و تاویل میں فرق ہے کہ تفسیر منقولات سے آگے نہیں بڑھتی اور تاویل عقل و فہم کی بھی محتاج ہوتی ہے۔

استعاذہ یا تعوذ

استعاذہ کے الفاظ پسندیدہ و مروجہ ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' ہیں جو آیت شریف ''**فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' سے ماخوذ ہیں۔ اعوذ باللہ کے معنی ہیں ''پناہ طلب کرتا ہوں۔ میں اللہ کی'' اور یہ عاذ یعوذ سے ہے۔ شیطان لفظ شطن سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں وہ جو رحمت سے دور کر دیا گیا ہو، بعض نے اس کو مشاط یشیط سے مشتق بتایا ہے کیوں کہ وہ غصہ سے جل گیا اور ہلاک ہوگیا، شیطان اسم ہے ہر اس جن و انس کے لئے جو سرکش متکبر ہو۔ لیکن یہاں وہ شیطان جن مراد ہے جو آگ کی قوت سے پیدا کیا گیا۔ اسی لئے اس میں قوتِ غضبی زیادہ ہے، لفظ رجیم کو بعضوں نے فعیل کے وزن پر بمعنی فاعل پڑھا ہے اور

اس کے معنی وسوسہ ڈالنے والے کے لئے ہیں اور بعض مفعول کے معنی میں پڑھ کر اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ بارگاہِ رب العزت سے مردود ہونے کے بعد جب وہ آسمان کی باتیں دریافت کرنے کے لئے اُوپر کی طرف چڑھتا ہے تو اس کو فرشتے شہاب ثاقب سے مار کر نیچے ڈھکیل دیتے ہیں اس لئے اس کو رجیم کہا گیا اور اکثروں نے اس کے معنی مطرود اور مردود کے لئے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی سزا میں اس کو اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور اس کو رحمت وخیر اور درجات ملأ اعلیٰ سے محروم کر دیا۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

اس سورۃ میں سات آیتیں ہیں اور ستائیس کلمات اور ایک سو چالیس حروف ہیں۔ اس کے مقامِ نزول میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، لیکن مجاہد اس کے مدینہ شریفہ میں نازل ہونے کے قائل ہیں، بعض علماء نے مکہ اور مدینہ میں دونوں جگہ اس سورۃ کے نازل ہونے کو مانا اور اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ دو وقت نازل کرنے سے اس کے علو مرتبت اور عظمتِ شان کا اظہار مقصود تھا۔

اس سورۃ کے کئی نام ہیں پہلا فاتحۃ الکتاب، یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس سے قرآن شریف اور اس کی کتابت شروع ہوتی ہے اور اسی کو نماز میں بھی دوسری آیاتِ قرآنی سے قبل پڑھا جاتا ہے۔

دوسرا نام اس کا اُم القرآن ہے۔ ہر چیز کی اصل کو ماں کہا جا سکتا ہے چوں کہ سورۂ فاتحہ بھی قرآن شریف کی اصل ہے اس لئے اس کو اُم القرآن کہا گیا۔

تیسرا نام سبع المعانی ہے، سبع اس لئے کہ اس میں سات آیتیں ہیں اور اس لئے کہ نماز میں وہ دہرائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بعض علماء کے قول کے مطابق وہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔

چوتھا نام سورۃ الحمد ہے کیوں کہ اس میں سورۃ کی ابتداء حمد باری سے کی گئی ہے۔

پانچواں نام الوافیہ۔ وافیۃ کامل اور پورے کو کہتے ہیں۔ چوں کہ نماز میں یہ سورۃ پوری پوری پڑھی جاتی ہے اور اس کو دوسری سورتوں کی طرح نصف ایک اور نصف دوسری رکعتوں میں پڑھنا جائز نہیں ہے اس لئے اس کا نام وافیہ رکھا گیا۔

اس کا چھٹا نام کافیہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا نماز میں پڑھ لینا نماز کی تکمیل کے لئے کافی ہے۔ دوسری سورتیں نہ پڑھی جائیں تو صرف سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جاتی ہے لیکن اس کے بجائے دوسری سورۃ پڑھ لی جائے اور اس کو ترک کر دیا جائے تو نماز ہرگز نہیں ہوتی، اس لئے اس کو کافیہ بھی کہا جاتا ہے۔

اس کا ساتواں نام سورۂ شفاء بھی ہے کیوں کہ حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ اس کو پڑھ کر دم کرنے سے بیماریاں دفعہ ہو جاتی ہیں۔

فضائل سورۂ فاتحہ

اس سورۃ مبارکہ کے فضائل میں کئی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، حضرت ابوسعید ابن المعلے، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کی احادیث سے ثابت ہے کہ یہ سورۃ ایسی باعظمت و مرتبت ہے کہ اس کی جیسی کوئی سورۃ نہ تو قرآن میں کوئی ہے نہ توراۃ و انجیل میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی سورۃ نازل فرمائی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نماز اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ سورۂ فاتحہ اس میں نہیں پڑھی جائے اور اسی حدیث میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ سورۃ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے۔ نصف میری جانب اور نصف میرے بندے کی جانب۔ جب بندہ **الحمدللہ رب العالمین** کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری تعریف کی اور جب بندہ **الرحمن الرحیم** کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میری ثناء بیان کی بندے نے اور جب **مالک یوم الدین** کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور کبھی فرماتا ہے بندے نے مجھے اپنے کام سونپ دیئے۔ کیوں کہ قیامت کا دن یومِ حساب ہے اور اس دن بندوں کے سارے اعمال خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں سونپ دیئے جاتے ہیں اور جب بندہ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے کیوں کہ اس میں خدا کی ربوبیت اور اپنی عبدیت کا اظہار مشترک طور پر کیا گیا ہے اور خدا کو قابل استعانت اور اپنے آپ کو عاجز ظاہر کیا گیا اور جب بندہ **اھدنا الصراط** الخ کہتا ہے تو پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لئے

اور ہر وہ چیز میرے بندے کے لئے جواس نے مانگی۔

اس حدیثِ شریف سے ظاہر ہے کہ یہ سورۃ شریف جامع اور افضل السور ہے کیوں کہ اس میں خدا کی حمد وثنا اس کی ربوبیت اور قدرت کے اقرار کے ساتھ ساتھ دُعائے صراط مستقیم بھی شامل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تسمیہ کا باء حرف جار سے ہے اور اس کے بعد جو الفاظ واقع ہوئے ہیں وہ سب مجرور ہیں۔ یہ ترکیبِ نحوی کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جار و مجرور متعلق ہوئے ہیں کسی فعل یا شبہ فعل سے لیکن لفظ اس جملہ میں کوئی ایسا متعلق نظر نہیں آتا۔ اس لئے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابدأیا اقراء محذوف و مضمر ہے۔ یعنی اقراء باسم اللہ یا ابدأ باسم اللہ پڑھتا ہوں میں یا شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے بسم اللہ اصل میں باسم اللہ تھا، الف قرأت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ساقط کر دیا گیا اور بسم اللہ رہ گیا، بعض دفعہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے آیت شریف **فسبح باسم ربک العظیم** میں الف کیوں باقی رکھا گیا۔ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ آیت مذکور اور ایسی ہی دوسری آیتیں قرآن مجید میں شاذ شاذ مقامات پر آئی ہیں جہاں الف کا لکھنا کوئی ایسا بار نہیں ہے، لیکن تسمیہ کی وہ وقت اور ہر کام کی ابتداء کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے ضرورت تھی کہ اس کی قرأت کو حذف الف کے ساتھ سہل بنایا جاتا بحذف الف اور لکھا بھی جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

تسمیہ کی تفسیر لکھتے وقت ایک اور بحث پیدا ہوتی ہے کہ باء کو بجائے سیدھے طریقہ پر (بسم اللہ) لکھنے کے بلند کر کے اس طرح کیوں لکھا جاتا ہے (بسم اللہ) اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ الف کو حذف کرنے کے بعد اس کی بلندی باء کو جو ایک پست حرف ہے دے گئی اور اس کو بجائے ب کے ب لکھا گیا۔ بعض نے کہا کہ اس حروف سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے اس کو شاندار بنانے کے لئے اس طرح لکھا جاتا ہے اور اس کے ثبوت میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی ایک تاکید نقل کی کہ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے کہ باء کو طول دے کر سین کو ظاہر کر کے اور میم کو مدور لکھا کرو تاکہ کتاب اللہ کی تعظیم ہو سکے۔

لیکن ہمارا خیال ہے یہ سب قیاسات ہیں۔ رسم الخط ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جو خط

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اگر اس کی ایک سطر ہمارے سامنے رکھ دی جائے تو ہم کو اس کے پڑھنے میں تکلیف ہوگی، جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا خط میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں جن کی وجوہ کو تفصیل سے گنانا تقریباً محال ہے۔

اسم

بعضوں نے اسم کو عین اور ذاتِ مسمی کہا ہے اور اس کی دلیل میں آیت قرآن **انا نبشرک بغلام اسمه یحییٰ** اور اس کے بعد کا وہ حصہ جس میں حضرت یحییٰ کو یا یحییٰ کہہ کر مخاطب فرمایا گیا ہے پیش کی ہے اور استدلال کیا ہے کہ یحییٰ اگر چہ اسم ہے لیکن جب اس لفظ سے پکارا جائے تو اس سے مسمیٰ کا عین اور اس کی ذات ہی مراد ہوتی ہے۔

صاحب لباب فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے اور اس کے برخلاف صحیح اور پسندیدہ مذہب یہ ہے کہ اسم مسمیٰ کی ذات وعین کا غیر ہے کیوں کہ اسم وہ علامت ہے جس سے کسی شئ کی ذات پہچانی جاتی ہے اور وہ اصوات مقطعہ اور حروف مؤلفہ کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ وہ آلہ ہے کسی چیز کو پہچاننے کا پھر کس طرح درست ہوسکتا ہے مسمیٰ یعنی شئ معلوم اور اسم یعنی آلہ علم دونوں ایک ہوں۔ اگر یہ درست ہوتا تو پھر ایک چیز کا ایک ہی نام ہوتا حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت ایک شئ کے کئی نام اور بعض وقت ایک نام کی کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ مثلاً پروردگار عالم کہ وہ ایک و یکتا ہے مگر اس کے وہ اسماء حسنیٰ ہیں اور بہادر خان کہ سیکڑوں افراد کا نام ہے اور ہوسکتا ہے۔

آیت شریف **انا نبشرک بغلام اسمه یحییٰ** کا عین وذات ہونے کی دلیل میں غلط طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، حالاں کہ خود اسی آیت سے اسم اور مسمیٰ کا غیر ہونا ثابت ہورہا ہے۔ اگر اسم اور مسمیٰ ایک ہوتے تو ارشاد ہوتا بغلام ہو یحییٰ بجائے اس کے اسمه یحییٰ فرمایا گویا یحییٰ الگ چیز ہے اور ذات یحییٰ الگ شئ جو اسم کے ذریعہ پہچانی گئی۔

اشتقاقِ اسم

لفظ اسم کے اشتقاق میں بھی اختلاف ہے، بصرہ کے علماء کا خیال ہے لفظ اسم سمو سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں یعنی اسم اس قدر بلند ہوا کہ اپنے مسمیٰ پر چھا گیا اور اس کا علم بن گیا اور کوفیوں کا قول ہے کہ اسم اسمة سے مشتق ہے جس کے معنی علامت کے ہیں گویا وہ مسمیٰ

کی علامت ہے لیکن کوفیوں کا قول صحیح نہیں تھا جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسم کی تصغیر سمی اور اس کی جمع اسماء آتی ہے حالاں کہ اگر اس کی اصل اسمۃ ہوتی تو اس کی تصغیر وسیم اور جمع اوسام آنا چاہئے تھا۔توضیح حسبِ ذیل ہے۔

سمو سمو کی تصغیر سمیو ہوگی لیکن اس میں واؤ جمع ہوا اور ماقبل ساکن تھا اس لئے واؤ کو ی سے بدلا گیا، سمی ہوا اور دونوں یاء مدغم ہوکر سمی ہوئے۔

برخلاف اس کے اگر سمۃ کی تصغیر وسیم ہو تو سمی کسی طرح نہیں آ سکتا۔

اللہ

یہ اسم اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اسی ذات واجب الوجود کے لئے مختص ہے، اس نام میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔جیسا کہ ارشاد فرمایا۔**ھل تعلم له سمیاً** یعنی اس کے سوا کسی اور کو اس نام سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا۔اس کے اشتقاق میں بھی اختلاف ہے، بعض کا قول ہے کہ وہ کسی لفظ سے مشتق نہیں ہے لیکن بعضوں نے اس کے چار شتقاق بیان کئے ہیں :

۱) **الٰھۃ** یعنی مستحق عبادت اس کا ماضی مضارع **اله یاله** ۔

۲) **الوله . وهو الفزع** یعنی ساری مخلوقات اپنی احتیاجات کے باعث اس کی طرف جھکتی ہے اور اس سے خوف کھاتی ہے۔

۳) **اله** سے کہا جاتا ہے۔یعنی مجھے اس کے پاس سکون ہوا۔

۴) **و لاہ** واؤ مکسور ہمزہ سے بدل کر **الــه** ہوگیا ہے اور وہ اس وجہ سے ہر مخلوق اس کی والہ ہے۔

اس اسم مقدس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کے حروف میں سے ایک یا بعض حذف بھی کردیئے جائیں تو وہ بامعنی باقی رہ جائے گا۔مثلاً الف نکل جائے تو للہ رہ جاتا ہے اور اگر کوئی ایک لام نکل جائے تو الہ۔اور اگر الف اور دونوں لام بھی نکال لئے جائیں تو پھر بھی ضمہ کو واو سے بدلنے پر ہو رہ جائے گا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ یہی اسم اعظم ہے اور پروردگار کا وہ نام ہے جو اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے۔برخلاف دوسرے اسماء کے وہ اس کے صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

الرحمٰن الرحیم

یہ دونوں پروردگار عالم کے اسماء صفاتیہ ہیں اور ہم معنیٰ ہیں یعنی ''رحمت والا'' اور یہ دونوں اسماء تاکید کی غرض سے اور بندوں کو خدا کی طرف ترغیب دلانے کی غرض سے یکجا استعمال کئے ہیں بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنی میں فرق ہے خصوصیت وعمومیت کا۔ الرحمٰن کے معنی رزاق فی الدنیا کے ہیں یعنی کافۃ الناس پر بلاخصوصیت مومن وکافر اس کی رحمت رزق عام ہے۔ اور رحیم کے معنی قیامت و آخرۃ میں مؤمنین پر رحم وبخشش کرنے والے کے ہیں، اس لئے بعضوں نے رحمٰن الدنیا ورحیم الآخرۃ بھی کہا ہے۔ رحمت امادۂ احسان وخیر کو کہتے ہیں جو اپنے والوں پر کیا جائے یا اس کا مطلب مستحق عذاب سے عذاب کا دور کرنا اور غیر مستحق احسان وخیر پر احسان وخیر کرنا بھی ہوسکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ رحمٰن مصائب کے دور کرنے والے کو اور رحیم گناہوں کے بخشنے والے کو کہتے ہیں۔ اب ہم نواب صاحب کے درسِ قرآن کی محفلوں کا حال پڑھیں گے۔ جن محفلوں میں نواب صاحب شرکائے درس کو اشکوں سے وضو کرواتے۔ نص قرآنی کی حدت سے زندگی کی آخری سانس تک دلوں کو گرماتے رہے۔

درس تفسیر کے لئے مرحوم پوری سادگی کے ساتھ کرتہ اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے شیخ الہندؒ کے ترجمہ والی حمائل ساتھ لئے مسجد میں پہنچ جاتے تھے، کبھی جناح کیپ بھی پہنتے تھے۔ سردی کے دنوں میں شب خوابی کا لباس جسم پر ہوتا جس پر غالباً اون کا ایک شاندار جبہ پہنے ہوتے، پاؤں میں پمپ شوز ہلکا جوتا یا جوتے کا کاٹا ہوا سلیپر ہوتا، نماز خود ہی پڑھاتے اور نماز کے بعد نہایت رقت و صدقِ دل سے دُعائیں مانگتے اور ''ربنا اتنا فی الدنیا'' والی دُعا کی تکرار چار چار پانچ پانچ بار کرتے پھر دُعا ختم کر کے بڑی دیر تک سر جھکا کر روتے اور گڑگڑاتے اس کے بعد کلامِ پاک کھولا جاتا، تلاوت آیت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف انداز میں سناتے حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ بھی بتا دیتے، سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے، جب خود ترجمہ کر چکتے تو پوچھتے کوئی ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابل ترجیح ہے، آپ جسے چاہیں اختیار کریں، اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اُصول بتا دیئے جاتے، لغات کی تشریح ہوتی اور پھر مطالب ومسائل زیر بحث آتے، درس میں بڑے بڑے کلامی

مسائل حل ہوتے، فلسفہ کی گتھیاں سلجھائی جاتیں۔ فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں سنائی جاتیں۔ اگر کوئی خاص پتہ کی بات بتانی ہوتی یا کوئی نکتہ بیان کرنا ہوتا تو فرماتے :

"دیکھو میاں ایک بات بولتوں یاد رکھو اور باندھ رکھو مگر بڑے مولی صاحب سے نہیں بولنا"

آیات کو پڑھ کر بار بار وجد کرتے اور فرماتے "اہا ہا کیا بات فرمائی گئی ہے" روزانہ بالعموم ایک ہی آیت کی تفسیر ہو سکتی تھی اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار چار پانچ پانچ دن ہوتی۔

ایک مرتبہ درس ختم ہونے کے بعد حسبِ عادت دُعائے ماثورہ (**اللھم ارحمنا بالقرٰان العظیم**) پڑھی، نہ معلوم کیا خیال آیا گریہ طاری ہو گیا۔ فرمانے لگے :

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ساری ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں، اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے یہی ان کی پناہ گاہ ہے"۔

سورۂ فتح کی آیت **ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہٖ** زیر تفسیر آئی تو صرف "اظہارِ دین" یعنی دین اسلام کے دیگر ادعیان پر غلبہ کی تفسیر پانچ روز تک ہوتی رہی۔ ایک روز تعلیمات اسلام کے غلبہ کا ذکر ہوا۔ دوسرے روز عبادات کا تیسرے روز فرائض و معاملات کا، چوتھی نشست میں اخلاقیات کا اور پھر آخری مرتبہ ظاہری غلبہ کی وضاحت کی گئی اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں قرآن ختم کرنا ہے ورنہ ابھی فلسفیانہ پہلو رہ گیا اور دوسرے نقاطِ نظر سے تشریح نہ ہو سکی۔ فرماتے تھے بڑی مشکل ہوتی ہے۔ قرآن کے حرف حرف کا یہ عالم ہے کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اسی طرح بیعتِ رضواں کا ذکر آیا تو ایک نشست میں تو صرف واقعہ بیعت سنایا گیا اور دوسرے دن عارف رومیؒ کے بعض اشعار سے اس کی نہایت بلند اور عارفانہ توضیح کی گئی، جب کوئی سورت ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا کہ ایک اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے۔

غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی تھی اسی لئے چھ برس میں پورے کلامِ پاک کی تفسیر بیان کی جاسکی۔

قرآن شریف پڑھنے اور پڑھانے کے دوران میں شدت تاثر کا یہ عالم ہوتا کہ بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، بار ہا ایسا اتفاق ہوا کہ ادھر قرآن مجید کی آیتوں پر ایک نظر ہی پڑی تھی اور ادھر دل کی کیفیتیں آنکھوں پر زبانی ظاہر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہچکیاں بندھ گئیں اور جب کافی وقت گذرنے پر قابو نہ حاصل کیا جاسکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی۔

ایک روز رمضان کے مہینے میں حسبِ دستور درس کے لئے مسجد میں آئے آنکھیں ڈبڈباتی ہوئی تھیں، آتے ہی نماز میں کھڑے ہو گئے ادھر نیت باندھی ادھر گھگی بندھ گئی۔ بڑی مشکل سے نماز ختم کی تھوڑی دیر تک حسبِ عادت مراقبہ میں رہے پھر درس شروع ہوا لیکن آنسو برابر جاری تھے جب تک تفسیر سناتے رہے اشکوں کا سیلاب بہتا رہا۔ تفسیر ختم کر کے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے دل کا درد ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا، دُعا ختم کر کے حاضرین کو مخاطب کیا اور صرف اتنا کہا کہ ”میاں قرآن پڑھو“ ان الفاظ میں نہ جانے کیا جادو بھرا ہوا تھا کہ سب کے سب زار و قطار رونے لگے۔ تفسیر ختم کر کے ایسے لاجواب انداز اور اس درجہ خلوص و رقت سے دُعا کرتے کہ اس کی قبولیت کا یقین ہو جاتا۔ کہتے کہ ربنا ہمارے قلوب کو تو قرآن کے معانی و مطالب کے لئے کھول دے، ہم کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ خدایا ہم کو سیدھے اور غلط راستہ میں امتیاز کرنے کی توفیق دے۔ ہم وہی کریں جو تیرا حکم ہو اور جس پر تیرے نیک بندے چلتے رہے وغیرہ وغیرہ اس کے بعد عربی میں ایک لمبی چوڑی دُعا پڑھتے اور منہ پر سیدھا ہاتھ پھیر کر اُٹھتے اور السلام علیکم کہہ کر مکان کی طرف چلے جاتے۔

جب چھ سال کی طویل مدت کے بعد قرآن مجید ختم ہو سکا تو مسرت و انبساط کا جو عالم مرحوم پر طاری تھا اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ بس آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے۔ خوشی سے بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے، اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین کو کھانے پر بھی مدعو کیا اور پر تکلف دعوت دی باوجود نوکروں کی موجودگی کے خود سربراہی میں مصروف تھے اس موقعہ پر بعض لوگوں نے پھولوں کے ہار پہنائے تو مرحوم فرمانے لگے :

''پہنایئے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن رہے ہیں، ایک وہ جب کہ زیارت بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا اور ایک آج جب کہ اس کے فضل وکرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں''۔

ایک صاحب نے عرض کیا۔ ''نواب صاحب! یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے'' مرحوم نے فرمایا : ''آپ کو یہ کیسے گمان ہوگیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا''۔

چنانچہ دوسرے ہی دن سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور یومِ وفات تک جاری رہی۔ ۱۳/ رجب ۱۳۶۳ھ بروز اتوار آپ کی تفسیر کا آخری دن تھا، سورۂ بقر کے چوبیسویں رکوع (پارۂ دوم کے آٹھویں رکوع) کی ابتدائی چار آیتوں تک کی تفسیر بیان کی جا چکی تھی، آج پانچویں آیت زیر درس تھی۔ وقتِ مقررہ پر مسجد میں تشریف لائے تو تفسیر سے پہلے کہنے لگے کہ :

''آج میں زیادہ تیار نہیں ہوں اور روزانہ جو مطالعہ رات میں کر کے یہاں آتا تھا وہ آج نہیں کر سکا۔ گذشتہ دو راتوں سے سالگرہ[1] کے عشائیوں میں وقت گذرا اور یہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ ہم کبھی کبھی اللہ کی طرف سے ہٹ کر اس طرح دُنیوی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ خدا ہمیں بھلائی کی توفیق دے''۔

پھر قرآن کھولا اور یہ آیت تلاوت فرمائی : **وقتلوهم حتىٰ لاتكون فتنة ويكون الدين لله فان انتهوا فلا عدوان الا على الظالمين .**[2]

اور ترجمہ کے بعد الفاظ و مطالب کی تشریح فرمانے لگے، لفظ فتنۃ کے متعلق فرمایا کہ اُردو میں اس کے معنی شرارت اور خرابی کے لئے جاتے ہیں مگر عربی میں اس کے اصل معنی ہیں ''آزمانا

---

[1] نظام دکن میر عثمان علی خاں کا یوم پیدائش ہے اس زمانہ میں اس موقع پر جلسے منعقد ہوتے تھے اور پارٹیاں دی جاتی تھیں۔

[2] اور لڑو ان سے یہاں تک کہ باقی نہ رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔ (بالفاظ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ)

اور امتحان کرنا'' اور اس مقام پر لاتکون فتنة کے الفاظ کے ساتھ ویکون الدین للہ کے الفاظ اس حالت کو واضح کرتے ہیں کہ جس کو ''فتنة'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی جب دین اللہ کے لئے نہ ہو، کفار برسر اقتدار ہوں، کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں اور مسلمان ان کے قہر و غلبہ کی وجہ سے خدا کے احکام پر پوری طرح عمل نہ کر سکتے ہوں تو یہ دراصل فتنہ کی حالت ہے۔ اس حالت کو ''فتنہ'' اس مناسبت سے کہا گیا ہے کہ فتنہ کا قطعی استیصال کرو اور اس کے قطعی استیصال تک لڑو۔ اس وقت تک لڑو جب تک اللہ کے نام اور احکام کا بول بالا نہ ہو جائے اور اس کی حمایت میں لڑنے والی قوتوں کو کامل غلبہ اور فتح حاصل نہ ہو جائے اس کے بعد اگر وہ باز آ جائیں تو ہاتھ روک لو اور زیادتی نہ کرو اور پناہ میں لو بجز ظالمین کے جن کے خمیر ہی میں شر موجود ہے چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اُٹھا کر حضور انورؐ نے فتح مکہ کے بعد تلوار میان میں ڈال دینے والوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور ابوسفیان کے مکان میں پناہ لینے والوں اور خانۂ کعبہ و مسجد حرام میں گھسنے والوں کو پناہ دی بجز پانچ یا چھ ظالمین کے جن کے متعلق حکم تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں کو بھی لپیٹ لیں اور حرم میں بھی گھس جائیں تو تب بھی ان کو وہاں قتل کر دو۔

اس سے آگے کی آیت میں چند حرام مہینوں کا ذکر ہے۔[1] تمہیدی طور پر اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ : ''عرب میں ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب مقدس مہینے سمجھے جاتے تھے چوں کہ ذی الحجہ کے مہینے میں لوگ حج کے لئے دور دور سے آتے تھے اور سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہو جاتا تھا اس لئے اس اثناء میں امن کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور آپس کی خانہ جنگیاں موقوف کر دی جاتی تھی، اسی طرح محرم کا مہینہ واپس ہونے کے لئے پر امن بنا دیا جاتا تھا اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لئے خاص تھا اس لئے اس مہینے میں بھی جنگ ملتوی کر دی جاتی تھی اور اسی بناء پر ان چار مہینوں کو حرام (یعنی حرمت والے) مہینے کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ نالائق عرب اگر کسی سے انتقام لینا یا غارت گری کرنا چاہتے تو حرام مہینوں میں بھی جنگ کا اعلان کر دیتے اور کہتے کہ ہمارے لئے یہ مہینے مقدس نہیں ہیں۔ مقدس مہینے بعد میں آئیں گے جب ہم صلح کر لیں گے یا لڑائی ختم کر دیں

---

[1] الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل مااعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین

گے اس طرح جب چاہتے مہینوں کو اور ان کی ترتیب ہی کو بدل دیتے''۔

یہاں تک بیان کر کے فرمایا کہ : ''آج یہیں تک رہنے دیجئے۔ باقی انشاءاللہ کل بیان کریں گے'' لیکن آہ! وہ ایسا آج تھا کہ جس کی کل قیامت اور روز جزاء ہی ہے۔ یہ بات کس کے خیال میں آسکتی تھی کہ ''کل'' نمودار تو ہوگا لیکن اس ''کل'' میں چہچہانے والا عندلیب اور اپنی طرز میں بیان کرنے والا مفسر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا اور ''کل'' نمودار تو ہوگا لیکن ایک عالم کے جانے والے کے غم میں سوگوار دیکھے گا۔

ایک دن پہلے یعنی ہفتہ کے روز بارش ہو رہی تھی اور مرحوم سمیت درسِ تفسیر میں صرف چار آدمی تھے۔ اس لئے وقاتلوھم والی آیت کی تفسیر ختم ہونے کے بعد گذشتہ دو آیتوں کی تفسیر کا خلاصہ بھی بغیر فرمائش بیان کر دیا تا کہ سب لوگ مستفید ہوں اس سے حاضرین بہت خوش ہوئے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری تفسیر ہے گذشتہ دو آیتوں کے الفاظ یہ ہیں :

واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنة اشد من القتل ولا تقاتلوھم عندالمسجدالحرام حتی یقاتلوکم فیه فان قاتلوکم فاقتلوھم کذالک جزاء الکافرین فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم[1] .

ان آیات کے متعلق فرمانے لگے کہ ''کتنے کھلے اور صاف احکام ہیں فرمایا ہے کہ جب لڑائی چھیڑ دیں، معاہدہ توڑ دیں اور خود ابتدا کریں تو مار وان کو جہاں وہ نظر آئیں اور اگر موقع ہو اور ضرورت محسوس ہو تو ان کو مکہ سے بھی نکال دو جہاں سے تم کو انھوں نے نکالا اور اب بھی نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ فتنہ قتل سے بری چیز ہے، اگر چند آدمیوں کو قتل کر دیا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن ''فتنہ'' کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قتل ہو جانے کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اگر وہ فتنہ برپا کریں اور اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے چند

---

[1] ترجمہ : اور مار ڈالوان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دوان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ لڑوان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو، یہی ہے سزا کافروں کی پھر اگر وہ باز آئیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔(بالفاظ شیخ الہندؒ)

آدمیوں کو مسلمان قتل کردیں تو یہ عین رحمت ہے، پھر سرسید کی تفسیر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''بعض فتنے ایسے اُٹھے تھے کہ مسلمانوں کو''جارحانہ''اقدام کرنا پڑا۔اگروہ ایسا نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے بڑے بڑے فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے۔پھر''مسجدِ حرام''کے معنی بتاتے ہوئے فرمایا کہ کعبہ کی اطراف کی مسجد کو''مسجدِ حرام'' کہتے ہیں۔یہ حرمت والی مسجد بھی ہے اور یہاں بعض حلال اور جائز باتیں حرام بھی ہوجاتی ہیں مثلاً شکار کرنا اور عوام الناس کے بقول''جانوروں کے سید'' کبوتر تک کو مارنا جو وہاں بہت پایا جاتا ہے، گھاس اکھیڑنا وغیرہ۔اس کے بعد کہنے لگے۔پھر حکم ہے کہ مسجدِ حرام میں اپنے ہاتھ کو ابتدا سے روکو لیکن اگر وہ وہاں بھی لڑنے لگیں تو ان سے وہاں بھی لڑو اور کاٹ ڈالو کیوں کہ منکروں کی یہی سزا ہے، ہاں اگر کفار باز آجائیں اور لڑنا بند کردیں تو ان سے کہو کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔باری تعالیٰ کے ابرِ کرم سے سرسبز وادیاں اور خشک چٹانیں برابر برابر آبِ رحمت پاتی ہیں، چنانچہ ابوسفیانؓ، عکرمہؓ بن ابوجہل، ہندہؓ اور وحشی اسی حکم کے تحت معاف کئے گئے۔

تفسیر ختم ہوئی تو ایک صاحب نے مرحوم سے شیعہ سنی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی، آپ نے جواب دیا کہ میں واقعات وحقائق اور مختلف لوگوں کی رائیں بتا سکتا ہوں۔لیکن آپ یہاں اس مسجد میں میری ذاتی رائے دریافت نہیں کرسکتے۔یہاں مجھے بالکل غیر جانبدار رہنا پڑے گا۔اس کے بعد کہنے لگے کہ''شیعہ حضرات حضرت علیؓ کو افضل اور دیگر خلفاء کو غاصب کہتے ہیں۔حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ ہمیں کسی کو کسی پر فضیلت دینے کا حق نہیں ہے۔چنانچہ حدیثِ شریف میں صراحت سے فرمایا گیا ہے کہ''میرے صحابہؓ ستاروں کے مانند ہیں ان میں سے تم جس کی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے''۔رہا میرا ذاتی خیال تو میں تمام صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ سے زیادہ متاثر ہوں اور مجھے ان کی طرف خاص کشش ہے بلکہ ان کے نام ہی سے مجھ پر خاص اثر ہوتا ہے۔پھر بات کو مختصر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب جھگڑوں اور تو تو میں میں سے کیا فائدہ جب کہ جو ہونا تھا ہوگیا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ آج سب حاضرین کا نام پوچھیں گے اور ضروری تعارف کرائیں گے اس سے پہلے ایک دن انھوں نے فرمایا تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے، کسی دن آپس

میں تعارف کرائیں گے، لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث سارے حاضرین سے نام نہ پوچھ سکے۔صرف ایک شخص سے نام دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا ''تفسیر[1] علی'' نام بڑا معنی خیز تھا لیکن کچھ عجیب سا۔اس لئے اس پر ایک خفیف سا قہقہہ پڑا۔اور مرحوم نے بھی سنجیدگی سے تبسم فرمایا

ایک صاحب نے کہا ایسے بہت سے نام ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص کا نام محمد عبدالرب العالمین ہے۔مرحوم نے سنجیدگی کے ساتھ مسکرا کر کہا ''ایک عالمین بڑھا دیا گیا ہے، عبدالرب تو ہوا ہی کرتا ہے''۔اس کے بعد دوسروں کا نام پوچھے بغیر سلام علیکم کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔اس دن بارش کی وجہ سے مرحوم نے اپنا ہلکا جوتا مسجد کے اندر لا رکھا تھا۔جب باہر نکلنے لگے تو چپکے سے جوتا ہاتھ میں اُٹھایا اور باہر لے جا کر نیچے ڈال کر پہن لیا، میرے ایک دوست کا بیان ہے کہ ''میں جوتے کے بالکل قریب تھا لیکن اس پر میری نظر نہ پڑی جب انھوں نے جوتا اُٹھالیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ ہائے اتنا اچھا موقع کھودیا۔کاش! میں جوتا لے کر باہر رکھ دیتا۔تاہم میں نے فوراً ارادہ کرلیا کہ آئندہ کسی روز ضرور کوشش کر کے جوتا اُٹھانے کی سعادت حاصل کروں گا۔مگر آہ! یہ کسے خبر تھی کہ وہ موقع آخری اور بالکل آخری تھا، گھر کی طرف چلے گئے مگر بارہ پندرہ گھنٹوں کے اندر دُنیا ہی سے چلے گئے۔'' رحمة الله وطاب ثراه ''

(حوالہ : ایک ایمان افروز یادداشت از ابومنظور شیخ احمد ناشر مکتبہ فاروقیہ، حیدرآباد، آندھراپردیش)

---

[1] تفسیر علی ادھیڑ عمر کے ایک انتہائی غریب شخص تھے۔موز (کیلے) بیچا کرتے تھے، مسجد ننگے پیر آیا کرتے تھے، سب سے پہلے آتے اور نماز روزانہ جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے، درسِ تفسیر کے وقت نہایت ادب اور عقیدت سے بیٹھتے تھے اور غالباً تلنگی زبان میں کچھ نوٹ بھی کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی مرحوم سے کوئی سوال بھی کیا کرتے تھے۔میرے ایک محبّ صادق جناب صادق احمد صاحب بی-اے (حیدرآباد) کا بیان ہے کہ ''مرحوم کی وفات پر پندرہ بیس دن گذرے تھے۔میں کالج جارہا تھا جب رزیڈنسی روڈ سے میرا گذر ہوا تو میری نظر تفسیر علی پر پڑگئی، دیکھتا ہوں ایک لکڑی میں آگے پیچھے دو ٹوکریاں لٹکائے اوران میں کیلے رکھے ہوئے اپنی دھن میں کچھ آواز سے قرآن مجید کی بعض سورتیں پڑھتے اور ورد کرتے چلے جارہے تھے۔یہ دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا اور رقت طاری ہوگئی۔میں نے دل میں کہا کہ جس شخص نے مرحوم کی تفسیر سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا اور عمل کیا وہ یہی ہیں جواب ننگے پیر ہیں لیکن حلال کی روزی اللہ کی راہ میں کما کر کھاتے ہیں اور جب ہم شرکاءِ تفسیر قیامت کے دن ایک گروہ کی شکل میں گزریں گے تو ہماری صف میں آگے یہی تفسیر علی ہوں گے''۔

نواب صاحب کی قرآن سے رغبت نے وارفتگی کی منزلوں کو طے کر کے کیفیت و بیخودی کی لذتوں سے انھیں ہمکنار کر دیا تھا، اس خصوص میں ''نواب بہادر یار جنگ کا قرآنی ذوق'' کے زیرِ عنوان مولوی خواجہ حمید احمد صاحب کا مختصر مضمون بے حد دلچسپ اور جامع ہے۔

نواب مرحوم کے قرآنی ذوق سے متعلق کئی مضامین لکھے جا چکے ہیں، ذیل میں ایک خاص کیفیت کا تذکرہ مرحوم کے وابستگان کے ازدیارِ ذوق کے واسطے بیان کیا جاتا ہے۔

نمازِ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ مرحوم کی ڈیوڑھی پر ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، پروفیسر احمد حسین خاں لکچرار عربی، عبدالرحمٰن سعید، خواجہ حمید احمد وغیرہ جمع تھے۔ نواب مرحوم نے پروفیسر احمد حسین خاں سے خواہش کی کہ وہ نمازِ مغرب کی امامت کریں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے نماز پڑھائی پہلی رکعت میں پارہ ۲۰ کے تیسرے رکوع کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں جس میں موسیٰؑ کے مصر سے مدین کی طرف سفر کا ذکر ہے جو وہ کسی قبطی کو مار کر قصاص سے بچنے کے لئے کر رہے تھے، قرآن مجید میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے''**ولما توجه تلقاء مدين قال عسىٰ ربی ان يهدينی سواء السبيل** ''(اور جب موسیٰؑ نے مدین کا رُخ کیا تو دُعا کی کہ اے میرے پروردگار تو میری صحیح رہبری کر)

مدین پہنچ کر دیکھا کہ ایک کنویں پر دو بہنیں پانی بھرنا چاہتی ہیں، آپ نے پانی بھر دیا۔ پھر ایک ایک درخت کے نیچے آرام کرتے ہوئے یہ دُعا کی''**رب انی لما انزلت الی من خير فقير**''(اے میرے رب آپ جو خیر مجھے عطا کرنا چاہتے ہیں اس کا محتاج ہوں)

حضرت موسیٰؑ نے اپنی اس دُعا میں اپنی طرف سے کسی چیز کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ ان کے لئے جو پسند ہو عطا کیا جائے۔ اب اس دُعا کے بعد ان دونوں بہنوں کے والد حضرت شعیب نے حضرت موسیٰ کو اپنے پاس بلایا اور ان کا ماجرہ سن کر انھیں اپنے گھر میں نہ صرف پناہ دی بلکہ اپنی صاحبزادی سے ان کی شادی بھی فرمادی اور جب وہ مدین سے مصر واپس ہونے لگے تو راستے میں ان پر اللہ نے تجلی فرمائی اور نبوت سے سرفراز کیا۔

پروفیسر احمد حسین خاں صاحب نے نماز میں یہی تین آیتیں تلاوت فرمائی تھیں اور نماز ختم ہونے کے بعد نواب مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، فرمایا کہ پروفیسر صاحب نے نماز میں

جو آیتیں پڑھیں ان سے میرے سامنے مصر کا نقشہ کھنچ گیا اور یہ بھی کہ حضرت موسیٰ کی طرح آگ لینے گئے اور انھیں پیغمبری مل گئی۔ حضرت موسیٰ نے اس وقت جو دُعا کی تھی کہ اللہ جو خیر تو مجھے عطا کرنا چاہے میں اس کا محتاج ہوں۔ اس سے ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔

نواب صاحب سے یہ سن کر راقم الحروف نے عرض کیا۔ نواب صاحب نبوت تو ۸-۱۰ سال بعد ملی مگر فوری قبولیت کا نتیجہ یہ ہوا بیوی ملی اور پیغمبر کی گھر دامادی کا شرف حاصل ہوا۔ میری یہ توجیہہ سن کر نواب صاحب پھڑک گئے اور کہنے لگے ''واقعی معاملہ تو ایسا ہی ہوا مگر یہ تفسیر تم جیسے نوجوانوں کے ذہن میں آسکتی ہے، واقعی اگر کوئی نوجوان جس کی شادی نہیں ہو رہی ہے تو وظیفہ کے طور پر یہ دُعا کیا کرے تو اسے نیک بیوی ضرور مل جائے گی''۔

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ ہماری شادی نہیں ہوئی تھی اور اب اس عرصے میں ہمارے نواسے، نواسیوں اور پوتے پوتیوں کی شادیوں کے لئے یہی دُعا بہت کام آرہی ہے اور ہر ایسے موقعہ پر نواب مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کا ذوق قرآنی، آیاتِ قرآنی سے ہر موقعہ پر نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ (حوالہ : رہنمائے دکن حیدرآباد)

پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت محترمہ تزئین فریدی کی شادی کے موقعہ پر نواب صاحب کے دیئے ہوئے تحفے کا ذکر کرتی ہوئی وہ فرماتی ہیں ''مجھے شادی کے موقعہ پر ہزاروں تحفے ملے تھے مگر میرے لئے یہ یاد رکھنا بہت مشکل ہو گیا کہ کونسا تحفہ کس کا دیا ہوا ہے۔ البتہ مجھے صرف ایک شخص کا نام اور اس کا دیا ہوا تحفہ یاد ہے۔ وہ تحفہ ہے قرآن پاک اور تحفہ دینے والے نواب بہادر یار جنگ تھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے ایک خوبصورت اور بہ ترجمہ قرآن پاک یہ کہہ کر دیا تھا کہ ''یہ سب سے زیادہ قیمتی تحفہ ہے اسے جب بھی پڑھنا ترجمہ کے ساتھ پڑھنا'' ان کا یہ عظیم تحفہ اب بھی میرے پاس بڑی حفاظت سے ہے جب کہ اس تحفے کے ساتھ کے بیسوں دوسرے تحفے نہ جانے کہاں کھو گئے''۔ (حوالہ : اخبار مشرق کراچی ۲۶/جون ۱۹۶۸ء)

فرصت ملی بس اتنی کہ اس درس گاہ میں
اللہ کا کلام پڑھا کر چلا گیا

◆◆◆

درسِ اقبال

اقبال کے کام، کلام اور مقام تک رسائی کے لئے ایک تڑپتے ہوئے قلب اور نظر کلیمی کی ضرورت ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے جو والہانہ نسبت و تعلق نواب صاحب کو رہا۔ اس نسبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ فیض خاص، فیض عام ہو جائے اسی احساس کے تحت درسِ اقبال کا آغاز ہوا۔ مولوی عبدالرحمٰن سعید (سعید صدیقی) کنو ینر تھے۔ نواب صاحب کی ڈیوڑھی بیت الامت میں ہر جمعہ (عصر تا مغرب) درسِ اقبال کا اہتمام ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر غلام دستگیر رشید درس دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ان کی وفات کے دن تک جاری رہا۔ درسِ اقبال کا مقصد یہ تھا کہ شرکاء محفل درسِ اقبال گفتار کے اس غازی کے خواب کی تعبیر بنیں اور کردار کے غازی بن کر اس کی روح کو جنت الفردوس میں حقیقی سامانِ اطمینان مہیا کریں۔

(حوالہ : خط نمبر ۳۹۶ صفحہ ۴۱۰ قائدِ ملت- مکاتیب بہادر یار جنگ)

اس درسِ اقبال کی محفل کے تعلق سے اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

مبارک ہیں وہ لوگ جو اقبال کے کلام کو سمجھنے دوسروں کو سمجھانے اور اس کے پیام کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے یہاں ہر ہفتے (جمعہ کو) بالالتزام ایک اجتماع ہوتا ہے اور اس میں اقبال کا کلام سبقاً سبقاً پڑھا جاتا ہے اس میں ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین جیسے علماء اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اقبال نے خود اپنے الفاظ میں حجازی لئے کو اپنے ہندی نغمہ میں ایسا دلکش بنایا کہ کتاب اللہ جس کو اس کے ماننے والوں نے پس پشت ڈال دیا تھا آج پھر آنکھوں کا نور بن رہی ہے۔

(حوالہ : خط نمبر ۳۹۶ صفحہ ۴۱۰ مکاتیب بہادر یار جنگ)

حقائق اقبال کے کئی مقامات کی عملی شرح دراصل خود ان کی اپنی مجاہدانہ زندگی تھی، کلامِ

اقبالؔ کی کتنی ہی بلندیاں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر سمجھ میں آجاتی تھیں ۔ بقول اقبالؔ وہ ایسے امیر تھے جس کی دل نوازی ان کی حکمت کا سرمایہ تھی اور جن کی بے نوازی ان کی اخلاقی طاقت تھی ۔(حوالہ : بانگِ اذاں از پروفیسر غلام دستگیر رشید)

مرحوم خود اقبالؔ کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درسِ اقبالؔ کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبالؔ کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا''۔

(حوالہ : مولوی بہادر خاں مرحوم ایک عالم کی حیثیت سے، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی)

◆◆◆

درسِ تاریخ اسلام

درسِ اقبالؔ کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے طلبہ نے (جو قائدِ ملت کے حلقہ بگوش تھے) یہ محسوس کیا کہ نوجوانوں کو تاریخ اسلام سے واقف کروایا جائے، نواب صاحب نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا، مولوی ابوالخیر صدیقی (ایڈوکیٹ) اس کے کنویز مقرر ہوئے اور ہر پنجشنبہ کو بمقام بیت الامت بعد مغرب تاریخ اسلام پر نواب صاحب کی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ کیوں کہ قائدِ ملت کو اکثر دوروں پر جانا پڑتا تھا۔ میں خود بھی اس درس میں شریک رہا ہوں۔ تاریخ اسلام تو ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ بڑے دلچسپ لکچرز ہوا کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

(مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

بیت الامت کا ہال سامعین سے بھرا ہوتا، نواب صاحب کا تبحر علمی مسلم تھا۔ تاریخ اسلام پر جب گوہر افشانی فرماتے تو یہ سیل رواں و جوئے نغمہ خواں سحر خطابت مفہوم و منشاء کی ریشم کی ڈوری میں الفاظ کے موتی پروتی۔

نواب صاحب کی قومی مصروفیات اس سلسلے درس کے جاری رکھنے میں مانع ہوئی اور کچھ عرصہ بعد اس درس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

◆◆◆

اِتحاد بین المسلمین —— اِتحاد المسلمین

۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۴ء

جملہ فرقہ ہائے اسلامی میں باہمی اتفاق واتحاد پیدا کرنے اور ساتھ ہی وسیع تر بنیادوں پر اپنے فروعی اختلافات کو قائم رکھتے ہوئے اُصولِ اسلام پر متحد کرنے کی غرض سے جملہ فرقہ ہائے اسلامی کے پیشواؤں واکابرین کا اجلاس مشاورت ۱۲/ نومبر ۱۹۲۷ء کو توحید منزل چوک اسپاں میں مولوی حاجی فتح اللہ مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کے بانی مولوی محمد محمود نواز خاں صاحب تھے اس جلسے میں قائدِ ملت گروہ مہدویہ کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو کئے گئے تھے۔ نواب صاحب اپنی ڈائری میں اس اجلاس میں اپنی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''غلام محی الدین صاحب کے ساتھ مغلپورہ میں ایک انجمن کے جلسہ میں گیا جس کا نام اتحاد بین المسلمین رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام فرقہ ہائے اسلام کو فروعی اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ گیارہ بجے تک اس کے دستور العمل پر غور ہوتا رہا۔ میں گروہ مہدویہ سے ہونے کی وجہ سے شریک کیا گیا تھا۔ ۱۲ بجے واپس آیا''۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی ڈائری مرتبہ نذیر الدین احمد)

۱۲/ نومبر ۱۹۲۷ء کو مجلس اتحاد بین المسلمین کا اجلاس معہ ضروری وابتدائی قواعد و دستور العمل کی منظوری کے سلسلے میں منعقد ہوا۔ بعد ازاں کئی اجلاس منعقد ہوئے۔ ۱۸/ فبروری ۱۹۲۹ء کو اجلاس عام میں دستور العمل منظور ہوا پھر ۱۵/ مارچ ۱۹۲۹ء کو عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی جس میں نواب صاحب بھی بحیثیت رکن مجلس عاملہ شریک کئے گئے۔ اس طرح ابتدائی تشکیل مجلس سے نواب صاحب کی اس جماعت سے وابستگی رہی۔ اس انجمن کے اغراض ومقاصد حسبِ ذیل تھے :

ا) تمام فرقہ ہائے اسلامی کو مابہ الاشتراک اُمور میں بغرض تحفظِ اسلام اُصولِ اسلام کے ماتحت متحد و متفق کرنا۔

۲) مسلمانوں کے اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مقاصد کا تحفظ کرنا۔

۳) ملک و مالک سے وفاداری اور قانون مروجہ کا احترام کرنا۔

مجلس کے قیام کے پس منظر میں جو ذہن کام کررہے تھے ان کی دردمندی اور دوررس نگاہوں کے سامنے مستقبل کا حال، انھیں انقلاب کی تباہ کاریوں سے باخبر کررہا تھا اور اِدھر دکن کا مسلمان سایہ عاطفت ہمایونی کی افیم کی گولی سے مست اور وقت کے تقاضوں سے بے خبر تھا۔ فرصت کا دلچسپ مشغلہ مختلف بازیاں تھیں یا پھر فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کے مصداق تھا۔ اپنے بھائی کے خلاف تلوار میان سے نکالنا، کاٹنا اور کٹنا، جھوٹی شان اور غیر ضروری اور غیر شرعی رسومات پر پیسہ صرف کرنا، قرض کے بوجھ تلے، زندگی گذارنا، تعلیم صنعت و حرفت کے میدان میں ابنائے وقت سے کوسوں دوری۔ سرکاری ملازمت اور خانگی ملازمت کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھنا، اس حال میں دکن کا مسلمان مست تھا۔ امیر، امراء عیش و آرام اور 'ہوگی کوئی جنت میری جنت تو یہی ہے' کے تصور سے آباد، گھناؤنی زندگی کا شکار، اجداد کی جاگیر و منصب کی آمدنی کے باوجود (قرض میں گرفتار) زندگی کے دن گذارتے تھے۔ ایک ایسے وقت جب کہ ابنائے وطن ہندوستان سے انگریزوں کو ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے نعروں سے اپنے عزائم سے آگاہ کر چکے تھے اور جدوجہد آزادی ایک نیا موڑ اختیار کر چکی تھی۔ انگریز حاکم ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہو چکے تھے، سوراجیہ کا سورج طلوع ہونے کے لئے کچھ زیادہ عرصہ درکار نہ تھا اور سوراجیہ کے سورج طلوع ہوتے ہی ریاستوں کے اقتدار کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہونے کو تھا۔ پرستارانِ رب کعبہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ وقت کی پکار کو سنتے۔ اس موقعہ پر شاعر مشرق جگا رہے تھے

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

ایسے موقعہ پر مجلس کا قیام خوابیدہ مسلمانوں کو جگانے اور انھیں ہوش میں لانے اور ان میں آثارِ زندگی پیدا کرنے کا وسیلہ بنا۔

اتحاد بین المسلمین کچھ ہی عرصے میں اتحاد المسلمین کے نام سے موسوم ہوئی اور اس کی

پہلی رپورٹ جو ۱۵/ مارچ ۱۹۲۹ء سے ۲۷/ ستمبر ۱۹۳۱ء تک شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے اس مجلس کی سیاسی بصارت وبصیرت سے آگاہی پر اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں جس پس منظر اور عزم کے سہارے اس کام کا آغاز ہوا۔ وہی بنیاد اس مجلس کے استحکام کی ضمانت ثابت ہوئی۔

مجلس اتحاد المسلمین کی پہلی روئیداد جو ۸ صفحات پر شائع کی گئی، ایک دستاویزی حیثیت کی حامل چیز ہے جو درج ذیل ہے :

تمہید

دورِ حاضرہ میں بہی خواہانِ ملک وملت نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح وسوشل تنظیم کی غرض سے بہت سارے مجالس وانجمنیں قائم کیں اور کئے جارہے ہیں لیکن ہر انجمن اپنے اپنے مذہب و ملت کے افراد کی اغراض کی حد تک قائم ہے مگر شدید ضرورت اس کی بھی تھی کہ جملہ فرقہ ہائے اسلامی کے ممبرس ونمائندگان باہمی اتفاق واتحاد سے اسلامی پرچم کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے ایک اسٹیج پر نمودار ہوں اور اپنے فروعی اختلافات کو قائم رکھتے ہوئے بھی اُصولِ اسلام پر متحد ہوجائیں۔ چنانچہ ہمدردانِ ملت کئی مہینوں کی غور وفکر وتبادلہ خیالات کے بعد مجلس اتحاد المسلمین قائم ہوئی جس میں جملہ فرقہ ہائے اسلامی کے پیشوا وہادی ومعتمدین اتحاد عمل کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ واضح ہو کہ ابتدا میں مجلس ہذا کا انعقاد معہ ضروری وابتدائی قواعد ودستور العمل کے ۷/ دی ۱۳۳۷ف م ۱۲/ نومبر ۱۹۲۷ء کو ہوا اور اس کے بعد متعدد مجالس ہوکر مجلس ہذا کی باضابطہ تشکیل ہوئی اور بتاریخ ۱۷/ فبروری ۱۳۳۸ف م ۱۸/ فبروری ۱۹۲۹ء اجلاس عام میں دستور العمل مکمل ومنظور ہوا، جس کے بعد بتاریخ ۱۱/ اردی بہشت ۱۳۳۸ف حسبِ صراحت ذیل اراکین عاملہ وعہدہ دار منتخب ہوئے۔

اسماء اراکین عاملہ

۱) مولوی سید بندہ حسن الحسینی صاحب اثنا عشری
۲) مولوی محمد عبدالقدیر صاحب حنفی
۳) مولوی سید محمد پادشاہ حسینی صاحب حنبلی
۴) مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل حنفی
۵) مولوی حکیم محمد مقصود علی خاں صاحب حنفی
۶) مولوی محمد ابوالحمید صاحب آزاد احمدی

۷) نواب بہادر یار جنگ بہادر مہدوی ۸) مولوی عبدالرحیم صاحب اہل سنت والجماعۃ
۹) مولوی مطیع الرسول صاحب اہلحدیث ۱۰) مولوی سید محمد صابر حسینی صاحب حنفی
۱۱) مولوی سید مرتضیٰ صاحب مہدوی ۱۲) مولوی محمد عباس خاں صاحب مہدوی
۱۳) مولوی سید ہادی علیہ صاحب اثنا عشری ۱۴) مولوی سید زین العابدین صاحب اثنا عشری
۱۵) ڈاکٹر زاہد علی صاحب داؤدی ۱۶) مولوی محمد محمود نواز خاں معتمد اہل سنت والجماعۃ
۱۷) مولوی مرزا مظہر علی بیگ صاحب حنفی مددگار معتمد
۱۸) مولوی سید بشارت احمد صاحب احمدی مددگار معتمد

اس عرض مدت میں مجلس نے حسبِ ذیل کارروائیاں کیں :

۱) ۳۷ جلسہ ہائے عاملہ کئے گئے جن میں پانچ جلسے کمی نصاب کی وجہ سے ملتوی رہے۔ جلسہ ہائے عام چار، سالانہ جلسہ ایک جو بوجہ کمی نصاب ملتوی ہوکر دوبارہ کامیاب ہوا۔ اور وعظ کے دو جلسے کئے گئے۔

۲) سب سے اول جو تحریک کی گئی وہ تنظیم جماعت علماء کے متعلق حسبِ فقرہ (۱۱) دستور العمل تھی جس کے متعلق علماء شریکِ جلسہ نے وعدہ فرمالیا۔

۳) علماء کو توجہ دلائی گئی کہ حسبِ فقرہ (۸) دستور العمل اپنے اپنے گروہ میں طلبہ کے لئے تعلیم قرآن و علومِ مذہبی کا انتظام کیا جائے۔ جس کے جواب میں صرف مولوی سید بندہ حسن الحسینی صاحب کی طرف سے تعمیل کا اعلان کیا گیا۔

۴) اراکین مجلس کو توجہ دلائی گئی کہ حسبِ فقرہ (۷) دستور العمل جملہ فرقہ ہائے اسلامی ایک دوسرے کو ذریعہ تقریر یا تحریر سب وشتم کرنے اور دل آزار الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کریں۔ چنانچہ وعدہ کیا گیا اور......

بحمداللہ جملہ اراکین انتظامی نہ صرف خود اس پر عامل ہیں بلکہ عوام کو نصیحت کرنے میں دریغ نہیں کررہے ہیں۔

۵) حسبِ فقرہ (۹) دستور العمل توجہ دلائی گئی کہ شادی وغمی کے رسوم مذموم کی اصلاح کی جائے، چنانچہ مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل و مولوی سید محمد بادشاہ حسینی صاحب واعظ و

مولوی سید بندہ حسن الحسینی صاحب وغیرہ علماء نے اس میں بذریعہ وعظ وتقاریر کافی حصہ لیا۔

۶) اشاعتِ اغراض ومقاصد مجلس ہذا کے نسبت طے پایا کہ مختلف مقامات میں مواعظ وتقریر کرائی جائیں۔ چنانچہ مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب، مولانا لقا علی حیدری صاحب کے ذریعہ مفاد اتحاد پر بہ مقام مسجد چوک وڈیوڑھی نواب بہادر یار جنگ دو بہترین تقریریں کرائی گئیں چوں کہ ایسے مجالس کے اخراجات کثیرہ انجمن پر عائد ہونے لگے تھے جس کے لئے انجمن کی موجودہ سلک متحمل نہیں ہوسکتی تھی، مجبوراً اس سلسلہ کو چندے ملتوی کرنا پڑا۔

۷) بہم رسانی امداد قانونی دربارہ فساد ناندیڑ کی تحریک پر بعض اراکین نے کافی حصہ لیا اور ممکنہ امداد پہنچائی۔ اس بارہ میں جناب مولوی سید عسکری حسن صاحب بیرسٹر اور مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی وکیل ہائی کورٹ و جناب مولوی حافظ عبدالعلی صاحب ایڈوکیٹ و جناب مولوی عبدالرحیم صاحب ایل-ایل-بی قابل شکریہ ہیں۔

۸) ماہ اردی بہشت ۱۳۳۹ف ۱۹۳۰ء میں آریہ سماج کے سالانہ جلسہ میں جو اسلام پر سخت کلامی کی گئی اور رفع شکوک کی دعوت دی گئی تھی اس کے جواب کے لئے مولوی ابوالعطا اللہ دتا صاحب سے ۱۳۳۹ف ۱۹۳۰ء اور ۱۳۴۰ف ۱۹۳۱ء میں تین تین دن جوابی تقاریر کرائی گئیں۔

۹) مولوی سید محمد پادشاہ حسینی صاحب نے مولوی خواجہ حسن نظامی صاحب کا اعلان مندرجہ صحیفہ مؤرخہ ۳/ شوال ۱۳۴۷ھ پڑھ کر سنایا اور تحریک کی کہ ''پرچہ برطانیہ'' میں جو اشتعال انگیز مضمون اور مضحکہ خیز غلط تصاویر دیئے گئے ہیں اس پر اظہارِ نفرت اور غیظ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس نے بالاتفاق دلی نفرت کا اظہار کیا اور ذریعہ تار مولوی محمد یعقوب صاحب ڈپٹی پریسیڈینٹ اسمبلی کو اطلاع دی گئی اور مقامی اخبارات میں بھی شائع کرادیا گیا۔

۱۰) کارروائی ترمیم مسودہ قانون تعزیراتِ متعلقہ عقدِ بیوگان میں غور وخوض کیا جاکر علماء سے رائے حاصل کی گئی جس کے بعد نہ صرف تحریری جواب ادا کیا گیا بلکہ اجلاس سلکٹ کمیٹی مجلس مؤرخہ ۱۵/ اسفندار ۱۳۴۰ف م ۱۸/ جنوری ۱۹۳۱ء میں کثرت سے اجتماع کیا جاکر مولوی سید مناظر احسن صاحب گیلانی ومولوی مفتی عبداللطیف صاحب ومولوی سید شہاب الدین صاحب سے تقریریں کرائی گئیں۔ جس کا اثر بہترین مرتب ہوا۔

۱۱) آریہ سماج کا جلوس نگر کیرتن جس کو بتاریخ ۲۷/اردی بہشت ۱۳۴۰ف م یکم اپریل ۱۹۳۱ء شہر کے شوارع عام پر گشت لگانے کی اجازت مل چکی تھی اس کے درمیان کسی قسم کا فساد نہ ہونے کی روک تھام کی کارروائی کی گئی۔

۱۲) مقتولین کانپور کے لئے ۱۲/ خورداد ۱۳۴۰ف کو دُعا و ختم قرآن کا وسیع پیمانہ پر مکہ مسجد میں انتظام کیا گیا اور ذریعہ اخبارات، ممالکِ محروسہ کے رعایا کو بھی ختم کرنے کے لئے توجہ دلائی گئی۔ اور ۱۸/ خورداد م ۱۷/ اپریل ۱۹۳۱ء کو مولانا حسرت موہانی صاحب کی خدمت میں ہمدردی کا تار روانہ کیا گیا۔

۱۳) تعلیم دینیات کو چوں کہ سررشتہ تعلیمات نے امتحان کے لزوم سے مستثنیٰ کر دیا تھا اس لئے دینیات کو امتحان میں حسبِ سابق لازم کرنے کے لئے حکامِ تعلیمات کو توجہ دلائی گئی۔ اس بارہ میں مولوی سید بادشاہ حسینی صاحب نے کافی ووافی حصہ لیا اور الحمدللہ اس میں حسبِ تحریک کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۴) فوائد اتحاد پر بہ عنوان ''اتحاد المسلمین'' پانچ ہزار رسالے طبع وشائع کئے گئے۔

۱۵) آکولہ کانفرنس کے خلاف کانفرنس محبوب نگر سے اتفاق کا اعلان کیا گیا۔

۱۶) رقمی آمدنی چندہ سے (   ) عطیہ سے (   ) جملہ (   ) ہوئی۔

خرچ (   ) کا سلک آخر تاریخ (   ) رہی۔

آخر میں اراکین مجلس عاملہ اور بعض ممبران کا جنھوں نے میری کافی مدد فرمائی، بدل شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فقط

عرض کنندہ

محمد محمود نواز خاں

معتمدِ مجلس

۱۹۳۱ء کے بعد روئیدادیں امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ البتہ پمفلٹ جو اس دور میں شائع کئے گئے تھے ان کی مدد سے بھی حصولِ مواد میں مدد ملتی ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے قیام کے ۵ برس بعد ۹/ ڈسمبر ۱۹۳۲ء کو شری وامن نائک کی صدارت میں ہندو مہا سبھا کا ایک جلسہ حیدرآباد

میں منعقد کیا گیا اور اس خصوص میں ۳ پمفلٹ کی تقسیم عمل میں آئی ۔ اس جلسے میں پہلی بار ہندو مہاسبھا کے خیالات سے اور ان کے ناپاک عزائم سے دکن کے مسلمانوں کے کان آشنا ہوئے ۔ اس طرح امن سوز اغراض کی اشاعت اور ملک کی پرامن فضا کو مسموم کرنے کی سعی کا آغاز کر دیا گیا مجلس اتحاد المسلمین نے ہندو مہاسبھا کے جلسے میں منظورہ ریز رویشن اور تین پمفلٹوں کی اشاعت کی نسبت اپنی یادداشت میں جو حکومت کو دی گئی تحریر کیا تھا کہ :

''مجلس اتحاد المسلمین سرکارِ عالی ۱۹/ ڈسمبر ۳۲ء والے ہندو مہاسبھا کے زیر ہدایت منعقدہ جلسہ کے ریزولیوشن اور جلسہ مذکور کے صدر وامن نائک صاحب کی تقریر اور تائید میں تین پمفلٹوں کی اشاعت کی نسبت سخت اظہارِ افسوس و ناپسندیدگی کرتی ہے کہ اس کے ذریعے سراسر غلط واقعات کا اظہار کر کے ملک سرکارِ عالی کے صدہا سالہ ہندو مسلم اتحاد کو مٹانے اور اس طرح ملک کے امن وامان کو بدامنی سے تبدیل کرنے کے لئے قدم اُٹھایا گیا ہے۔ پس انسداد اسباب بدامنی کی خاطر مجلس اتحاد المسلمین ملک سرکارِ عالی ریزولیوشن ہائے مذکورہ کے متعلق حسبِ ذیل انکشاف حقیقت کرنے پر مجبور ہے''۔

یہ ریزولیوشن برطانوی ہند کی تقلید میں (جہاں کہ محکوم ہندو و مسلمان ایک تیسری فاتح و حکمراں قوت سے اکثریت واقلیت کے دلائل پر دست و گریباں ہیں) اس نیت سے مرتب کیا گیا ہے کہ حیدرآباد کی خود حکمراں ریاست میں بھی جہاں کی حکومت نے خود اپنی محکوم رعایا کو ہر طرح سے امن و آزادی دے رکھی ہے ۔ امن سوز اغراض کی اشاعت سے ملک کی پرامن فضاء کو مسموم کر دے ۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہاں زراعت، تجارت، گتہ داریاں، لین دین، سمستان ڈیسمکھی دیشپانڈیہ گری، دیہی عہدہ داریاں وغیرہ سب ہندوؤں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مواضع کی بہترین اراضیات سے وہی متمتع ہوتے ہیں ۔ ایسے تقریباً ترسٹھ ہزار ملازمانِ دیہی کے ساتھ سرکار کی مہربانی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ سرکاری رقم تغلب بھی کر لیں یا کسی اور فوجداری جرم میں سزایاب بھی ہو جائیں تو سرکار ان کی توریث کو برقرار رکھتی اور ان کے فوت ہونے پر ان کے وارث کو ان کی معاش و خدمت دے کر ایسے خاطی کے خاندانی حقوق کی حفاظت کرتی رہتی ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ملازمین دیہی کو اپنے زیر اثر رعایا و کاشتکاران سے سودی

لین دین کرنے اور اپنے حلقہ اثر میں ان کو ہر طرح کی بیع وشریٰ کی اجازت ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس جب رعایا محاصل سرکاری داخل کرتی ہے تو یہ اس میں سے پہلے اپنے قرضہ کی رقم معہ سود مجرا لے کر سرکاری پن کو بقایا میں ڈال دیتے ہیں گویا سرکار خود نقصان میں رہ کر اس طبقہ کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوؤں کے ساتھ سرکار کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہندو معاشدار لاولد فوت ہونے کے باوجود سرکار اپنی عطیہ معاشوں کو (جن کو وہ ایسی صورت میں داخل سرکار کر لینے کی بالکل مجاز ہے) محض تنبیت کے ضمن میں ایک راستہ چلنے والے شخص پر بھی بحال کر دیتی ہے۔

لاکھوں روپیوں کا نقد رسوم اور لاکھوں روپیوں کی معاش ڈیسمکھی و دیشپانڈیہ گری جو محض موقتی و مقامی خدمات کی ادائی کا معاوضہ تھا باوجود اب ان خدمات کے باقی نہ رہنے اور ان فرائض کو سرکار دوسرے ذرائع سے بمصارف مزید انجام دلانے کے وہ تمام معاشہائے معاوضہ ہر وراثت پر بغیر کسی وضعات و کمی کے بدستور ان پر بحال رکھے جاتے ہیں۔ یہی وہ مراعات ہیں کہ ہندوؤں کی معاشیں دوسو سال کی حکمرانی آصفیہ کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم و برقرار ہیں جس کے باعث ہندوؤں کا تمول کبھی زوال پذیر نہیں ہوا اس کے برعکس مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ :

۱) لاولد فوت شدہ مسلمانوں کی صدہا معاشیں داخل سرکار ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں چنانچہ آج تک تخمیناً ۴۵ فیصدی خالصہ ہو چکی ہیں۔

۲) اگر کسی وارث اناث پر جزاً بحال بھی ہوتا تو تاحیات کی قید لگ جاتی ہے۔

۳) وہ تمام منصب جوان کے خون بہانے اور جاں نثاری کرنے کے صلہ میں عطا ہوئے تھے ان میں سے ہر وراثت پر وضعات کا عمل نافذ ہے جس کے باعث صدہا منصب معدوم ہو کر اس وقت تک سیکڑوں خاندان معرض تباہی میں آچکے ہیں۔

۴) مسلمانوں کو جو معاشیں مقامی اور موقتی خدمات کے لئے مثل سمتاں و ڈیسمکھی و دیشپانڈیہ وغیرہ عطا ہوئے تھے مثلاً مدافعانہ فوج وحفاظت قلعہ جات وغیرہ وہ سب محض اس بناء پر کہ اب محل شرط باقی نہیں رہا ہے۔ شریکِ خالصہ کر لئے گئے اور کر لئے جاتے ہیں۔ بحالیکہ اسی عنوان کی معاشیں محل شرط باقی نہ رہنے پر بھی ہندوؤں پر بحال واجراء کئے جاتے ہیں۔

۵) زراعت کرنا چاہیں تو عہدہ داران دیہی جو تمام تر ہندو ہیں وہاں بمشکل دخل پانے کا موقع دیتے ہیں۔

٦) تجارت کے لئے روپئے کی ضرورت ہے مگر یہ خود ہی ہندوؤں کے مقروض ہیں۔

اب ان کی معیشت وزندگی بسر کرنے کا اہم اور واحد ذریعہ صرف ملازمت رہ گیا ہے جس میں کثیر کنبے بغیر کسی آسائش کے محض زندگی کے دن گذارتے ہیں اور پھر ملازمتوں کا دائرہ بھی محدود ہے، بریں ہم قدیم سے یہ عمل رہا ہے کہ اس میں بھی ہندوؤں کو معقول تعداد میں حکومت داخل کرتی رہتی ہے جس سے مسلمانوں کی حق تلفی ہوکر دن بہ دن وہ مفلس وخستہ حال ہوتے جارہے ہیں۔

اس موقعہ پر مہا سبھا کی مبینہ فیصد (۸۵) کی تعداد بھی حقیقتاً ایک دھوکہ ہے اور اس دھوکہ کی حقیقت ان کے ان مسلمہ طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ جو ہر ایک فائدہ حاصل کرنے کے موقع پر مہا سبھائی ہندوان اقوام کو اپنے میں شامل کر لیتے ہیں جن کا سایہ بھی ان کو ناپاک کر دیتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا اعلان خود قوم مذکور بہ بانگ دہل کر چکی ہے۔

چنانچہ ابھی نیچ قوموں کی آل انڈیا دی پرسڈوا یک ورڈ (یہ جماعت ہندوؤں سے الگ ہی ہے) اس کے علاوہ خود ریاست حیدرآباد کے اچھوت اقوام کے پندرہ لیڈروں نے اپنے دستخط سے اعلیٰ حصرت کے حضور میں درخواست بھیج کر (ہندو مہا سبھا کے مذکورہ بالا جلسہ اور اس کے ریزولیوشن کے خلاف سختی سے احتجاج بلند کیا ہے اور اپنے حقیقی خدماتِ وفاداری کے مدِنظر کھلے طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ :

ایسی شکایات کو اس وقت پیش کرنا غیر وفاداری اور ناشکر گذاری کا فعل ہے اور اس سے سرکارِ عالی کے عہدہ داروں کے خلاف غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس کے ساتھ ہی مہا سبھا کے (۸۵) فیصدی والی استدلال کی نسبت یہ لکھا ہے :

”(۸۵) فیصدی کا جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ غلط ہے بلکہ اچھوت خانہ بدوش و دیگر اقوام نکل جانے کے بعد خالص اعلیٰ طبقہ کے ہندو صرف فیصد (۲۵) رہ جاتے ہیں ——— مذکورہ بالا حقیقتِ حال کی روشنی میں ہندو مہا سبھائیوں کا مزید عہدے دینے کا مطالبہ اس طرح بے حقیقت

ہو کر رہ جاتا ہے کہ ایک نظر غلط انداز کا بھی مستحق نہیں ٹھہرتا، پس یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس قدر خدمات وعہدے اس مدعی خدمات طبقے کو دیئے ہیں وہ بلحاظ ان کے تناسب کے بہت زیادہ ہیں۔

حالاں کہ یہ کلیہ بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شعبۂ حکمرانی حکومت کا ایک انتظامی صیغہ ہے جس میں کہ ہر حکمراں قوم کا کاروبار سلطنت انجام دلانے میں زیادہ تر اپنے ہم قوم افراد پر بھروسہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہے اور اس کے ساتھ اپنے محکوم اقوام کو بھی ان کے معیار وفاداری ولیاقت کے مدِنظر تا بحد مناسب انتظام سلطنت میں شامل کر لیتی ہے اور یہی ہر ایک متمدن گورنمنٹ کا معمول ہے۔ اس لائن میں کسی اور کو محض تناسب آبادی کی بناء پر مطالبہ کا استحقاق نہیں پہنچ سکتا۔

بریں ہم یہاں کی اسلامی حکومت ہی ایک ایسی حکومت ہے کہ متمدن حکومتوں کے عمل کے برخلاف حدِ مناسب سے گذر کر تناسب آبادی سے بھی زیادہ خدمات وعہدے محکوم قوم کو دیا کرتی ہے جس کے بالمقابل مسلمان رعایائے ملک سرکارِ عالی شدت کے ساتھ مہاسبھا سے یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ کسی اور ریاست میں مسلمان رعایا کے ساتھ ایسی پرورشی وسلوک کی نظیر پیش کرے۔ جہاں کہ ابھی پیسہ اخبار مؤرخہ ۲۵/فبروری ۳۲ء سے افسوس ناک حقیقت کا اظہار ہوا ہے کہ :

ریاست بیکانیر کی بیس فیصدی وفادار و جاں نثار مسلمانوں کی آبادی کو اعلیٰ چھوڑ ادنیٰ ملازمتوں میں بھی کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔ مہاراجہ صاحب کے ذاتی اسٹاف شاہی خاندان کابینہ وزارت اور سکریٹریوں میں ایک بھی مسلمان ملازم نہیں اور تمام عدالتوں اور ہائی کورٹوں سے لے کر محکمہ جات آبپاشی، جنگلات، تعلیمات، جیل، پبلک ورکس، برقیات، معدنیات، فینانس، امداد باہمی وغیرہ۔ غرض کہ جس قدر بھی محکمے ریاست میں نظر آتے ہیں کسی میں بھی کوئی مسلمان دکھائی نہیں دیتا، صرف تحصیلداروں میں (۲) مسلمان تحصیلدار ہیں، جن کو پچاس پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔

حالاتِ بالا کے مدِنظر مجلس ہذا مسلمانانِ رعایا ملک سرکارِ عالی کو ان کے جائز مفاد سے

محروم کرنے والے مہا سبھائی پروپگنڈہ کو بہ نظر حقارت دیکھتی اور سرکارِ عالی سے عرض کرتی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ ایسی رواداری سے احتراز فرمائیں کہ جس سے مسلمانوں کے جائز مفاد کو نقصان پہنچ کر وہ تباہ ہو جائیں۔

اس موقعہ پر مجلس ہذا مسلمان رعایا ملک سرکارِ عالی کے اس اضطراب و تردّد سے بھی سرکار کو آگاہ کرنا اپنا وفادارانہ فریضہ خیال کرتی ہے جو اس تصور سے پیدا ہو رہا ہے کہ مہا سبھائی پروپگنڈے سے حکومت متاثر ہو رہی ہے جس کے خط و خال سررشتہ مال کے اس تازہ عمل سے نمایاں ہیں کہ (۹) جائیداد ہائے تقرر طلب میں سے پانچ مسلموں کو دے کر صرف چار مسلمانوں کو دی گئی ہیں۔ بحالیکہ بلحاظ قابلیت منتخب اُمیدواروں میں مسلمانوں کی تعداد (۸۰) تھی اور غیر مسلموں کی (۳۵)۔

اس طرح کی تقسیم اور اس طرح کے لزوم کو مسلمان رعایائے ملک سرکارِ عالی کے خاص حالات اور قدیم روایات کے نہ صرف برخلاف سمجھتی ہے بلکہ اس تصور سے بے چینی محسوس کر رہی ہے کہ یہ طریقۂ عمل مسلمانوں کے رہے سہے ذریعے معیشت کو بتدریج انحطاط پذیر کر کے بالآخر ان کو افلاس کے تحت الثریٰ تک پہنچا دے گا۔

اب مجلس کے قدم وقت کی پکار کی طرف بڑھے۔ مسلمان دانشور عمائدین قوم مختلف مسائل پر سر جوڑ کر تدابیر سوچتے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انھیں آمادہ عمل کرنے، ان کے حقوق کی حفاظت اور اغیار کی ریشہ دوانیوں کا جواب، ان اہم مسائل میں لگے رہے۔ ابتدا میں مجلس میں صدارت کا عہدہ نہ تھا۔ ہر اجلاس میں ارکان میں سے کسی کو صدر بنایا جاتا اور کارروائی چلتی۔ ۱۹۳۷ء تک مجلس اتحاد المسلمین کے بانی مولوی محمود نواز خاں صاحب معتمدی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۳۷ء کا زمانہ تاریخ حیدر آباد کی سیاسی تاریخ کا تمہیدی دور رہا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کا جو نصف صدی کی سیاسی تحریکوں کا ثمر تھے ان سیاسی خوابوں کی تعبیر، جاگتی آنکھوں کے سامنے تھی۔

دستور ہند ۱۹۳۵ء کے دو جز ۱) ایک صوبہ داری خود مختاری جو نافذ ہو چکی تھی ۲) دوسرے

وفاق جس کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ اکثریت کو حکمرانی کا حق تسلیم کیا جا چکا تھا۔

''وفاق کی ہیئتِ ترکیبی اس طور پر رکھی تھی کہ ہندوستانی ریاستیں اور صوبہ جات نیم خودمختار حکومتوں کی طرح رہیں اور مشترک اُمور کی نگرانی کے لئے ان ہی کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفاقی ایوان بنایا جائے۔ ریاستیں اس صورتِ حال سے پریشان تھیں۔ وفاق میں ریاستوں کی شرکت کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے بعض اہم ترین ابوابِ آمدنی اور ان سب سے زیادہ اقتدارِ حکومت کے بہت بڑے حصے سے محروم ہو جائیں۔ سکہ ڈاک، ذرائع مواصلات، دفاع کڑوڑ گیری چنگی اور اسی طرح کے بہت سے اہم ابواب وفاقی ابواب میں شامل تھے''۔

(حوالہ : ۴۶، ۴۷ تاریخ اتحاد المسلمین دار اشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن)

۲۲/ ستمبر ۱۹۳۷ء کو سر اکبر حیدری صدر اعظم باب حکومت نے مجلس وضع قوانین میں یہ اعلان کر دیا کہ حکومت آئین حکمرانی میں تبدیلی کا ارادہ کر لیا ہے۔

یہ اعلان مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کی شروعات کا اعلان نامہ تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین جو مسلمانان دکن کی واحد نمائندہ جماعت تھی اس پس منظر میں سیاسی نقطۂ نگاہ کے زادے نظر کو اپنانے پر مجبور ہوئی۔ ۱۴/ فبروی ۱۹۳۸ء کو علامہ مولانا عبدالقدیر صدیقی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں مجلس اتحاد المسلمین کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں جدید دستور کی منظوری عمل میں آئی۔ اغراض و مقاصد کے ضمن میں مسلک سیاسی سے متعلق ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا کہ :

''مسلمانانِ مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اسی بناء پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدارِ شاہانہ کی بقاء و احترام مقدم رہے''۔

◆◆◆

راہِ انقلاب ـــــــ مجلس کی نشاۃ ثانیہ

۱۹۳۸ء

''اب مجلس اتحادالمسلمین کی معتمدی پر ابوالبیان خواجہ بہاؤ الدین اور شریک معتمد کی حیثیت سے نواب بہادر یار جنگ کا انتخاب عمل میں آیا۔ مجلس اتحادالمسلمین کی نشاۃ ثانیہ ایک ایسی ہستی (نواب بہادر یار جنگ) کی رہین منت ہے جس نے اپنے جوشِ عمل اور تنویر یقیں سے اپنے مسلک اور نصب العین کو استوار کر کے قومی و سیاسی زندگی کی ایسی راہِ عمل متعین کر دی جو سیاسی تقاضوں کا ساتھ دے سکے اور ملی و سیاسی زندگی کو جس سے فروغ حاصل ہو۔

چنانچہ اس نازک موقعہ پر امرائے دکن کے ممتاز طبقہ سے ایک دردمند انسان نواب بہادر یار جنگ بہادر **ایدہ اللہ و نصرہ** کو خدا نے اسلام کے مخلص سپاہی اور خدمت گذار کی حیثیت سے کھڑا کر دیا جن کے پہلو میں ملت کا درد اور جن کے جسم کی ایک ایک رگ میں خون کی بجائے اخلاص و محبت کی آتش سیال گردش کر رہی ہے اس مردِ مجاہد نے اپنے چند مخلص معاونوں کے ساتھ اتحادالمسلمین کے قدیم ادارے کی تجدید کی اور اس کے پلاٹ فارم سے ''**اعتصام بحبل اللہ**'' کا پیغام سنایا جو مسلمانوں کی ہر جہتی فلاح کا واحد ذریعہ ہے۔

آغاز عمل کے ابتدائی دنوں میں اس کی مساعی باہمی رشتہ اُخوت و مودت کو مستحکم کرنے میں مرکوز رہیں۔ اتحادالمسلمین کا ٹھٹھرا ہوا پودا نشو و نما کے آثار دکھانے لگا۔ توفیر رکنیت کے کام میں بڑی سرگرمی رہی۔ محلّہ واری تنظیم کے لئے مسلمانوں کے آگے ایک مختصر سا لائحہ عمل رکھا گیا جس کو نوجوانوں کی جسمانی اور ذہنی قویٰ کی تربیت کا ایک عملی ہدایت نامہ کہا جا سکتا ہے شہر اور اضلاع میں اس لائحہ عمل کے تحت تنظیم کا کام برابر ترقی پذیر رہا''۔

(حوالہ : مجلس کی سہ سالہ جدوجہد کے نام سے ایک پمفلٹ ابوسعید محمد اسحاق علی خاں بی-اے-ایل-ایل-بی شائع ہوا تھا۔ مصنف کا یہ نام فرضی تھا۔ دراصل اس پمفلٹ کو مولوی عبدالرحمٰن سعید نے قلمبند فرمایا تھا صفحہ ۳)

''حیدرآباد کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری نواب بہادر یار جنگ کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے انجمن اتحادالمسلمین کو مسلمانانِ حیدرآباد کا سیاسی مرکز بنادیا۔ان کی دیانت اورخلوص ہر شئے سے بالاتر تھے اوراپنے پرائے سب اس کے معترف تھے،مجلس اتحادالمسلمین کوایک فعال اور مؤثر ادارہ بنانے اور مسلمانانِ دکن میں سیاسی بیداری اوراعلیٰ تنظیم پیدا کرنے کا کام خود انھوں نے انجام دیا تھا۔ وہ اہم فیصلے کرنے اوراپنی جماعت سے انھیں منوانے کی پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتے تھے''۔(حوالہ : ''مخلص انسان'' ازمیر لائق علی صفحہ۲۶۱اور۲۶۴ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظرمیں ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

مولوی خواجہ بہاءٗالدین صاحب نے اپنی تجارتی مصروفیات کی پرواکئے بغیرشب وروز نواب صاحب کے ساتھ موسم کی پرواکئے بغیر دشوارگذار اضلاعی راستوں پر مسلسل دورے کئے۔ ہرقسم کی صعوبتیں برداشت کی گئیں،دلوں میں جذبہ اسلامی دیہاتیوں میں شعور سیاسی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔مولوی خواجہ بہاءٗالدین نے مجلس کوحیاتِ نوعطا کرنے والے قائدنواب بہادر یار جنگ کی خدمت سے اتنے مؤثر تھے کہ بےاختیار ان کے قلم سے نکلا۔

بہادر یار جنگ کی عملی زندگی نے خوابیدہ روحوں کو بیداراور راحت پسند دماغوں کو چونکادیا ہے۔وہ بہادر یار جنگ جس کے لئے پھولوں کی سیج ہروقت میسر ہے۔آج اسلام کی خدمت کے لئے کانٹوں کے بستر پرلوٹنے کے لئے ہردم تیار ہے۔(''آفتابِ دکن'' حمیدالدین شیدا صفحہ۴۱)

''اضلاع میں شاخوں کے قیام اورارکانِ تعداد میں توفیر کی جانب توجہ فرمائی اور نتیجتاً مجلس کومقبولِ عام اورنمائندہ ادارہ بنانے میں بڑی حدتک کامیابی حاصل کی ــــــــ مجلس اتحادالمسلمین کی نشاۃ ثانیہ کا سال اول جمہور مسلمین میں احساس وشعور پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوا۔مقامی صوبہ داری قصباتی اورضلعواری شاخوں کے قیام میں مسلمانوں نے عام طور پر دلچسپی کا اظہار کیا اور عملاً مسلمانوں کے لئے مجلس کے قیام و بقاء کی ضرورت کا ہر جانب سے اعتراف کیا گیا،اس ابتدائی کوشش نےتعمیری مقاصد کی پیش رفت کے لئے زمین ہموار کردی اور غفلت وجمود کی جویاس انگیز حالت مسلمانوں پرطاری تھی دورہونے لگی،یقیناً مجلس کا یہ عظیم الشان کارنامہ بلکہ اعجاز ہے کہ اس نے ایک ہی سال کے اندراس مقصدِ عظیم کوحاصل کرلیا جوقوموں کے

ارتقاء کی شرطِ اول ہے‘‘۔(حوالہ : مجلس کی سہ سالہ خدمات ازمولوی عبدالرحمٰن سعید)

دوسرا سال

اب مجلس اتحادالمسلمین سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے سرکاری وغیرسرکاری حلقوں میں اپنا وقار قائم کرچکی تھی اوراس کی ہردل عزیزی میں روز افزوں ہونے لگی۔

۲۵/ نومبر ۳۸ء کو بیت الامت بیگم بازار میں مملکتی مجلس اتحادالمسلمین کا جلسہ عام مولوی ابوالحسن سیدعلی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔صرف ایک اخباری اطلاع پر جلسہ میں فرزندانِ توحید کا اجتماع ہوا جو ناموسِ شریعت اور امانتِ توحید کی صیانت کے لئے سروشانہ جذبات کے ساتھ جمع تھے۔ بیت الامت کی وسعت مسلمانوں کے عظیم الشان مجمع کے لئے ناکافی تھی، سالانہ جلسہ کے دونوں اجلاس میں مسلمانوں نے مسائل حاضرہ پر کامل تدبر وسنجیدگی کے ساتھ بحث کی اورایک تعمیری نظام نامہ مرتب کیا۔آئندہ سال کے لئے ہر طبقہ کی نمائندگی کا لحاظ کرتے ہوئے کابینہ ترتیب دی گئی، جلسہ سالانہ کے صدر مولوی ابوالحسن سید علی صاحب معتمد منتخب کئے گئے۔اس وقت تک حکومت نے مجلس کو فرقہ وارانہ ادارہ قرار دے کر ملازمین سرکار کو شرکت سے منع کردیا تھا۔حکومت کا ہر مسلمان ملازم مجلس اتحادالمسلمین کو اپنے لئے شجر ممنوعہ متصور کرنے لگا۔ ملک کے افراد نے حکومت کے نزدیک اپنے امتیاز، اثر ورسوخ کو برقرار رکھنے کے لئے مجلس سے کامل علاحدگی اختیار کرلی۔توقع تھی کہ جدید کابینہ سال بھر دل جمعی کے ساتھ مسلمانوں کے تعمیری اُمور کی تکمیل میں مصروف رہے گی لیکن ملک کے حالات نے مجلس کو سیاسیات کی وادی پرخار میں قدم رکھنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ سال بھر کی عرض مدت میں نفاذ اصلاحات کے سلسلہ میں مجلس کو سیاسی میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہونا پڑا۔دانشمند سپاہیوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنے صاحبِ تدبیر سپہ سالار نواب بہادر یار جنگ بہادر کی قیادت میں انتہائی خلوص کے ساتھ استقلال وپامردی کا ثبوت دیا اور بڑے سے بڑے ایثار کے لئے بھی دریغ نہ کیا۔سالار عسکر کو بلاشبہ بیک وقت کئی محاذ سے سابقہ تھا، ایک طرف ناداں دوست اور دانا دُشمن صف آرا تھے، دوسری طرف مسلح حریف اور دوست نما دُشمن کے معاندانہ حربوں کا مقابلہ تھا، تیسری طرف حکومت کے آگے جو بہرحال اسلامی

حکومت ہے روایاتی اطاعت کے ساتھ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ پیش کرنا تھا، چوتھی جانب اپنی جماعت کے نزدیک صیانت حقوق اور اس کی جوابدہی کا بار گراں شانوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ ابتلاء اور آزمائش کی ایک کٹھن منزل تھی جہاں ملتِ اسلامیہ دکن کے نہتے لشکر کا نہتہ سالار ایمان راسخ اور عمل مسلسل کے حصن حصین میں بیٹھ کر یکہ وتنہا مقابلہ کر رہا تھا، غالباً ایسے ہی نبرد آزماؤں کے لئے خدا کی نصرت آسمان کی بلندیوں سے نازل ہوتی ہے چنانچہ خدائے مسبب نے اس دردمند کی مخلصانہ سرگرمیوں کا صلہ عطا فرمایا۔ "شکر نعمت ہائے او چنداں کہ نعمت ہائے او"

(حوالہ : مجلس کی سہ سالانہ خدمات از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

"فساد دھول پیٹ کے جراثیم ابھی مرے نہیں تھے، واردھا اور شولا پور کی ہواؤں نے عالمگیر و آصف جاہ اول کی امانت کو چھین لینے کے لئے یوگ و دیا اور دھرم کا پورا زور لگایا"۔

(حوالہ : ہمارا قائد از مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۳۴)

"مملکتِ آصفیہ کے حدود میں آریہ سماجی جماعت کو آلہ کار بنا کر "مذہبی آزادی" کے پردے میں سیاسی اقتدار کے حصول کا راگ الاپا جانے لگا اور ایک کھلے حریف مقابل کی طرح مذہب و سیاست کے دو دھاری حربہ سے اسلامی ریاست کے عدیم النظیر روادارانہ خصوصیات کو مجروح کرنا شروع کر دیا۔ برطانوی ہند کے طول و عرض میں غلط پروپگنڈا کے ذریعے زہر اگلا گیا کہ "نظام کی اسلامی حکومت میں ہندو دھرم کو آزادی نصیب نہیں ہے۔ ہندو جاتی کو شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے"۔ ان بے سروپا الزامات کی اس کثرت کے ساتھ تشہیر و اشاعت کی گئی کہ برطانوی ہند کے مسلم اور غیر مسلم سنجیدہ اکابر بھی آصفی مظالم کے ان مفروضہ افسانوں کو سن کر انگشت بدنداں رہ گئے"۔ (حوالہ : مجلس کی سہ سالہ خدمات از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

ستیاہ گرہ اور پروپگنڈہ کی یہ مہم آریہ سماج کے کندھے پر بندوق رکھ کر کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے کامل اشتراک اور منصوبہ بند طریقے پر شروع کی گئی۔ اس طرح حریف مخالف کی حیثیت سے متذکرہ بالا جماعتوں کے علاوہ ہندو سول سبرنز یونین، اسٹیٹ کانگریس اور ڈیفنس لیگ اور ساری ایسی جماعتیں جو ریاست حیدر آباد کو صفِ ہستی سے مٹانے کا عزم کر چکی ہیں، متحد ہو کر ۱۹۳۸ء میں باضابطہ مذہبی اور سیاسی محاذ پر صف آرا ہو گئیں۔ ان جماعتوں کے پاس روپئے،

ہتھیار اور وسائل تشہیر کی کوئی کمی نہ تھی۔ ستیا گرہ کا آغاز کیا۔ تقریر اور تحریر کے ذریعے پورے ہندوستان میں ''مخالف حیدرآباد'' مہم کا آغاز کیا، پرا تھنا سبھا کے نام سے حیدرآباد کے طول وعرض میں بیرونی سیاسی و معاشی امداد سے آریہ سماج کے مرکز قائم ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۸ء سے قبل اس تیاری کے بعد بدامنی اور نفرت کی فضا جاگ چکی تھی۔ ناریل کے اندر بم، مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانا۔ زہر کی آمیزش پر مشتمل پھل اور چاکلیٹ دیگر اشیائے خورد ونوش کے ذریعے موت کے گھاٹ اُتارنا، اضلاع میں مسلمانوں کا قتل، فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ مسلسل شروع کر دیا گیا اس تنظیم کا مشترکہ نام آریہ پرتی ندی سبھا نظام راجیہ رکھا گیا۔ ہندو مہا سبھا نے شہری حقوق کے نام سے شہر حیدرآباد اور ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی، ان کے جتھے کے جتھے ریاست کے حدود میں داخل ہوتے، ان کے فرقہ وارانہ نعرے اور ترانے اشتعال پر مبنی ہوتے۔ خود فرقہ وارانہ فضا پیدا کرتے اور مسلمانوں کا قتل کرتے اور اپنی بے گناہی اور مسلمانوں کے مظالم کا اعلان کرتے، آپسی مخاصمت میں کسی واقعے کا ظہور ہوتا تو اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے اس کی تین مثالیں جو اس عنوان سے راست متعلق ہیں ان کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات اور ان کے جھوٹے الزامات کی تشہیر میں اشتعال انگیزی کی جھلکیاں تصویر کی طرح عیاں ہیں۔

وید پرکاش کا افسانہ

کس طرح ہر ایک واقعہ کو جو ہندو مسلمان سے متعلق ہو، ایک فرقہ وارانہ حادثہ بنا دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مخصوص مثال وہ ہنگامہ ہے جو ڈسبر ۱۹۲۷ء میں بہ مقام گنجوٹی پیش آیا۔ ہنگامہ کی ابتدا شراب خانہ کے جھگڑے سے ہوئی جس نے بعد میں فرقہ وارانہ جھڑپ کی صورت اختیار کر لی اور متعدد اشخاص جو اس میں شریک تھے زخمی ہوئے اور بدقسمتی سے ان میں سے ایک شخص دسمیا نامی کی موت بھی واقع ہوئی، دسمیا کے مرنے کے ساتھ ہی آریہ سماجیوں نے اس کا نام وید پرکاش رکھا اور شدومد کے ساتھ یہ پروپگنڈہ شروع کیا کہ دسمیا کو اس لئے قتل کر دیا گیا ہے کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس مقدمہ کی تحقیقات سے جو ایک تجربہ کار ہندو نائب ناظم کوتوالی اضلاع کی نگرانی میں عمل میں آئی تھی، یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا۔ آریہ سماجی اخبارات نے اس حادثہ پر جس شدید اشتعال انگیز طریقے پر خامہ فرسائی کی ہے اس کی مثال کے طور پر ''ویدک

سندیش'' مؤرخہ ۳/اپریل ۱۹۳۸ء کے ایک مضمون کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

'' مہاتماؤں نے کہا ہے'' جان ہی سے جان پیدا ہوتی ہے۔ ریاست نظام کا ہندو فرقہ مردہ ہو گیا تھا اس کے لئے جان کی ضرورت تھی، وید پرکاش نے یہ نکتہ سمجھ لیا اور اپنے فرقہ کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کے لئے اپنی جان کا بلیدان دے دیا اور پھر ایک بار دُنیا کو یہ سندیش سنایا :

مر گئے لیکن زمین پر نام پیدا کر گئے

جان جانے کے لئے ہے موت آنے کے لئے

شری وید پرکاش ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھے لیکن ان کا دل ویدک دھرم کی محبت، اس پر اعتقاد اور اس کے احترام سے معمور تھا۔ وہ ایشور پر ایمان رکھتے تھے اور وید کو آسمانی کتاب مانتے تھے۔ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ ویدک دھرم اسی کتاب کے سندیس کو دُنیا میں پھیلا رہا ہے، ان ہی خیالات کو لے کر انھوں نے گنجوٹی میں ویدک دھرم کا پرچار شروع کیا۔ اس سے اس جگہ کے مسلمانوں کے مذہب کو سخت شکست ہونے لگی اور وہ وید پرکاش کے دُشمن ہو گئے لیکن وید پرکاش بہادر تھے اور بالکل نہیں ڈرے۔ انھوں نے برابر اپنا کام جاری رکھا۔ ایک دن ظالموں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے وید پرکاش کو پکڑ لیا اور ان کو زمین پر گرا کر گلے پر چھری رکھ دی اور کہا '' اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اسلام قبول کر لو'' کیا عجیب و غریب بدل پیش کیا گیا، کیسا تشویشناک لمحہ ہوگا! اور کس قدر بھیانک منظر نظر آیا ہوگا! وہ موت اور زندگی کی کشمکش تھی۔ ایک طرف پیاری جان، عزیزوں کی محبت اور دُنیاوی خوشی تھی اور دوسری طرف گلے پر ظالم کی چھری اور موت کی دہشت۔ ایک طرف پھول ہی پھول تھے اور دوسری طرف کانٹے اور کانٹوں کا بچھونا دُنیاوی خواہشات کہہ رہی تھیں '' وید پرکاش اسلام قبول کر لو'' لیکن جان سے بھی زیادہ پیارا ویدک دھرم، کم سن حقیقت اور مرلی منوہر ان کے سرہانے کھڑے ہو کر ایک سنسکرت کہاوت دہرا رہے تھے۔ آخر کار دھرم غالب آیا بہادروں کے خون نے وید پرکاش میں جوش بہادری اور بے خوفی پیدا کر دی اور وید پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا '' سر جائے تو جائے میرا ویدک دھرم نہ جائے''۔

اِدھر یہ الفاظ زبان سے نکلے اُدھر چھری وید پرکاش کے گلے پر چل گئی، خون بہنے لگا اور

ان کی روح نوجوان آریاؤں کو یہ سندیش دیتی ہوئی پرواز کرگئی :

جو آتی ہے آفت پہ آفت تو آئے — سدا شوق باد مخالف ستائے
حقیقت نے مجھ کو سبق یہ دیا ہے — دھرم کے لئے جان جائے تو جائے

دھرم پرکاش

ایک اور افسوس ناک واقعہ کے موقعہ پر جو ۲۸/ جون ۱۹۳۸ء کو بہ مقام کلیانی پیش آیا اور جس میں ایک شخص ناگپا نامی کی موت واقع ہوئی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ آریہ سماجیوں نے اس شخص کے مرنے کے بعد دھرم پرکاش کے نام سے موسوم کیا جس کی خود صدر ناظم کوتوالی اضلاع نے تحقیقات کی ہے۔ مسٹر ہالنس نے اپنی رپورٹ میں حسبِ ذیل ذکر کیا ہے۔

میں نے اس مقدمے کے واقعات کا حوالہ دیا ہے جو یہ تھے کہ کئی سال سے ناگپا اور سید عمر میں دُشمنی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں بھی سید عمر اور ناگپا نے ایک چھوٹے سے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا جو کلیانی میں پیش آیا تھا اور دورانِ ہنگامہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی ٹھان چکے تھے۔ واقعہ قتل سے تین دن پہلے سید عمر اور ناگپا کلیانی میں ایک دوسرے سے ملے اور ان کے آپس میں گالی گلوج اور جھگڑا ہوا۔ (حوالہ : حیدرآباد میں آریہ سماج تحریک مرتبہ حکومت سرکارِ عالی صفحہ ۳۳،۳۴)

اور یہ آپسی مخاصمت، ناگپا کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوئی جو بالکل خانگی دُشمنی کا نتیجہ تھی لیکن آریہ سماجیوں نے ناگپا کو دھرم پرکاش بنا دیا اور اپنی سیاسی مقصد برآری کا آلہ کار بھی۔

تیسرا واقعہ گلبرگہ سے متعلق ہے جس میں ایک بے گناہ شخص کو جو تانگے میں جارہا تھا آریہ سماجیوں نے برچھا بھونک کر شہید کردیا۔ صدر ناظم کوتوالی نے اپنی رپورٹ میں جو واقعات بیان کئے وہ حسبِ ذیل ہیں :

۱۶/ مارچ کو بعض ہندو رنگ رلیاں منانے والوں نے ایک تانگے پر جس میں تین مسلمان بیٹھے ہوئے تھے رنگ پھینکا۔ ان میں سے ایک تانگے سے اُتر پڑا اور احتجاج کیا جس پر متعدد ہندوؤں نے جن میں کئی آریہ سماج کے رکن تھے اسے گھیر لیا اور اس کے برچھا بھونک دیا جس کے زخم سے وہ اسی دن مرگیا۔ اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ خاکسار بڑی تعداد میں جمع ہوئے اور ہندوؤں کو ڈرایا دھمکایا پس اگر گلبرگہ میں کسی فساد کا معقول اندیشہ پیدا ہوگیا تھا تو ایسے

فساد کے ذمہ دار وہی ٹھہریں گے جو اشتعال اور قتل کے ذمہ دار تھے، لیکن مقامی عہدہ داروں نے کامیابی کے ساتھ صورتِ حال کا مقابلہ کیا جیسا کہ انجمن تجار گلبرگہ کا پیام اور مختلف مفادات کے (جن میں مختلف فرقے بھی شامل ہیں) پیامات شاہد ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ گو مسلمانانِ گلبرگہ میں بڑی برہمی کا احساس پھیلا ہوا تھا جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی دس ہزار کے قریب اپنے ہم مذہب کے جنازے کے ساتھ تھے باوجود اس کے کوئی نقض امن نہیں ہونے پایا۔ (حوالہ : حیدرآباد اور آریہ سماج تحریک صفحہ ۲۲، ۳۳ شائع کردہ حکومت سرکارِ عالی)

جب کبھی دو اشخاص میں کوئی خانگی جھگڑا ہو گیا تو فوراً آریہ سماجیوں نے اس کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر پیش کیا تا کہ ہندو اور مسلمان فرقوں میں منافرت پیدا کی جائے۔ ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ مسلسل اس قسم کے اخبار، رسالے اور پمفلٹ تقسیم کئے گئے جن میں دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور حکومت کے خلاف سخت ترین حملے کئے گئے ہیں۔

فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی یہ کوشش جس طرح صداقت سے خالی ہونے کی وجہ سے حدِ درجہ قابل نفرت ہے اسی طرح مختلف فرقوں کے تعلقات کے حق میں سخت خطرناک ہے۔ اپنے مندروں کے اندر آریہ سماجی مقرروں نے سینکڑوں جلسوں میں دوسرے مذاہب اور خاص طور پر مذہبِ اسلام کے خلاف حملے کرتے ہوئے انتہائی اشتعال انگیز الفاظ استعمال کئے ہیں، یہی حال ان کا حکومت کے ساتھ بھی ہے۔ وہ ہمیشہ حکومت حیدرآباد کے ہر فعل پر عادتاً اعتراض کرتے اور اس کو غلط طریقے پر پیش کرتے ہیں، ان کے مقررین و مبلغین نے گاؤں گاؤں کا دورہ کر کے حکومت یا مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر مظالم کی جھوٹی افواہیں پھیلائیں اور رعایا کے فرقہ وارانہ جذبات کو اُبھارا ہے۔ اپنے سامعین کو بغاوت کرنے مسلمانوں سے لڑنے، ان کو مارڈالنے اور ملک سے نکال دینے پر اُبھارا گیا ہے۔

(حوالہ : حیدرآباد اور آریہ سماج تحریک شائع کردہ حکومت سرکارِ عالی)

ان کی تقریروں اور پمفلٹوں کے مضامین کے اقتباسات، ان کی گندہ اور متعصّبانہ ذہنیت بطورِ خاص مسلمانوں سے، ساتھ ہی عیسائیوں اور سناتم دھرم سے متعلق ان کے ناپاک سیاسی عزائم کا ثبوت ہیں جو مذہب کی آڑ میں سیاسی اقتدار کے حصول کے خواہاں تھے۔

آریہ سماجی اخباروں میں آریہ سماجیوں کے مضامین سے

چند انتخابات

"مسلمانوں کی تاریخ ان کی آمد سے لے کر موجودہ زمانہ تک ہندوؤں کے خون سے رنگین ہے، مسلمانوں کی یہ عادت اور عمل ان کی مذہبی تعلیم کے مطابق ہے۔ انھوں نے کوئی عجیب و غریب بات نہیں کی ہے۔ ان کا مذہب تلوار کے ذریعے اور طاقت کے استعمال سے پھیلایا گیا ہے۔ ایسے مذہب کے پیروؤں سے جو عدم تشدد کے تصور ہی سے ناآشنا ہوں اور جن کا مذہب جہاد جیسا وحشیانہ اور ظالمانہ کام ان پر بطورِ فرض کے عائد کرتا ہے، ان سے اسی قسم کے مظالم کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اسلام کا بھڑکتا ہوا شعلہ ملک عرب سے اُٹھا اور جو ملک اس کے راستہ آیا اس کو برباد کرڈالا۔ ایران، ترکستان، افغانستان وغیرہ جیسے ممالک اس کے تشدد اور ظلم سے گھبرا کر اسلام کے گڑھے میں گر پڑے اور اس طرح اپنے آپ کو تباہ کرلیا۔ آج یہ ملک سب مسلمانوں کے ہیں۔ اسلام کو ہندوستان میں جیسی ناکامی اور مایوسی سے سابقہ پڑا، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ جب مسلمان ان ممالک کو جو ان کے راستہ تھے، حاصل کرکے ہندوستان میں داخل ہوئے تو ہمالیہ، گنگا اور جمنا کے سارے وسیع علاقہ نے ان کو بالکل غرقاب کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود انتہائی مظالم اور تلوار چلانے کے وہ صرف (۷) کروڑ ہندوؤں کا مذہب بدل سکے، مسلمانوں نے ہندوستان پر (۷۰۰) سال حکومت کی اور اس زمانہ میں انھوں نے ہندوستان میں اپنا مذہب پھیلانے کے سلسلہ میں لاکھوں ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔

(حوالہ : ویدک سندیش مؤرخہ ۲/جنوری ۱۹۳۸ء ایک آریہ نوجوان)

بھائی پرمانند کے بیان کا اقتباس جو انھوں نے یونائیٹڈ پریس کے ذریعہ شائع کرایا :

"ہندوؤں کو گھوڑے پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں وہ اپنے طریقے پر خدا کی پرستش نہیں کرسکتے، انھیں سفید کپڑے پہننے کی اجازت نہیں۔ وہ

جزیہ ادا کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں''۔

حیدرآباد میں ہندوؤں کی مصیبتوں کی کوئی حد وانتہا نہیں، ریاست کے اندر نہ کوئی نیا مندر بنایا جاسکتا ہے نہ کسی پرانے مندر کی مرمت ہی کی جاسکتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ہندوؤں کی ہر قسم کی مذہبی زندگی کو مٹادینا چاہتی ہے۔

آریہ سماجیوں کو اپنے گھروں کے اندر بھی ہون کنڈ بنانے اور اپنی پوجا پاٹ کرنے کی اجازت نہیں۔ ازشری بھائی پرمانند (حوالہ : اخبار ''ہندواوٹ لک'' نئی دہلی مؤرخہ ۳۰/نومبر ۱۹۳۸ء کا اقتباس)

اے آریاویرو! دیانند کے نام کی کفنی اپنے جسم پر پہن لو اور یاترا (سفر) کے لئے کوچ کرو۔ نیز دُنیا کو دکھادو کہ آریہ لوگ دُنیا میں گیدڑوں کی طرح سو سال زندہ رہنے کی بجائے شیر کی مانند ایک دن زندہ رہنا اچھا سمجھتے ہیں۔ (حوالہ : ''جھنڈا بمبئی'' ۳۱/جولائی ۱۹۳۸ء)

مسلمانوں کو کچل ڈالنا چاہئے کیوں کہ حکومت ہندوؤں کی ہوجائے گی۔ ان سب کو چاہئے کہ لاٹھیاں، غلیلیں اور تلواریں وغیرہ جمع کریں اور اپنے بچوں کو تلوار چلانا سکھائیں، باہر کے آریہ سماجی ان کی مدد کریں گے، جملہ جاتراؤں اور تہواروں کے موقع پر انھیں مسلح رہنا چاہئے اور جو مسلمان انھیں ستائے اس کو مار ڈالنا چاہئے۔ (حوالہ : پرلی ۱۴/اپریل ۳۸ء)

مسلمانوں نے گوشت بھوننے کے لئے کتب خانے تباہ کرڈالے ہیں۔ (پنڈت منگل دیو)

اب یہ کشمکش چاروں طرف بڑھتی جارہی ہے اور شولاپور کے کل ہند آریہ سماج اجتماع ناگپور کی سالانہ میقات ہندومہاسبھا کے بعد جو آئندہ کرسمس کے ہفتہ میں منعقد ہورہے ہیں، یقیناً یہ کشمکش ملک کے طول وعرض میں پھیل جائے گی اور سارے ہندوستان کے سنگٹھنی ایک کل ہند محاذ پیش کریں گے اور ایک کل ہند جھنڈے کے تلے اپنے ہم مذہبوں اور اپنے ہم وطنوں کو جو ریاست کی غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں، آزادی دلانے کے لئے پیش قدمی کریں گے۔

ایسا ہی ہوگا اگر اس اثناء میں نظام دانشمندی سے کام نہ لیں اور اپنی اس آرزو سے باز نہ آئیں کہ ہندوؤں کا قلعہ قمع کرکے ریاست کو خالص اسلامی ریاست بنایا جائے۔ خدا کرے کہ وہ اس افسوس ناک انجام سے عبرت حاصل کریں جو نہ صرف ان کے آبا واجداد کو بلکہ ان سے بھی زیادہ طاقتور اورنگ زیب کو کل ہندوستان کو مسلمان بنانے کی مہم کے سلسلہ میں پیش آیا اور مرہٹوں

کی صورت میں ہندوؤں کے جذبہ انتقام کی قوتوں نے اس کو اور اس کی اسلامی سلطنت کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔

ہندوؤں کو چاہئے کہ اپنے دشمن (مسلمانوں) کو کچل ڈالیں اور ان کو کبھی معاف نہ کریں

(آریہ سماج سلطان بازار ۲۴/فبروری ۱۳۴۷ف نریندر پرشاد سکسینہ)

آریوں کو چاہئے کہ ہندوستان میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رکھیں۔

(آریہ سماج دھول پیٹھ ۵/اردی بہشت ۱۳۴۷ف سیتا دیو جی)

حاضرین کو چاہئے کہ پستولوں اور تلواروں سے تیار ہو جائیں کیوں کہ ایک دن اس کی ضرورت پیش آنے والی ہے۔ (پرلی ۱۰/ڈسمبر ۳۷ء)

سیاسی گندگی کے ساتھ مذہب پر رکیک حملے نا قابل برداشت ہو گئے۔ خود سناتن دھرم کے خلاف بھی آریہ سماجیوں نے زہر اگلنا شروع کیا۔ اس خصوص میں سناتن دھرم کے ماننے والوں نے حکومت سرکارِ عالی سے نمائندگی کی۔

بیانات کے انتخاب میں سرکارِ عالی نے بعض بدترین قسم کے نمونے پیش کرنے سے قصداً احتراز کیا ہے جن میں بعض اس قدر رکیک ہیں کہ کسی سرکاری اشاعت میں ان کو نقل نہیں کیا جا سکتا مبادا آریہ سماجیوں کے خلاف ساری ریاست میں مخالفت کے جذبات بھڑک اُٹھیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ آریہ سماجیوں کی طرف سے دیگر مذاہب اور فرقوں کی جو مسلسل دل آزاری کی جا رہی ہے اور جس سے خود ہندو فرقہ کے بعض ذی اثر طبقے بھی متاثر ہو رہے ہیں جیسا کہ حال میں لاتور اور اودگیر میں مشاہدہ کیا گیا۔ اس کی بدولت ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے مختلف حصوں میں جہاں کہیں آریہ سماج تحریک جاری ہے، امن عامہ میں خلل اندازی واقع ہو رہی ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی ہے اور مختلف فرقوں میں جن میں خود ہندو فرقے کے چند ذی اثر طبقات بھی شامل ہیں سرکارِ عالی سے مداخلت کی درخواست کی ہے۔

سوہن لال کا یہ کہنا کہ مشہور عالم بھگوت گیتا ایک غلیظ کتاب ہے اور سری کرشن جی بدمعاش اور چور تھے اور یہ کہ جو شخص دوسرے لوگوں کی بیویوں سے ناجائز تعلقات رکھے وہ شاید ہی خدا کا اوتار کہلانے کا مستحق ہے، یہ اور ان کے علاوہ ضمیموں میں جو بیانات پیش کئے گئے ہیں،

ان سے آریہ سماجیوں اور ریاست کے رہنے والے دوسرے فرقوں میں خوشگوار تعلقات کا قائم رہنا بہت مشکل امر ہے۔ آریہ سماجیوں کی طرف سے جس قسم کی کتابیں اور رسالے مرتب کرا کے تقسیم کیئے جاتے ہیں وہ بھی اسی طرح قابل اعتراض اور اشتعال انگیز ہوتے ہیں، ذیل میں صرف چند کتابوں کے نام درج کیئے جاتے ہیں جس سے ایک حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں میں کسی قسم کی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔ گذشتہ چند سال میں حکومت کو اس قسم کی چالیس سے زیادہ کتابیں ممنوع الداخلہ قرار دینی پڑیں۔

۱) اسلامی گپیں ۲) قرآن قابل اعتبار نہیں

۳) شیطان اور اللہ میاں کی جھڑپ ۴) مسلمان مذہب کی پڑتال

۵) کہاں قرآن اور کہاں ایشور گیان ۶) قرآن میں وید کی تجلی

آریہ سماجیوں کے غیظ وغضب اور مذہبی جنون سے سناتن دھرمی بھی محفوظ نہ رہ سکے، پنڈت کالورام کے خلاف دل آزار حملے، پنڈت راج نارائن ارمان کی تقریر کے موقع پر جلسہ میں شر وفساد برپا کرنا، مہاراج گنج کے مارواڑیوں کے ساتھ جھگڑے اور حیدرآباد کے متعدد محلوں اور بستیوں کے ہندو مسلمان باشندوں کی طرف سے صدراعظم بہادر کی خدمت میں ایسی درخواستوں کا پیش ہونا کہ آریہ سماجی ریاست کی صدیوں کی ہم آہنگی میں انتشار پیدا کررہے ہیں، یہ چند مثالیں ہیں جو مشتے نمونہ ازخروارے پیش کی گئی ہیں۔

کرشن اور ان کے فلسفے نے بت پرستی کی حوصلہ افزائی کر کے ہندو فرقہ کے حق میں زہر کا کام کیا ہے، کرشن بدمعاش اور چور تھے۔ جو شخص دوسروں کی بیویوں سے ناجائز تعلقات رکھے وہ شاید ہی اس قابل ہے کہ خدا کا اوتار کہلائے۔ (سوہن لال آریہ کمار سبھا کا جلسہ حیدرآباد)

ویدک سندیش مؤرخہ ۱۳/ فبروی ۱۹۳۸ء میں سرکار نامدار صلعم کے تعلق سے ایک آریہ سماجی نابکار نے جو بدگوئی کی اس کو ''نقل کفر، کفر نہ باشد'' کے زیر عنوان بھی نقل کرنے کی جرأت کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ اب مسلمانوں کے جذبات واحساسات ایک خطرناک موڑ اختیار کرچکے تھے۔

مولوی ابوالحسن سید علی صاحب ایڈوکیٹ جو قوم پرست مسلمانوں کی صف میں تھے، ان

حالات وواقعات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ قوم پرستی کا لبادہ نکال پھینکا اور مجلس اتحادالمسلمین میں شامل ہو گئے، مجلس میں شمولیت کے بعد (مئی ۱۹۳۸ء) معتمدِ مجلس کی حیثیت سے نواب معین نواز جنگ کی معیت میں اضلاع گنجوٹی، عثمان آباد، بیڑ وغیرہ کا دورہ کر کے ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی، جس میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ آپ نے تحریر فرمایا:

''کانگریس اگرچہ غیر فرقہ وارانہ ادارہ ہونے کا دعویدار ہے لیکن حیدرآباد کے حالات اس دعوے کی کھلی تردید کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں کانگریس، ہندومہاسبھا اور آریہ سماج ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے چلتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ آریہ سماج نے مذہبی تحریک کے پردے میں بلدہ حیدرآباد، اضلاع اور دیہات میں جو بدامنی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے وہ کانگریسی دعوے کے تاروپود کو بکھیرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ عدم تشدد اور صداقت کی علمبردار ہے''۔

دکن پر قطب شاہیوں سے دورِ آصفی تک چھ سو سالہ دورِ حکمرانی میں مسلمانوں کی فراخ دلی رواداری اور تمدن کے اثرات کی صورت میں گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی۔ مختلف طبقات میں اتحاد وارتباط کی جھلک ہر شعبۂ زندگی میں اس درجہ سرایت کر گئی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب میں یگانگت اور یکسانیت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن آریہ سماجی تحریک نے ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا مقابل بنادیا۔

حق کی حمایت

اس زمانہ میں جب کہ تمام ہندو پریس و پلیٹ فارم حیدرآباد اور حکومت حیدرآباد کے خلاف زہرافشانیوں میں پوری طرح مصروف تھے، مجلس اتحادالمسلمین نے کامل احساس دردمندی کے ساتھ اس افترا پردازی کے انسداد کا عزم کیا۔ مولوی سید فضل حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ و رکن مجلس عاملہ اتحادالمسلمین کی قیادت میں ایک وفد برطانوی ہند کے دورہ پر روانہ ہوا۔ تا کہ ذمہ دار افراد اور ادارہ جات کو حقیقت سے روشناس کرائے اور بتائے کہ حیدرآباد میں ہندوؤں پر مبینہ ظلم وستم کی روداد میں اس کے سوا کوئی صداقت موجود نہیں کہ وہاں مسلمانوں پر جے پور، گوالیار اور جودھپور والور کی طرح ہندوؤں کو ظالمانہ تسلط نصیب نہیں ہے۔

اس وفد نے تقریباً دو ماہ تک برطانوی ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنا یہ

فرض انجام دیا اور اس کامیابی کے ساتھ انجام دیا کہ سارے برطانوی ہند کی ہمدردی دولتِ آصفیہ کو حاصل ہوگئی۔ خود سنجیدہ ہندو طبقہ نے بھی آریوں کی اس دروغ بانی کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔ برطانوی ہند کے مختلف حصوں سے ہندو سول لبرٹی اور آرین ڈیفنس لیگ کے ستیاگرہ کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔

حکومت کو مشورہ

مجلس اتحادالمسلمین نے اس نازک وقت میں جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی ان کو صحیح حالات سے باخبر رکھنے اور ان میں حقیقی سیاسی شعور پیدا کرنے کی خدمتیں انجام دیں، وہاں اس فریضہ سے بھی بے خبر نہیں رہی جو ایک سچی وفادار جماعت ہونے کی بناء پر دولت آصفیہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتا تھا، ایک طرف وہ اپنے ذمہ دار ارکان کو برطانوی ہند میں جہاں سے بیکار اور جاہل نوجوان کو پانچ چھ آنے یومیہ اجرت دے کر ستیہ گرہ کے لئے لایا جاتا تھا، بھیج کر وہاں کے ناواقف لوگوں کو صحیح حالات سے روشناس کرایا۔ دوسری طرف اس نے حکومت کو بہترین دانشمندانہ مشورے اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے دیئے اور ملک میں دہشت انگیزی اور امن سوزی کی جو ناپاک کوشش کی جارہی تھی ان کے قرار واقعی تدارک کی طرف متوجہ کیا۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ مجلس اتحادالمسلمین کو اپنی مخلصانہ مساعی میں بیرون ممالک محروسہ جس قدر کامیابی حاصل ہوئی اسی قدر اندرون ملک اسے ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ آریہ سماجی اپنی شرانگیزی میں برابر مشغول رہے، خود شہر حیدرآباد ان کی عافیت سوز اور امن شکن ہنگاموں کا شکار ہوتا رہا لیکن حکومت نے پنجہ آہنی کی قوت دکھانے کی بجائے ان کے سر پر مادر مہرباں کی طرح شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ ان کے لئے جیل خانوں میں وہ راحتیں مہیا کی گئیں جو ان بے چارے مزدوروں کو اپنی جھونپڑیوں میں کبھی میسر نہ آسکتی تھیں۔ عدالت کے فیصلہ کے باوجود ان سے مشقت نہ لی گئی، ان کے لئے اولٹین اور دودھ مہیا کیا گیا۔ اس طرح قانون شکنی کے مجرمین کے دل بڑھائے گئے۔ حکومت امن قائم رکھنے کے فرض کو رواداری اور محبت کی فراوانی سے بھلادیا۔ حتی کہ بار بار اپنی صفائی اخبارات میں پیش کر کے اپنے وقار کو بھی صدمہ پہنچایا، حکومت نے عملاً یہ ثابت کردیا کہ اسے ہندوؤں کی خاطر داری مسلمانوں سے زیادہ منظور ہے۔

اس وقت مجلس اتحادالمسلمین کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، دکن میں مسلمانوں کی شش صد سالہ فاتحانہ اقتدار اور حاکمانہ وقار کو نزع میں دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے حکومت پر نکتہ چینی کی اور عزم کرلیا کہ :

''وہ مسلمانانِ مملکت آصفیہ کے ان مفادات و امتیازات اور حقوق کو برقرار رکھے گی جو دکن میں ان کو نہ صرف سیاسی اقتدار کی بقاء بلکہ معاشی اور ثقافتی حیثیت کے تحفظ کے لئے توارثاً و تعاملاً حاصل رہے ہیں''۔

اب مجلس کے کاندھوں پر دوگونہ ذمہ داریوں کا بار تھا، ایک تو وفادار اور انتہائی وفادار جماعت ہونے کی بناء پر حکومت کو آصفی تخت و تاج کے وفادار و اقتدار کی حفاظت کے لئے مخلصانہ اور مفید مشورے دینا اور دوم ملتِ اسلامیہ دکن کے حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا تا کہ گذشتہ چھ سو سال سے جس طرح حکومت دکن کے دست راست بنے رہے ہیں آئندہ بھی حکومت کے ہر آڑے وقت کام آسکیں۔

(حوالہ : تاریخ مجلس اتحادالمسلمین ناشر دارالاشاعت سیاسیہ صفحہ ۶۰ تا ۶۳)

جوں جوں دُشمن کا حملہ قوی ہوتا رہا حکومت اپنے خلاف رفع غلط فہمی پر آمادگی کے بجائے سہمنے لگی۔ ایسے موقعہ پر مسلمانانِ حیدرآباد نے اپنے قلب میں بے چینی محسوس کی کیوں کہ اسلامی مملکت کی حیثیت میں حکومت آصفیہ کے خلاف جو افترا پردازی ہورہی تھی وہ دراصل اس کے مسلمان بادشاہ اور مسلمان رعایا کے خلاف کی جارہی تھی اس لئے اس افترا پردازی کے انسداد کا درد مسلمانوں اور اس کی نمائندہ جماعت مجلس اتحادالمسلمین اور اس کے قائد ہی کے دل میں پیدا ہوسکتا تھا، چنانچہ اسلامی حکومت کے خلاف اس غلط پروپگنڈے کے انسداد کے لئے مجلس کے قائد نواب بہادر یار جنگ بہادر نے حیدرآباد میں ہندو ہنگامہ پروری کے اسباب کو بے نقاب کرنے کے لئے بہ مقام الہ آباد مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بالمشافہ گفتگو کی اور بساط کانگریس کے ان اہم مہروں پر واضح کردیا کہ حیدرآباد میں سیاسی اقتدار کے حصول کا جو کھیل کھیلا جارہا ہے بدنیتی کے سوا اس کی کوئی اور اساس نہیں ہے، نواب صاحب کے اس بیان کی تصدیق کے لئے کانگریس کی طرف سے متعدد جاسوس تحقیق حالات کے لئے حیدرآباد بھیجے گئے

اور بالآخر آریہ سماجیوں کی بدنیتی اور حیدرآبادی مسلمانوں کے مقابلہ میں کانگریس محاذ کو جلد یا بدیر شکست خوردنی پا کر گاندھی جی نے حیدرآباد کی ستیا گرہ اور سول نافرمانی کو حکماً موقوف کر دیا۔

حیدرآباد کے لئے بیرون ملک نواب صاحب کی مساعی کامیاب ہورہی تھیں، لیکن خود حکومت حیدرآباد نواب صاحب کے دردمندانہ مشوروں کے مطابق عمل پیرائی میں تساہل برت رہی تھی۔ آریہ سماجی ادارے اپنی معاندانہ کارروائیوں میں برابر مصروف تھے۔ شہر عافیت سوز اور امن شکن ہنگاموں کا شکار ہوتا رہا لیکن حکومت نے مدافعت میں اپنے دست آہنی کی قوت دکھانے کے بجائے غیر معمولی شفقت سے دُشمن کے دل بڑھائے حتیٰ کہ اس کی دھمکیوں سے متاثر ہوکر ایک سے زیادہ دفعہ اصلاحات کی صورت میں مطالبات کی تکمیل کا وعدہ کرلیا اور عملاً ثابت کر دیا کہ حکومت آصفیہ کوئی اسلامی حکومت نہیں بلکہ ایک ایسی قومی حکومت ہے جس کے نزدیک مسلم طبقہ سے زیادہ ہندو طبقہ کی خاطر منظور ہے۔

مسلمانوں کے قائد اور خود اپنی ذاتی حیثیت سے نواب صاحب نے حکومت کے اس مسلک سے علانیہ شدید اختلاف کا اظہار کیا کیوں کہ حکومت اپنے اس عمل اور تصور سے اسلامی حکومت کے شش صد سالہ وقار کو صدمہ پہنچا رہی تھی۔ نواب صاحب نے حکومت کے اس تصور کو بدلنے میں جو ایثار اور قربانیاں کی ہیں دراصل وہی آپ کی سیاسی زندگی کا نچوڑ اور قیادت کی عظمت اور فضیلت کا سرمایہ ہیں۔

عام طور پر ہندوؤں کی جانب سے ذمہ دارانہ حکومت کو حق بجانب قرار دینے میں ان کی تعدادی اکثریت کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے تعدادی اکثریت اور قومیت پرستی کے خلاف مستقل جہاد کی بناء ڈالی، تاریخی شواہد کی روشنی میں اکثریت کے زعم کو زعم باطل قرار دیا اور قومیت پرستی کا تجزیہ کر کے حامیاں ملک کی تہی دامنی کو بے نقاب کیا۔

ہندو برادری شودر اور اچھوتوں کو شامل کر کے اپنی اکثریت کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پہلا ورق اس حقیقت کی شہادت کرسکتا ہے کہ اُونچی ذات کے ہندوؤں نے کبھی نیچ ذات کے ہندوؤں کو اپنی قوم کا عنصر تسلیم نہیں کیا بلکہ ان سے معاشی اور معاشرتی حیثیت سے بالکل علاحدگی اختیار کرلی۔ ان کو دین اور علم کی نعمتوں سے حکماً محروم کر دیا

گیا جس کی روداد تاریخ کے عمرانی پہلو کی بڑی دردناک سرگذشت ہے۔

نواب صاحب نے مختلف طریقوں سے ان حقائق کو حکومت کے اربابِ حل وعقد پر واضح کرنے کی کوشش کی، لیکن اب آپ کی ذات اور مجلس اتحاد المسلمین حریف کی حیثیت سے حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ ابتلاء اور آزمائش کی کڑی منزل تھی جہاں بڑے بڑے قائدین کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، لیکن مجلس کے قائد نواب بہادر یار جنگ بہادر نے اپنی ذاتی وجاہت، شخصی امتیازات حکومت میں اپنی مقبولیت کو علانیہ خطرے میں دیکھ کر قیادت مسلمین کا پورا پورا حق ادا کردیا۔ تحریر، تقریر، گفتار، کردار، اصالت وکالت غرض جدوجہد کا کوئی ذریعہ حقوق مسلم کی حفاظت میں ایسا نہ تھا جسے فراموش کردیا گیا ہو۔

علم عمل سے پختہ ہوتا ہے اور دعویٰ امتحان سے ثابت ہوتا ہے، خدمتِ اسلام کے جس دعوے اور عزم کے ساتھ نواب صاحب نے وادی پرخار میں قدم رکھا تھا وہاں کوئی ایسی شاہراہ نہیں تھی جو براہِ راست منزلِ مقصود تک پہنچادیتی۔ ترغیب وترہیب، رسوائی سر بازار، اتہام و الزام، ہنگامہ اور نہ معلوم کتنی پرخار وادیوں سے قائد کو گذرنا پڑتا ہے۔ اب صورتِ حال تو یہ تھی کہ قائد المسلمین کو بیک وقت کئی محاذ کا سامنا تھا، ایک طرف نادان دوست اور دانا دُشمن صف آراء تھے، دوسری طرف مسلح حریف اور دوست نما دُشمن کے معاندانہ حملوں کا مقابلہ تھا۔ تیسری طرف حکومت کے آگے جو بہرحال اسلامی حکومت ہے روایاتی اطاعت کے ساتھ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ پیش کرنا تھا، چوتھی جانب اپنی جماعت کے نزدیک صیانتِ حقوق اور اس کی جوابدہی کی ذمہ داری محسوس ہورہی تھی۔ (حوالہ : لسان الامت ازمولوی عبدالرحمٰن سعید صفحہ ۴۱ تا ۴۵)

اس خصوص میں قائدِ ملت پوری طرح حالات کو قابو میں لانے کے لئے دو محاذوں پر (اپنے تدبر اور فراست سے) شب وروز سیاسی سطح پر مصروف کار تھے، ایک طرف حکومت نام نہاد سہی اپنی تھی اور وہ غیروں پر کرم اور اپنوں پر ستم کے زیرِ عنوان ناعاقبت اندیش اقدامات میں مصروف تھی۔ دوسری طرف آریہ سماجیوں سے مقابلہ اور تیسری طرف مسلمانوں کے مشتعل جذبات دونوں مسئلوں کی سنگینی سے تیسرا مسئلہ بھی کچھ کم غیر اہم نہ تھا۔ لیکن تقاضہ مصلحت کے تحت قائدِ ملت نے یہ بات ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی کہ ''مخالف کی یہ تمنا ہے کہ مسلمان مشتعل ہوں

فساد سے حکومت بدنام کی جائے۔ اگر بدقسمتی سے ہم مشتعل ہوگئے اور اس وقت جب کہ صلح حدیبیہ کی ضرورت ہے۔ میدان بدر آراستہ کر دیا تو اس سے بڑھ کر غلطی نہیں ہوسکتی۔ تیار رہنا اور پرامن رہنا ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے''۔ (حوالہ : خط نمبر ۹۶ صفحہ ۱۵۱ مؤرخہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۳۸ء)

مشکل یہ ہے کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہم ایک ایسے ملک میں آباد ہیں، جہاں برائے نام ہی اپنی حکومت ہے۔ سختیاں ہوتی ہیں ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بندشیں ہوتی ہیں ہمیں سہنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے خلاف سختی سے احتجاج کیجئے تو اپنے ہاتھوں سے اپنے گال پر مکا مارنے کے برابر ہے۔ انشاء اللہ میرا دردِ دل ان ہی پتھروں سے چشمہ نکالے گا اور آپ شش جہات دکن کو سیراب ہوتا ہوا دیکھیں گئے۔ (حوالہ : خط نمبر ۶۶ صفحہ ۱۲۰ ۱۲/ مئی ۱۹۳۸ء)

جس وقت آریہ سماجی تحریک حیدرآباد میں جاری تھی اس تحریک کے خلاف اقطاعِ ہند کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی صورتوں میں رضا کارانہ خدمات کی پیش کش کر رہے تھے۔ اگر قائدِ ملت چاہتے تو راست عمل کے ذریعے ایک متوازی محاذ کا تاریخ ساز کردار ادا کر سکتے تھے لیکن حصولِ مقصد میں تخریبی ذرائع کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ سیاسی محاذ ہی پر دُشمن کو شکست ہو۔

ڈسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ سنشن کے بعد چوتھے دن عزیز ملت سید العزیز نے خصوصی اجلاس کا انعقاد عمل میں لایا، اس اجلاس میں سارے ہندوستان کے مسلم اکابرین جمع تھے۔ قائدِ ملت نے اس موقعہ پر سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد کے نفاذ اسکیم اصلاحات اور آریہ سماجی تحریک، ساتھ ہی دکن میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی بقا کے لئے کی جارہی جدوجہد کے بارے میں بڑی تفصیل سے اکابرین قوم کو واقف کروایا۔ اس طرح اب سارے ہندوستان کے مسلمان صورتِ حال سے آگاہ اور آمادہ تعاون عمل ہوگئے۔ ساتھ ہی قائدِ اعظم کی سیاسی رہنمائی اور دیگرا اکابرین کا تعاون بھی اس گتھی کے سلجھانے میں معاون رہا۔ چنانچہ جب قائدِ ملت کو ایک آریہ سماجی لیڈر کے موسومہ خط کی حصولی سے اس بات کا پتہ چلا کہ انگریز کی حکومت بھی ان شر پسندوں کی مدد اور تائید پر آمادہ ہو چکی ہے تو سر محمد یعقوب ممبر ایکزیکٹیو کونسل کے نام ممکنہ مدد کے لئے جو خط تحریر فرمایا وہ ان کے سیاسی تبحر اور دکن کے مسلمانوں سے ان کی دلی محبت کا آئینہ دار ہے

''حیدرآباد کے گذشتہ حالات اخبارات میں آپ نے پڑھے ہی ہوں گے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد اس وقت ایک سخت نازک دور سے گذر رہا ہے۔ حکومت دن بہ دن مرعوب ہوتی جارہی ہے اور اس کی مرعوبیت باغیوں کی ہمت بڑھارہی ہے۔ ابھی مسٹر گھنشیام گپتا (صدر آریا سادردیشک پرتھی ندھی سبھا، دہلی) آئے تھے۔ تمام اربابِ حل وعقد سے ملاقات کرکے گئے ہیں نہ معلوم کیا کیا زہر پھیلایا ہے اور ایک خبر باوثوق ذرائع سے سنی گئی اور اسی کے سلسلہ میں آج آپ کو زحمت دے رہا ہوں کہ مسٹر کیسکر کا ایک خط یہاں کے مشہور آریہ سماج لیڈر ونائک راؤ کے نام آیا ہے جو خوش قسمتی سے پولیس کے ہاتھ گرفتار ہوگیا، مسٹر کیسکر نے ونائک راؤ کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی باغیانہ کوششوں کو حیدرآباد میں زیادہ شدت سے جاری رکھیں اور خوش خبری دی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو ان باغیوں کی پوری تائید کرنے کے لئے تیار کرلیا گیا ہے۔

یہ جاننے کے باوجود کہ حکومت ہند کانگریس سے متاثر ہے۔ ہم اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کو کمزور کرنے پر انگریز کسی طرح تیار نہ ہوں گے۔ ان ہی ریاستوں کو آئندہ ہندوستان پر تسلط کا ذریعہ بنائیں گے لیکن اس خبر نے مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پیدا کردی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان اور سلطنت آصفیہ دو جدا شخصیتیں نہیں ہیں۔ اگر مسلمان تباہ ہوئے تو سلطنتِ آصفیہ کی خیر نہیں اور اگر خدانخواستہ آصفی سلطنت کو نقصان پہنچا تو حیدرآباد میں مسلمانوں کی زندگی ہندوستان کے دوسرے اقطاع سے زیادہ پرمصائب ہوجائے گی اسی لئے میں حکومت کے ارادہ سے بالکل بے تعلق رہ کر اور محض حیدرآبادی مسلمانوں کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے آپ کو زحمت دے رہا ہوں کہ خدا کے لئے اور اسلام کی خاطر اس وقت مسلمانانِ دکن کی فکر کیجئے۔ یہ نہیں جانتا کہ آپ کیا کریں لیکن یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ ضرور کچھ کریں''۔ (سرمحمد یعقوب ممبر اکزیکیٹو کونسل، دہلی ۵/ جولائی ۱۹۳۸ء خط نمبر ۸۶ صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۰)

جناب خاں عبدالرحمٰن خاں ایم-ایل-اے کھام گاؤں کی وساطت سے قائدِ ملت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات فرمانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان کے تعلقات مولانا سے دوستانہ نوعیت کے حامل تھے۔ نواب صاحب چاہتے تھے کہ خانصاحب حیدرآباد کے حالات سے مولانا ابوالکلام آزاد کو واقف کرائیں اور اس کے بعد نواب صاحب سے ان کی ملاقات کا انتظام ہو۔

یہاں کے حالات کیا لکھو، برادرانِ وطن نے تین محاذوں سے بیک وقت حملہ شروع کردیا ہے۔ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس، آریا ڈیفنس اور ہندوسیول ڈیلیگیٹز یونین بظاہر جدا جدا لیکن فی الحقیقت ایک ہیں۔ اس وقت تک ستیہ گرہ کے سلسلہ میں تقریباً سوآدمی گرفتار ہوچکے ہیں۔ سنیاسی باپٹ دوبارہ آئے تھے واپس روانہ کردیئے گئے۔ اب کی دفعہ اگر آئیں تو گرفتار کرکے سزا دی جائے گی۔ حکومت نے اس ستیہ گرہ کے مقابلہ کا عزم کرلیا ہے۔ میری ناقص رائے ہے کہ آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد سے ضرور گفتگو کرنی چاہیئے۔ (حوالہ : خط نمبر ۱۰۱ صفحہ ۱۵۵ مکاتیب بہادر یار جنگ)

دو اور خط بھی اس خصوص میں مولانا آزاد سے ملاقات کے بارے میں ملتے ہیں۔

۱۲/ شوال کے بعد جس دن کہے آرہا ہوں۔ اگر تیرھویں شوال سے ہی پروگرام مقرر فرما دیں تو مناسب ہوگا، تار سے جواب دیجئے تاکہ تیاری شروع کردوں۔ اسی سلسلہ میں مولانا سے ملاقات کا انتظام بھی ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے لئے دورہ کا رُخ بدلنا پڑے اور جالنہ کی بجائے امراوتی کی سمت سے ابتدا ہو تو مجھے عذر نہ ہوگا یا اگر اس سے قبل آپ چاہتے ہوں تو مطلع فرمائے، تیاری کرلوں گا۔ بہرحال تار کا منتظر ہوں۔ مولانا سے ایک ملاقات ضروری ہے اور میری آمد میں اس کا اظہار نہ ہوگا کہ ان کی ملاقات کے لئے آرہا ہوں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسبِ وعدہ برار آرہا تھا، ان سے ملاقات ہوگئی۔ مقام بجائے ناگپور کے اگر داردھا ہو تو پیر سیوگاؤں سے بھی تبادلہ خیال کا موقع مل سکے گا، جس کی میں خود تو خواہش نہ کروں گا۔ ممکن ہے مولانا انتظام کریں۔ مولانا کا فی الحال حیدرآباد آنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

(حوالہ : خط نمبر ۱۰۳ صفحہ ۱۵۷ خاں عبدالرحمٰن خاں صاحب)

۱۲/ شوال کے بعد سے برار کے دورہ کے لئے آسکتا ہوں۔ غالبًا یہی زمانہ ابوالکلام کے سی پی آنے کا ہے۔ خاں صاحب نے ان سے میری ملاقات ٹھہرائی ہے۔

(حوالہ : خط موسومہ میر غلام احمد حسن رئیس، تلے گاؤں ضلع امراوتی برار صفحہ ۱۵۸-۱۵۹ خط نمبر ۱۰۵)

الہ آباد میں مولانا آزاد سے ملاقات و گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن پنڈت نہرو سے آنند بھون میں یہ کہتے ہوئے کہ نواب صاحب ''افصح منی لسانا'' ہیں۔ وہ خود نواب صاحب کی زبان سے تفصیلات سنیں۔ پنڈت جی نے رضامندی ظاہر کی اور نواب صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا

کہ وہ ان کو صرف پندرہ منٹ دے سکتے ہیں کیوں کہ مصروفیت کے باعث وہ اپنا وقت تول تول کر صرف کررہے ہیں۔ نواب صاحب نے پنڈت جی کے سامنے اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں حیدرآباد کی سیاسی صورتِ حال اور اس میں مسلمانوں کے موقف کو واضح کیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد گھڑی دیکھ کر اپنی گفتگو ختم کردی۔ پنڈت جی نواب صاحب کے بیان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے مزید گفتگو جاری رکھنے کی خواہش کی اور فرمایا کہ اس کو ختم کرنے کے لئے اور کتنا وقت درکار ہوگا۔ نواب صاحب نے خود پنڈت جی سے استفسار کیا کہ ان کی ترازو میں کتنے وقت کی گنجائش ہے، اس پر پنڈت جی مسکراتے ہوئے مزید پندرہ منٹ دیئے۔ گفتگو کے خاتمے پر پنڈت جی ہندی سیاسیات میں فرقہ وارانہ زہر سرایت کرجانے پر افسوس کا اظہار کیا اور نواب صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ مقامی کانگریسی زعماء سے فیصلہ کن گفتگو کریں گے۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ از جناب سعید سبحانی صاحب)

اس خصوص میں راج کماری امرت کور کے نام (بتوسط گاندھی جی سیوا گرام واردھا) ایک خط بھی ملتا ہے جو نواب صاحب کی افہام و تفہیم اور آریہ سماجیوں کی شرارتوں سے ان کے اپنے لوگوں کو واقف کروانے کی مساعی کا پتہ دیتا ہے۔

''میں اس خط کے ساتھ آپ کے حسبِ خواہش، اس رپورٹ کی ایک کاپی روانہ کررہا ہوں جو آپ نے حیدرآباد میں پڑھی تھی۔ یہ رپورٹ مسٹر محمد صدیق نے مرتب کی جو اس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ گو یہ رپورٹ کمیٹی میں پوری طرح ''اپرو'' (Approve) نہ ہوسکی لیکن اس سے آپ کو ان اختلافی مسائل کا صحیح اندازہ ہوجائے گا جو حیدرآباد کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تصفیہ طلب ہیں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا۔ گاندھی جی کو میرا اسلام کہیں''۔

(حوالہ : خط نمبر ۱۹۸ صفحہ ۲۴۱ مکاتیب بہادر یار جنگ ۱۵/ جنوری ۱۹۴۲ء)

۲۲/ جنوری ۳۹ء کو آل انڈیا حیدرآباد ڈے مقرر کیا گیا، ہندوستان کے ہر گوشے سے مسلم اداروں اور عوام نے اس کا دندانِ شکن جواب دیا، جس سے معاندین کے حوصلے پست اور ان کی تدبیریں بے اثر ہوگئیں۔

سارے ہندوستان میں ہندو پریس اور قائدین حیدرآباد کے بارے میں افترا پردازی

میں مصروف تھے جس کے جواب میں قائدِ ملت نے اس صورتِ حال کے پیش نظر برطانیہ ہند کے مسلمانوں پر حقیقتِ حال کو بے نقاب کرنے کے لئے اجلاس پٹنہ میں پہلی مرتبہ سارے ہندوستان کے نمائندہ مسلمانوں کے اجتماع میں حیدرآباد کے مسئلہ کو پیش کیا اوراس طرح سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تائید کا راستہ ہموار ہوا۔ ساتھ ہی مسلم پریس کی کامل تائید بھی ملی ۔مولوی سید فضل حسین ایڈوکیٹ کی قیادت میں ایک وفد دو ماہ تک برطانوی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ذمہ دار افراد اور جماعتوں کو حقیقتِ حال سے روشناس کرانے کا فرض کامیابی کے ساتھ انجام دیا اوراس طرح نہ صرف مسلمانوں کی تائید حاصل ہوئی بلکہ غیر متعصب شخصیتوں کی بھی اس خصوص میں برطانیہ ہند سے یعنی ہندو سول لبرٹی اور آرین ڈیفنس لیگ کی ستیاہ گرہ کے خلاف آواز بلند ہوئی۔

سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ مجلس کی مخلصانہ کوششیں پوری طرح کامیاب ہورہی تھیں مگر سر اکبر کی قیادت ان منصوبوں کو خاک میں ملا دینے پر تلی ہوئی تھی کیوں کہ شخص مذکور ایک خاص غلامانہ مرعوب ذہن وفکر کا شخص تھا جس کے نام سے تو اس کے مسلمان ہونے کا پتہ چلتا تھا لیکن جس کے دل کے کسی گوشے میں مسلمان کے لئے ہمدردی کا احساس عنقا تھا۔ جس کے باعث آریہ سماجیوں کی شر انگیزیاں روز افزوں رہیں ۔ اسے موقعہ پر بروقت حکومت پنجہ آہنی کی قوت دکھانے کی بجائے اس کے سر پر مادرِ مہربان کی طرح شفقت کا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جیل خانوں میں اولٹین اور دودھ مہیا کیا جا رہا تھا، حکومت معصومانہ انداز میں اپنی بے گناہی اور رواداری کی صفائی میں اپنے وقار کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کی دل آزاری پر تلی ہوئی تھی۔

◆◆◆

پہلی گفتگو مفاہمت

۱۹۳۷ء

ملک کی سیاسی صورتِ حال کی پیچیدگی روز افزوں ہوتی گئی۔ مجلس اتحادالمسلمین اپنی مدافعتی حکمتِ عملی پر کاربند ہونے کے باوجود برادرانِ وطن سے بہ عزت سمجھوتہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھی۔ ہندو مسلم گفتگوئے مفاہمت کی پہلی کوشش میر اکبر علی خاں بیرسٹر نے کی۔ (کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور یم نرسنگ راؤ ہندوؤں کے نمائندوں کی حیثیت سے اس میں شامل تھے) مسلسل چودہ نشستوں میں شرائط مفاہمت تقریباً طے ہو چکے تھے اور متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے حکومت کے سامنے پیش کئے جانے والے تھے کہ سر اکبر حیدری کی مجرمانہ سازش سے ۲۲/ ستمبر ۱۹۳۷ء کو مفاہمت کی راہیں مسدود ہو گئیں کیوں کہ سر اکبر حیدری نے مجلس اصلاحات کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ ''اس اعلان نے باہمی مفاہمت کی نہ صرف قیمت گھٹا دی بلکہ خالص فرقہ وارانہ مسابقت، تعصب اور منافرت کی آگ کو ہوا دی''۔

آینگار کمیٹی

دیوان بہادر آر مود آینگار ایڈوکیٹ اس کمیٹی کے صدر تھے، بیرسٹر میر اکبر علی خاں، پروفیسر قادر حسین خاں، مسٹر کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور غلام محمود صاحب اراکین کمیٹی تھے۔ جو مسلمان اس کمیٹی میں شریک تھے وہ عامۃ المسلمین کے اعتماد کے حامل نہیں تھے اور یہ کمیٹی آینگار کمیٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ قائد مجلس قائدِ ملت نے آینگار کمیٹی (جس کو وہ انگار کمیٹی فرمایا کرتے تھے) کے خلاف احتجاج پر ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجلس اتحادالمسلمین کی جانب سے ایک بیان داخل کیا گیا۔ اس خصوص میں قائدِ اعظم کے نام موسومہ خط میں آینگار کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

آینگار کمیٹی میں جو حیدرآباد کی دستوری اصلاح کے لئے بیٹھائی گئی ہے مجلس

اتحادالمسلمین کا بیان داخل ہو چکا ہے، جس کو آپ کی ہدایات کے عین مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ہماری حکومت کی موجودہ کمزور پالیسی نے ہندوؤں کے مطالبات کو زیادہ شدید کردیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ مطالبہ کرنے میں حق وصداقت سے ہٹ جانے بلکہ نظر انداز کردینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ حیدرآباد کے مستقبل کو کس طرح مسلمانوں کے لئے قابل اطمینان بنایا جاسکتا ہے۔ایک فارسی شعر مع ترجمہ نیچے لکھ رہا ہوں۔

ہوا مخالف وشب تاریک و بحر طوفاں خیز
گستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

(حوالہ : خط نمبر ۲۰ صفحہ ۸۲ مؤرخہ ۷/فبروری ۱۹۳۸ء
موسومہ قائدِ اعظم مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

مخفی مبادا اصلاحات کے نفاذ کے معنی دوصد سالہ مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی وتمدنی وقار وتمکنت کو خاک میں ملادینے کے مترادف تھا، لیکن قائدِ ملت نے اصلاحات کے بارے میں حکومت کو ایک واضح پس منظر سے آگاہ کردیا تھا کہ :

''تاوقتیکہ مسلم حقوق کا تعین نہ ہوجائے کمیٹی کی سفارشات وتدوین اصلاحات کی اساس بے بنیاد رہے گی''۔

دوسری گفتگوئے مفاہمت

اسی اثناء میں قوم پرست طبقہ کے بعض افراد کی کوشش سے دوبارہ گفتگوئے مفاہمت شروع ہوئی۔

چنانچہ مسٹر نرسنگ راؤ نے محنت شاقہ کے بعد اپنی جماعت کا خط اعتماد حاصل کر کے مسلمانوں کے مسلمہ قائد نواب بہادر یار جنگ بہادر سے گفتگوئے مفاہمت شروع کی لیکن نوعیت حکومت کے مسئلہ پر جانبین کا اصرار بالآخر انقطاع گفتگو پر منتج ہوا۔ جیسا کہ شائع شدہ مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسٹر نرسنگ راؤ کا مطالبہ تھا کہ ذمہ دارانہ حکومت کو بعید نصب العین کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن نواب صاحب کو اس امر پر اصرار تھا کہ گفتگو کی پہلی منزل ہی میں طے ہو چکا تھا کہ موجودہ طریق حکومت کی تبدیلی کا نہ تو کوئی مطالبہ کیا جائے گا اور نہ مستقبل کے لئے

کوئی شرط یا پابندی عائد ہو سکے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی قیادت کی کسی منزل میں بھی مسلمانوں کے اقتدار کو متاثر ہونے نہ دیا بلکہ کامل استقامت کے ساتھ اس کی حفاظت کی۔ انقطاع گفتگو کے بعد آریہ سماجی فتنے آندھی کی طرح اُٹھنے لگے۔ تنظیم و قوت کے مظاہرے سیلاب کی طرح منظر عام پر آنے لگے۔ مہا سبھائی اور ہندو سول لبرٹیز اداروں کے ساتھ اسٹیٹ کانگریس بھی وجود میں آئی اور ان خالص فرقہ وارانہ اداروں کے دوش بہ دوش اس نام نہاد قومی جماعت نے گفتگوئے مفاہمت کے دوران میں ستیہ گرہ شروع کردی، جامعہ کی پرسکون علمی فضاء میں جہاں ہونہار طلباء کو فرقہ وارانہ سیاسیات کے جراثیم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے بالارادہ ہندو طلباء کو اُکسا کر وندے ماترم کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا گیا، ہنگاموں کا بازار گرم ہونے لگا، بم پھٹے، بیسیوں بندگانِ خدا کو ناحق ضرر پہنچایا گیا تاکہ حکومت متاثر ہو کر فوراً ان کے نام پروانہ حریت تحریر کردے۔

(حوالہ : لسان الامت ازمولوی عبدالرحمٰن سعید صفحہ ۴۶-۴۷)

عثمانیہ یونیورسٹی اور نظام کالج سے طلبہ نے بائیکاٹ کی مہم شروع کی اور ناگپور یونیورسٹی میں داخلے کی مہم کا آغاز کیا۔ قائدِ ملت اس سارے سیاسی تماشے میں کوئی بھی موقعہ ان کی ترکیبوں کو ناکام بنانے کی تدبیروں کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، چنانچہ اس خصوص میں خاں صاحب عبدالرحمٰن ایم-ایل-اے کھام گاؤں اور خاں بہادر صدیق علی خاں کی وساطت سے مدد حاصل کی اور اس خصوصی مہم کے لئے مجلس کی جانب سے میر حسن الدین صاحب ایڈوکیٹ کو ناگپور روانہ کیا گیا۔

"ہندو مہاسبھائیوں کی کارروائیوں کو تو آپ کو علم ہوا ہوگا، آج کل آپ کا صوبہ مجرمین حیدرآباد کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے اور اس سے آپ باخبر ہوں گے کہ ناگپور یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ کے خارج شدہ ہندو طلباء کو اپنے یہاں شریک کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ سینٹ کی میٹنگ غالباً ۱۷/ جنوری کو ہو رہی ہے اور اس میں یہ مسئلہ بھی پیش ہوگا کہ قواعد میں ایسی ترمیم کی جائے کہ حیدرآبادی طلباء کا داخلہ ممکن ہو سکے۔ واقعات آپ کو معلوم ہی ہیں کہ ہندو طلباء نے حیدرآباد اور اورنگ آباد کے کالجوں میں اشتعال انگیز طریقے پر "وندے ماترم" کا مابہ الاختلاف راگ گایا اور جب ان کو منع کیا گیا تو عدول حکمی کی اور جرأت کے ساتھ اپنے نام نوٹ کرادیئے، ان کی طرف

سے یہاں جو لٹریچر شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے اس گیت کو اپنا مذہبی گیت قرار دیا ہے، حالاں کہ کانگریس نہ اس کو مذہبی گیت سمجھتی ہے اور نہ پوری قوت کے ساتھ اس کے قومی گیت ہونے کا قائل ہے۔ ان سارے حالات کے تذکرے سے یہ منشاء ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یونیورسٹی سینٹ کو ترمیم قواعد اور اعانت طلبائے خارج شدہ سے مانع رکھا جائے، اس کی تدابیر کیا ہوں گی وہ یہاں بیٹھ کر میں نہیں بتا سکتا۔ آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ سی۔ پی کے مسلمانوں کا اس کے خلاف احتجاج سینٹ کے مسلم یا نان برہمن یا مخالف کانگریس ارکان کا اختلاف ناگپور یونیورسٹی کے مسلم طلباء کی طرف سے دھمکی کہ ایسی صورت میں وہ اس یونیورسٹی کو ترک کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے مجبور ہوں گے۔ مسلم پریس اور پلیٹ فارم کی طرف سے احتجاج یہ سب کچھ اور اس سے بہت زیادہ آپ کی توجہ سے ممکن ہے، یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ناگپور یونیورسٹی کا یہ اقدام انٹر یونیورسٹی بورڈ کے باہمی تصفیہ کے خلاف ہے کہ ہر یونیورسٹی، دوسری یونیورسٹی کے قواعد کا احترام کرے۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ ان لڑکوں نے ہماری جامعہ سے سند اخراج حاصل نہیں کیا ہے، ناگپور یونیورسٹی اس امر کا اندازہ کیسے کر سکے گی کہ کونسا طالب علم کس جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ آج جنوری کی ۱۲/ تاریخ ہے یہ خط غالباً آپ کو ۱۴/ تاریخ کو ملے گا اور صرف تین دن درمیان میں رہ جاتے ہیں جو آپ کی مخلص مساعی کے لئے بہت کافی ہیں۔ اسی خط کی ایک نقل خاں بہادر نواب صدیق علی خاں صاحب کی خدمت میں بھی روانہ کر رہا ہوں۔ جواب کا بے چینی سے منتظر ہوں"۔ (حوالہ خط نمبر۱۰ صفحہ۱۶۱-۱۶۲ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

خاں صاحب عبدالرحمٰن خاں صاحب کو آج میں نے ایک لکھا ہے اس کی نقل منسلک کر رہا ہوں۔ مجھے خبر نہیں کہ خاں صاحب آج کل کھام گاؤں ہیں یا ناگپور میں۔ اگر ناگپور میں ہوں تو براہِ کرم ان کو فوراً یہ خط دکھا دیجئے۔ اس مقدس مقصد میں ان کے ساتھ آپ کے اور آپ کے تمام ساتھیوں کے کامل اشتراک عمل اور مخلص مساعی کا یقین کامل رکھتا ہوں۔

(حوالہ : خط بنام خاں بہادر نواب صدیق علی خاں صاحب، ایم-ایل-اے

سنٹرل نواب پورہ ناگپور مؤرخہ ۱۲/ جنوری ۱۹۳۹ء خط نمبر۱۱۰)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ بسلسلۂ مکتوب گذشتہ مجھے آج اس امر کی اطلاع دینی ہے کہ حسبِ

ذیل مسلم حضرات مسلم ناگپور یونیورسٹی کے سینٹ میں شریک ہیں۔آپ ان سے سینٹ میں اختلاف کرواسکتے ہیں، یہاں سے مولوی میرحسن الدین صاحب بی-اے-ایل-ایل-بی وکیل اس سلسلہ میں آپ حضرات کی خدمت میں یاددہانی کے لئے روانہ کئے گئے ہیں۔آپ سے ضرور ملیں گے ———— ''آپ کا مخلص بہادر یار جنگ''

۱) ایس-ڈبلیو-اے رضوی صاحب بی-اے-ایل-ایل-بی-سی-پی-آئی

۲) خان بہادر سید ذاکر علی صاحب بی-اے-آئی-ایس-او

۳) خاں بہادر ایچ-ایم-ولایت اللہ صاحب بی-اے-آئی-ایس-او

۴) شمس العلماء ایم-اے-غنی صاحب ایم-اے

۵) حبیب احمد رضوی صاحب ایم-اے-ایل-ایل-بی

۶) محمد ہدایت اللہ صاحب بی-اے-بارایٹ لا

۷) ایس-جی-تقی صاحب ایم-اے

(حوالہ : خط نمبر ۱۱۱ صفحہ ۱۶۳ موسومہ خاں بہادر نواب صدیق علی خاں

مؤرخہ ۱۵/ جنوری ۱۹۳۹ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

''مجلس اتحادالمسلمین کی مرکزیت اپنے اور پرائے سب کی نظر میں مسلم ہو چکی تھی۔ برطانوی ہند سے پیہم رضا کارانہ خدمات پیش کی جارہی تھیں۔نواب صاحب کے لئے آسان تھا کہ حکومت کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے لئے راست عمل کا ایک متوازی محاذ تیار کر دیا جائے حکومت نے نفاذ اصلاحات کی نسبت اپنے ارادے کو معین کر کے مسلمانوں کے پیمانہ شکیب کو لبریز کر دیا۔مصلحتِ وقت کے پیش نظر نواب صاحب نے حکومت کے اس طرزِ عمل پر سخت تنقید اور نکتہ چینی شروع کی تا کہ مسلم طبقہ کے احساسات کا حکومت کو اندازہ ہو سکے۔اتحادالمسلمین کی کوشش تھی کہ ملک کی فضا سازگار ہونے تک اصلاحات کا نفاذ ملتوی رہے۔اہل ملک اس تحریک التواء کے دل سے حامی تھے، جس کا ثبوت امن واتحاد کا وہ عظیم الشان جلسہ ہے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کی اپیل پر اظہارِ تشکر کے لئے قوم پرستوں کی جانب سے منعقد کیا گیا۔

(حوالہ : لسان الامت صفحہ ۴۷-۴۸ از عبدالرحمٰن سعید)

مہاراجہ کشن پرشاد کے بیان پر اظہارِ تشکر کا جلسہ

۱۹۳۹ء

مہاراجہ کشن پرشاد جو کئی برس ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم رہے اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار سمجھے جاتے تھے (ایک پمفلٹ کی شکل میں) جو مہاراجہ کا تفصیلی بیان تھا جس میں ریاست حیدرآباد کی ہندونوازی، انصاف پروری اور دکن کے ہندو مسلم اتحاد پر شرپسندوں کی سیاسی ہر بونگ اور فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف جس میں بیرونی مفسد پردازوں پر لعنت ملامت کی گئی تھی۔ قوم پرست مسلمانوں کی جانب سے اس بیان پر اظہارِ تشکر کے لئے زمرد محل میں جلسہ عام کا انعقاد عمل میں لایا۔ جس میں مہمان مقرر کی حیثیت سے قائدِ ملت کو مدعو کیا گیا۔ اس اجلاس کی آنکھوں دیکھی کہانی، قائدِ ملت کے رفیق کار مولوی محمد احمد خاں کی زبانی ہی سنی جاسکتی ہے :

''حیدرآباد کی قوم پرست جماعت نے اس بیان کا سہارا لیا اور سر مہاراجہ کی خدمت میں اظہارِ سپاس گزاری کے لئے زمرد محل کے وسیع ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ بتاریخ ۲۸/ اپریل ۱۹۳۹ء منعقد کیا۔ نام تو امن واتحاد کی فضاء کو پھیلانے کا لیا جارہا تھا۔ لیکن مقصد اپنی جماعت کا استحکام، اپنی قیادت کا اظہار اور حکومت کے تال وسر پر اپنی گت بجانا تھا ـــــــ قوم پرست اپنے آپ کو ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ظاہر کرتے اور ملک کے روشن خیال طبقہ (Intelligntia) کی نمائندگی اور قیادت کے دعویدار تھے ـــــــ امن واتحاد کا جلسہ ہوا۔ شہر کا سب سے بڑا ہال تنگیٔ داماں کی شکایت کررہا تھا، ورانڈہ، بال کنی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کمپونڈ اور کمپونڈ کے باہر کا میدان سارے کا سارا پٹا پڑا تھا، عابد روڈ اور برابر والی محسن الملک کی کوٹھی کے وسیع احاطہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جلسہ نہ تھا حیدرآبادی سیاست کا ایک نقطۂ تغیر (Turning Point) تھا۔ جلسہ کے صدر قوم پرست جماعت کے قائد اور ملک کے مشہور قانون داں نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر تھے۔ خطبہ صدارت پڑھا جارہا تھا کہ موٹر کے ہارن کی مخصوص آواز آئی۔ یکایک

شور اُٹھا ''اللہ اکبر'' اور ''بہادر یار جنگ زندہ باد'' کی صداؤں سے آسمان پھٹا پڑتا تھا۔ پندرہ منٹ تک خطبہ صدارت کی خواندگی ملتوی رہی ۔ یہ مسلمانانِ دکن کے واحد نمائندہ کی آمد کا اعلان تھا۔ کچھ دیر بعد سکون ہو گیا۔ خطبہ ختم ہو گیا۔ قرارداد سپاس گذاری پیش ہوئی ۔ تائید میں قوم پرست افراد کی تقریریں ہوئی ۔ اب صدرِ جلسہ نے اپنے مہمان کو قرارداد کی مزید تائید کرنے کی دعوت دی قائدِ ملت اُٹھے، مجمع سے پھر شورِ تحسین و آفرین بلند ہوا۔ زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زلزلہ سا آ گیا ہے ۔ بہادر یار جنگ نے اپنی تمام ساحرانہ صلاحیتوں اور پوری خطیبانہ شان کے ساتھ تقریر کی ، مجمع پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ صرف سانس چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ اولاً انھوں نے محبت آ گہیں انداز میں سر مہاراجہ سے اپنے ذاتی تعلقات کا تذکرہ کیا، اس تجربہ کار ''بڈھے'' ہندو صدر اعظم کی سلطنت اور اس کے والی سے وفاداری اور محبت کا ذکر کیا، پھر ان کے بیان کے ایک ایک جزو کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا کہ مہاراجہ آنجہانی کی نظروں میں موجودہ فرقہ وارانہ تلخی اور بیرونی مفسدہ پردازی کی اصل وجہ حکومت آصفی کے دستور میں اصلاحات کے نام سے تبدیلی کرنے کا اعلان ہے ، قرارداد کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے مہاراجہ کے بیان کی اس روح کو ایک ترمیم کی صورت میں پیش کرتے ہوئے التوائے اصلاحات کا مطالبہ کیا اور بیٹھ گئے ۔ مجمع پر ایک وجد کا عالم طاری تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے بانیانِ جلسہ تک سب کچھ بھول گئے تھے، ان کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا جب کچھ حواس درست ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ سارا معاملہ چوپٹ ہو چکا ہے، بازی اُلٹ گئی ہے۔ صدر جلسہ نے قائدِ ملت سے درخواست کی کہ وہ اپنی ترمیم کو واپس لے لیں ۔ مجمع پر ایک جوش کا عالم طاری تھا۔ قائدِ ملت کے رفیق کامل مولانا مظہر کھڑے ہوئے اور انھوں نے مخالفت کی ترمیم پیش ہو چکی ۔ اب وہ ایوان کا مسئلہ بن چکی ہے ۔ چاہے تو وہ اس کو ٹھکرا دے یا منظور کر لے، محرک یا کسی اور کو دستوراً ترمیم واپس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجمع کا جوش و خروش قابو سے باہر ہو چلا تھا۔ بالآخر صدر جلسہ کو آراء حاصل کرنی پڑیں۔ مخالفت میں صرف تین ہاتھ اُٹھے اور نعرہ ہائے تکبیر کی گونج میں التوائے اصلاحات کی ترمیم منظور ہو گئی۔ تیر نشانہ پر لگا۔ میر سپاہ کے ایک ہی وار سے دونوں شکار ہوئے ۔ مخالف بھی اور قوم پرست بھی ــــــــ ادھر یہ تحریک حکومت کے ایوان میں بم بن کر گری ،

ارباب اقتدار کی آنکھیں کھل گئیں۔احساسِ کمتری جاتا رہا، دل کو ڈھارس بندھی اور بازوؤں میں تھوڑا سا دم خم آ گیا ——— مگر اصلاحات کی کمیٹی برابر اپنا کام کئے جارہی تھی"۔

(حوالہ : ہمارا قائد   ازمولوی محمد احمد خاں   صفحہ ۳۹ تا ۴۲)

"اس متفقہ آواز کے باوجود حکومت کی روش اعلان اصلاحات اور مسلم مطالبات کے سلسلہ میں غیر اطمینان بخش رہی۔اب نواب صاحب نے اپنے واجبی مطالبات کو منوانے میں حکومت کے ارباب بست وکشاد سے گفتگو کا آغاز فرمایا اور کامل تدبر کے ساتھ قیادت کا حق ادا فرمایا لیکن حکومت کے اس تصور کو بدلنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو ہندو فتنوں کی ہنگامہ خیزی نے پیدا کر دی تھی، رائے عامہ میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مجلس اتحاد المسلمین سے راست عمل کا مطالبہ کیا جانے لگا۔نواب بہادر یار جنگ بہادر نے متعدد موقعوں پر مسلمانوں کے جذبات کو روکنے کی کوشش فرمائی اور اِدھر مسلم مطالبات کو حق بجانب تسلیم کرانے میں حکومت کا تامل بدستور باقی رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام کو اب تک جو بداعتمادی حکومت سے تھی اس کا رُخ فطرتاً اتحاد المسلمین کی جانب پھر گیا۔عوام کی اس عارضی کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر اغیار نے مرکز گریز تدابیر کا جال بچھا دیا اور مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے مکاتبِ خیال میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ سرے سے مجلس کی مرکزیت اور نواب صاحب کی قیادت باقی نہ رہے۔قائد کے امتحان کا اس سے نازک وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا۔لیکن بحمد اللہ کہ نواب صاحب کی دانشمندی اور تدبر نے عبوری دور کی ساری مشکلوں کو حل کر دیا اور مسلمانوں کی مرکزیت پر کوئی آنچ نہ آسکی۔

حکومت نے ۱۳۳۹ء کو بالآخر اصلاحات کا اعلان کر دیا، سنجیدہ مسلم حلقوں میں سخت شکایت پیدا ہو گئی کہ ملک کی تشویشناک حالات میں سکون کا انتظار اور ملک کی خصوصی روایات کے اعتبار سے اصلاحات کے متوقعہ شدید ردِعمل کا اندازہ کئے بغیر حکومت نے سر ڈال دی جو اس کے دوصد سالہ وقار اور تمکنت پر کاری ضرب ہے، جس کو صرف وہی جماعت محسوس کر سکتی ہے جس نے دولت آصفیہ کی تاسیس اور تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا، مجلس اتحاد المسلمین نے اصلاحات کو اپنی قرارداد کے ذریعہ ملک کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً غیر اطمینان بخش قرار دیا

(لسان الامت   صفحہ ۴۸-۴۹   ازمولوی عبدالرحمٰن سعید)

تجاویز اصلاحات کے مضمرات سے عوام کو واقف کرنے کے لئے تشریح اصلاحات دستوری کے زیرِعنوان ۲۳، ۲۴، ۲۵/اگست ۱۹۳۹ء کو قمر باغ میں وسیع میدان میں مسلسل تین دن، لاکھوں انسانوں کے عظیم اجتماعات میں عام فہم انداز میں امارت و بادشاہی کی ابتدا سے دور جمہوریت کی تاریخ اور موجودہ کشمکش پر تاریخ ساز تقریریں فرمائیں۔

قائدِ ملت کی ان معرکۃ الآراء تقریروں نے معلنہ اصلاحات کے مضمرات اوران کے مضر نتائج سے عامۃ المسلمین کو پوری طرح واقف کروایا اور وہ اب پورے عزم وولولہ کے ساتھ راست عمل کے لئے آمادہ تھے۔صرف قائد کے اشارہ کی دیر تھی۔مجلس نے حزم واحتیاط کے ساتھ ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا اور یہ طے کیا کہ تعین تاریخ کے ساتھ حکومت کے سامنے مطالبات کو رکھا جائے۔اگر مطالبات منظور نہ ہوں تو راست عمل (Directaction) شروع کردیا جائے،مجلس کے اس فیصلہ سے حکومت کو مطلع کرنے کے لئے بہادر یار جنگ کی سرکردگی میں ایک دفد بھیجا گیا۔

قائدِ وفد نے سر اکبر کو مجلس کے اس فیصلہ سے مطلع کیا۔پوچھا گیا کہ راست عمل سے کیا مراد ہے جواباً کہا گیا کہ ہر وہ عمل جس سے حکومت کو پریشان اور اس کو مسلمانوں کے مطالبات ماننے کے لئے مجبور کیا جاسکے۔سنتے ہی ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔صورت فق ہوگئی''دلکشا''میں ایک بھونچال آگیا!!!(ہمارا قائد مولوی محمد احمد خاں صفحہ ۶۵)

مسلمانوں کے جذبات اب قابو سے باہر ہوچکے تھے،جلوس نکلے،دوکانیں احتجاج میں بند ہوئیں۔پولیس کی جانب سے سختیاں برتی گئیں۔گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

اس کے بعد مجلس اتحاد المسلمین کی جانب سے ایسی ترمیمات مرتب کرکے حکومت کے سامنے پیش کی گئیں جن سے مسلمانوں کے حقوق و امتیازات کا تحفظ ہوجائے۔راست عمل کی تیاری مکمل ہوگئی۔صرف قائد کے اشارہ کی دیر تھی مجلس نے حزم واحتیاط کے ساتھ ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا اور یہ طے کیا کہ تعین تاریخ کے ساتھ حکومت کے سامنے مطالبات کو رکھا جائے۔ پھر ایک مہلت طلب کی گئی،سر اکبر حیدری،قائدِ مجلس کے آگے اب بے بس تھے۔قبل اس کے کہ مسلمان حکومت کے خلاف صف آراء ہوتے حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔قائدِ اعظم کو زحمت دی گئی۔اربابِ حکومت اور قائدِ مجلس سے کئی دن کی گفتگو کے بعد اس مسئلہ کو اس طرح سلجھادیا کہ

حکومت نے دستور میں وہ ساری ترمیمات منظور کرلیں جو مسلمانوں کے حقوق و امتیازات کے تحفظ کی ضامن تھی۔

اصلاحات کی مہم کی ساری تاریخ کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ایک مسلمان فرمارواکی مملکت میں، مسلمانوں کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ اور وہ فرمانروا کی طرف سے اپنے آپ کو بے سہارا سمجھنے پر مجبور ہوئے اور سچ تو یہ ہے کہ ''حیدرآباد میں ان پچھلے چند برسوں کے اندر جب سر حیدری کی سیاست حیدرآباد کے دستور کی ترکیب و تحلیل میں مصروف تھی۔ نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا تو حیدرآباد کے نظم و نسق کا کچھ اور ہی انداز ہوتا''۔

''علامہ سلیمان ندویؒ''

شاہ وقت کی ناعاقبت اندیشی اور حالات سیاسیہ کی نازک صورتِ حال نے ان کے جذبہ اندروں کی بے قراریوں اور منصب قیادت کی ذمہ داریوں کو کس قدر بے قرار کر دیا تھا۔ قائدِاعظم کے موسومہ خط میں ان احساسات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''میری حالت ایک ایسے باز کی ہے جس کو بلبل کی طرح پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور جس پر فضائے بسیط ممنوع کر دی گئی ہو۔ حیدرآباد کی تنگ زمین میرے طائر جذبات کے لئے فی الحقیقت ایک قفس سے کم نہیں ہے۔ جی میں آتا ہے کہ تتلیاں توڑ کر باہر نکل پڑوں لیکن حیدرآباد کے اتنے حقوق مجھ پر ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کو اس عالم کش مکش میں چھوڑ دینا احسان فراموشی سے کم نہ ہوگا اس لئے مجبور ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہی کام جو آپ کی قیادت میں براعظم ہند میں ہو رہا ہے۔ میری ناچیز مساعی سے سرزمین دکن میں ہو''۔

(حوالہ : خط بنام قائدِاعظم خط نمبر۲۰ صفحہ۸۱-۸۲ مؤرخہ ۷/فبروی ۱۹۳۸ء مکاتیب بہادر یار جنگ بہادر)

اصلاحات کے تعلق سے سر اکبر حیدری، قائدِ ملت کی ذات کو اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ حکومت کے اختیار میں جتنے حربے تھے سب آزمائے گئے۔ اس وقت تک نواب صاحب ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہو چکے تھے، حیدری حکومت ان کے بڑھتے ہوئے اثر اور روز افزوں مقبولیت کے باعث لرزاں و ترساں تھی۔ اب یہ کوشش پیش نظر تھی کہ ان کی قیادت کے اثر کو کسی سیاسی حربے سے بے اثر کر دیا جائے۔

’’چوں کہ نواب صاحب کی شخصیت ہند گیر اہمیت کی حامل تھی اس لئے ریاستی حکومت کو یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے خلاف تشدد برتنا کل ہند احتجاج کو دعوت دینے کے مترادف ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے مشورہ سے نواب صاحب کے خلاف موثر کارروائی کی جائے۔ اِدھر حضور نظام کو ان کے خوشامدی درباریوں نے باور کروایا کہ نواب صاحب کی بے پناہ مقبولیت سے اس کے آثار پیدا ہو گئے ہیں کہ اٹلی کے مسولینی اور جرمنی کے ہٹلر کی طرح وہ دکن میں آمریت اختیار نہ کرلیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مرحلہ اول ہی میں اندیشہ کا ازالہ کر دیا جائے۔ غرض سازش کی تکمیل کے بعد حکومت نے نواب صاحب کی ذات کو ریاست کے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھ کر حکومت ہند کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو مطلع کیا کہ وہ نواب صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی ہے اس زمانے میں سرفرانسس وایلی حکومت ہند کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے انچارج تھے اور نواب صاحب کی قیادت کی روز افزوں مقبولیت سے بھی وہ آگاہ تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں عجلت کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا، اولاً بطورِ احتیاط لیگی حلقوں میں نواب صاحب کے اثر ورسوخ اور مجوزہ گرفتاری کے بعد اس کے رد عمل کے بارے میں دریافت کروائی گئی۔ لیگی قائدین نے نواب مرحوم کی قیادت کے تعلق سے مثبت قسم کی رائے ظاہر کرنے سے عمداً گریز کیا بلکہ اپنی رپورٹ میں ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی، ان آراء کے بین السطور سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ پر نواب صاحب مرحوم کے خلاف لیگی قائدین کی رقابت واضح ہوگئی۔ اس پوری کارروائی کے بعد صحیح نتیجہ پر پہنچ کر اس نے ریاستی حکومت کو جواب ادا کر دیا کہ وہ نواب صاحب کو اپنی ذمہ داری پر گرفتار کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جواب سے اسٹیٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے معودِ ذہنی کا پتہ چلتا تھا۔ اس لئے حیدری حکومت کی گرفتاری کی تجویز پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حکومت کی ان ساری کارروائیوں سے واقفیت کے باوجود قائدِ مرحوم نے اپنے مشن کی تکمیل میں پورے انہاک کے ساتھ مصروف رہے‘‘۔

(حوالہ : مولوی سعید سبحانی صاحب صفحہ ۷۲-۷۳ بہادر یار جنگ اہل وطن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد)

مرسمہ اصلاحات کے اعلان کے کچھ ہی عرصہ بعد دوسری عالمگیر جنگ (۱۹۳۹ء) چھڑ گئی اور مرسمہ اصلاحات کے ملتوی کئے جانے کا حکومت کی طرف سے اعلان شائع ہوگیا۔

تحریک رضا کاراں

۱۹۳۵ء

عسکری نظام کا افادی پہلو ایسی صورت میں جب کہ آریہ سماج اور دیگر ہندو تنظیمیں اکھاڑے، دنگل اور نیم فوجی تنظیمیں قائم کررہے تھے، قومی بقاء اور حفاظتِ خوداختیاری کے لئے سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ تھا۔

آریہ سماجی فتنہ سامانیوں کے دور میں نواب صاحب نے تحریک رضا کاراں کے سلسلے میں بڑی توجہ فرمائی۔ ''وہ طبعاً مسلمانوں کی عسکری تنظیم کے آرزومند اور حامی تھے''۔

(مرگِ مفاجات از غلام بھیک نیرنگ)

ویسے بھی عسکری نظام سے مسلمانوں کی بے نیازی، ان کے حال اور مستقبل میں ان کی بقاء کی ضمانت سے قاصر نظر آرہی تھی کیوں کہ چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھیں تھیں گردوں نے۔ یہ تنظیم کچھ ہی عرصے میں ایک قابل بھروسہ عسکری تنظیم کی صورت اختیار کرگئی۔ اجتماعی تحریک کی حیات کا انحصار ایسی ہی تنظیموں کے ذریعے بقاء کی ضمانت ثابت ہوتا ہے، اس خصوص میں نواب صاحب نے ارشاد فرمایا تھا :

''آپ کو معلوم ہے کہ کسی اجتماعی تحریک کے مستقبل کا تمام تر انحصار، تحریک رضا کاراں پر ہے۔ اسی جماعت سے مستقبل کے زعیم اور قائد پیدا ہوسکتے ہیں''۔ (مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۶۳)

عمارت کی مضبوطی کا اظہار اس کے نقش ونگار سے نہیں بلکہ اس کی بنیاد سے ہوتا ہے۔ آریہ سماجی تحریک مسلمانوں کی سیاست پر نزلہ بن کر ٹپکی تو مجھے ہر قسم کا جوشاندہ مسلمانوں کو پلانا پڑا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ یہ نزلہ، نزلہ ہی رہا، انفلوئرہ نہیں بن سکا۔ (خطاب ورنگل ۷/مارچ ۱۹۴۳ء

بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد)

گفتار دلیرانہ اور کردار قاہرانہ، یہی شان رضا کاری اور یہی آن رضا کاری ہے۔ (۵۲۶

سیاسی تقریریں)

''رضا کار میری اصطلاح میں اللہ کے سپاہی کو کہتے ہیں جس کو کوئی تنخواہ، کوئی امداد نہیں ملتی، جو ساری خدمت کسی دُنیاوی انعام یا کسی دُنیاوی اجر کسی دُنیاوی راحت کی توقع پر نہیں کرتا بلکہ وہ اللہ کی خاطر جیتا ہے اور اللہ کی خاطر مرتا ہے۔ گو میں اس وقت تمہارے خاکی لباس میں نہیں ہوں لیکن تم میں جو جذبہ کارفرما ہے وہی مجھ میں بھی ہے، رضا کاروں کی قوت کا انحصار جسم سے زیادہ دل پر ہے۔ دل میں ملت کے لئے صحیح تڑپ اور بے تابی پیدا کرو۔

اللہ کے سپاہی کہلانے والو! اللہ کے ہو جاؤ، تمہارا ہر قدم، تمہارا دل اور تمہاری نگاہ صرف خدا ہی کو پکارے۔ جب تک تم میں یہ جذبہ پیدا نہ ہوگا تم حقیقی رضا کار نہیں بن سکتے''۔

(۵۲۴، ۵۲۵ بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد)

نواب صاحب عسکری نظام کو تاریخ اسلام کا جزء لاینفک سمجھتے تھے، جو ایک تاریخی حقیقت ہے ''مسلمان فطرتاً سپاہی ہے اور اس کے مستقبل کی نجات اسی میں ہے کہ اس کو سپاہی برقرار رکھا جائے''۔

''ہمارے مستقبل کی ساری توقعات رضا کاروں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے سارے قائدین ان ہی میں چھپے ہوئے ہیں۔ جب تک ان میں سے کوئی صحیح آدمی پیدا نہ ہو جائے میں اپنے آپ کو عارضی لیڈر سمجھتا ہوں۔ ذہنی انقلاب کا دوسرا اقدام عملی انقلاب ہے''۔

(۵۸۰ سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد)

اس تنظیم کو اس درجہ اہمیت دی گئی کہ ۲۰ / جون ۱۹۴۰ء میں مجلس اتحاد المسلمین کی عاملہ نے قواعد و ضوابط مرتب و نافذ کئے۔ اس دستور کا نام ''دستور العمل تنظیم رضا کاراں مجلس اتحاد المسلمین مملکتِ اسلامیہ آصفیہ'' تھا۔ جو ۷۴ دفعات پر مشتمل تھا۔

رضا کار تنظیم، قائدِ ملت کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے، یہ وہی تنظیم ہے جس نے کانگریس اور ہندو فرقہ وارانہ جماعتوں کو گویا ہندو سامراج کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

اقبالؔ کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و سپر سے بھی آراستہ نہ ہو، ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مرد

غازی کی تیغ وسپر سے موانست ہے۔

من آں علم وفراست با پر کاہے نمی گیرم

کہ از تیغ وسپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اقبال کے شاہین زادے نے اسی حقیقت سے بروقت اپنی قوم کو آگاہ کیا اور للکار کر کہا۔

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے

شمشیر وسناں اول طاؤس رباب آخر

''جن اُمتوں نے ذلت ورسوائی میں بھی شمشیر وسنان سے بیگانہ ہوکر چنگ ورباب سے دوستی کی وہ دُنیا میں کسی کے لئے قابل رشک نہیں رہیں۔ کیا تم کو ان دنوں کی یاد دلانے کی ضرورت ہے جب کہ دوجہاں کے سردار اور صاحبِ لولاک خاتم النبین اور رحمۃ للعالمین اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بسر کرتے تھے۔

اس کائنات میں صرف وہی چیز دوام وبقاء حاصل کرسکتی ہے جو قوی اور توانا ہے اور قوت کا راز جمعیت وعسکریت میں پوشیدہ ہے۔کیا قرآن **واعتصمو بحبل الله جميعاً** کا درس دے کراور اکرام الٰہی کے مستحق مومن کی شان میں **يجاهدون فی سبيل الله كانهم بنيان مرصوص** کہہ کر اسی اجتماعیت وعسکریت کی تعلیم نہیں دی تھی اور کیا تاریخ نے مسلمانوں کو اپنی پیشانی پر جگہ نہ دی جب تک وہ متحد اور شمشیر بکف رہے اور کیا آج بھی دُنیا کی صرف وہی قومیں سر بلند اور سرفراز دکھائی نہیں دے رہی ہیں جنھوں نے زندگی کے اس راز کو پہچان لیا''۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد)

وقت وضرورت کے تقاضوں نے قائدِ ملت کو حربی کالج کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس اہم قومی ضرورت پر مجلس اتحاد المسلمین کے گیارھویں خطبہ صدارت منعقدہ ۲۴/ جنوری ۱۹۴۰ء میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا :

''میں خداوندانِ مکتب کو آگاہ کردینا چاہتا ہوں کہ ان شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دینا، ملت کے لئے قبر تیار کرنے کے مترادف ہے۔ جامعہ عثمانیہ ہماری اُمیدوں کا مرکز ہے، ہماری نگاہیں اس تعلیم گاہ سے فارغ ہونے والوں کے مستقبل پر لگی ہوئی ہے۔لیکن میں کبھی کبھی سوچنے

لگتا ہوں کہ اس کے عشرت انگیز اور امیرانہ ماحول سے نکل کر جو دن بہ دن **لم یخلق مثلها فی البلاد** کی شان حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو ملک و ملت کے لئے بخون و خاک غلطیدن کی رسم کس طرح ادا کر سکے گا۔ اقبالؔ علیہ الرحمۃ کی زبان میں مجھے کہنے دیجئے ؎

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازو مردِ غازی را

یہ امر مسلم ہے کہ حیدرآباد ایک وسیع اور بڑی سلطنت ہے جس کا رقبہ اور آبادی یورپ اور ایشیا کی کئی آزاد مملکتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ مسلمانانِ دکن اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں کہ حیدرآباد میں کوئی عسکری تعلیم گاہ نہیں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھے گا سچ ہے کہ :

مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

سرفروشاں دکن کی اولاد عیش طلب ہوتی جارہی ہیں، حکومت کو چاہئے کہ جلد سے جلد ملک میں ایک فوجی کالج قائم کرے۔

رضا کار تنظیم پروان چڑھتی گئی، رضا کار شعور کی اس منزل میں آ گئے کہ اذنِ الٰہی کی پکار پر دوڑے اور ان کا نعرہ ان کے جذب اندروں کا آئینہ دار تھا کہ ؎

اللہ کے لشکر کے رضا کار ہمیں ہیں
مرنے کے لئے جنگ میں تیار ہمیں ہیں

◆◆◆

خاکسار تحریک

برصغیر کا ہر باشعور شہری علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی (پیدائش ۲۵/ اگست ۱۸۸۸ء وفات ۲۷/ اگست ۱۹۶۳ء) کی شخصیت اور ان کی عالمگیر شہرت یافتہ عسکری تنظیم (خاکسار تحریک) سے متعارف رہا ہے۔ ان کی تحریک کے پس منظر میں ان کی شخصیت کے خدوخال کا مطالعہ (جوان کا ماضی تھا) بظاہر دو متضاد صورتوں سے متعارف کراتا ہے۔

علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی ۲۵/ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خان عطا محمد خاں اور دادا خان کمال الدین خاں امرتسر کے رؤسا اور بلند مرتبت شخصیتوں میں سے تھے، علامہ جمال الدین افغانی جب یہاں تشریف لاتے تو انہی کے ہاں مہمان ٹھہرتے۔ ۱۵ سال کی عمر میں بی-اے کا امتحان اعزاز سے پاس کیا۔ اگلے سال ۱۹۰۴ء میں ایم-اے (ریاضی) کے امتحان میں نہ صرف اول آئے بلکہ پنجاب یونیورسٹی کا سابقہ ریکارڈ توڑ دیا۔ روزنامہ ٹریبیون نے اس بے مثال کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

''کیا کوئی اب بھی یہ کہہ سکے گا کہ مسلمان حساب نہیں جانتے'' اس شہرۂ آفاق کامیابی پر گورنر پنجاب نے ان کے اعزاز میں پارٹی دی۔

مزید حصولِ تعلیم کے لئے عازمِ انگلستان ہوگئے، وہاں کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں داخل ہوئے۔ پہلے ہی مقابلہ جس میں سترہ کالج شریک تھے آپ سب سے اول آئے۔ اس کامیابی پر ستر پونڈ ماہوار کا وظیفہ اور ''فاؤنڈیشن اسکالر'' کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۰۹ء میں ریاضی کے ٹرائے پوز آنرز کے سہ سالہ کورس کو نہ صرف دو سال میں مکمل کیا بلکہ اول آئے اور ''رینگلر'' کا خطاب پایا۔ یونیورسٹی نے الگ ''بیچلر اسکالر'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

دو سال بعد بی-او-ایل (السنہ شرقیہ) کا ٹرائی پوز آنرز درجہ اول میں پاس کیا۔ ساتھ ہی بی-ایس-سی کی ڈگری آنرز سے حاصل کی اور اولیت کا اعزاز پایا۔ ۱۹۱۲ء میں انجینئرنگ کے سب

سے بڑے امتحان ریکنیکل ٹرائی پوز میں شریک ہوئے اور آنرز سے ڈگری حاصل کی۔

ان بے مثال اور مسلسل کامیابیوں نے ساری علمی دُنیا میں آپ کی عظمت اور برتری کا سکہ بٹھا دیا۔ انگلستان کے چوٹی کے اخبارات نے ان کی شہرۂ آفاق علمی فتوحات پر دل کھول کر نذرِ تحسین پیش کی۔

ڈیلی مرر نے لکھا۔ ''امسال کیمبرج میں عنایت اللہ خان نے بیک وقت دو ٹرائی پوز آنرز میں کامیابی کا غیر معمولی اعزاز حاصل کیا جو آج تک کسی نے حاصل نہیں کیا تھا''۔

ڈیلی کرانیکل نے خراجِ تحسین پیش کیا کہ میکینیکل سائنس ٹرائی پوز کا نتیجہ جو کل شائع ہوا عنایت اللہ کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر قابلِ لحاظ ہے۔

دُنیا بھر کی قوموں میں عنایت اللہ خاں پہلا شخص ہے جس نے چوٹی کے یہ چار اعزاز حاصل کیے۔ (ڈیلی سٹار، لندن)

اس وقت یہ بات ناممکن خیال کی جاتی تھی کہ پانچ سال کی مدت میں کوئی شخص چار مختلف اعزاز حاصل کر سکے گا۔

لیکن یہ سہرا ہندوستان کے سر ہے کہ عنایت اللہ خان نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

(ویسٹ منسٹر گزٹ)

ملک میں واپسی پر ان کا نام طول و عرض میں گونج رہا تھا، انھیں مختلف گوشوں سے بڑے بڑے ممتاز عہدوں کی پیش کش ہوئی لیکن بڑی سوچ بچار کے بعد وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں شامل ہو گئے اور انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا جیسے بلند عہدوں پر فائز رہے۔

۱۹۲۴ء میں آپ کی شہرۂ آفاق کتاب تذکرہ منظر عام پر آئی اور اس علمی شاہکار کی وساطت سے ۱۹۲۶ء میں علامہ صاحب کو مؤتمر خلافت قاہرہ میں شیخ الاسلام کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی، عالم اسلام کی اس تاریخی مؤتمر میں علامہ صاحب نے عربی زبان میں جو خطاب فرمایا۔ خطابِ مصر کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی طالب علمانہ زندگی ایسے اعلیٰ اعزازات تعلیمی کی حامل رہی اور علمی دُنیا میں جس کی علمی فتوحات نے تنقیدی دُنیا کے کان کھڑے کر دیئے۔ جس کی زندگی کا بڑا حصہ ''انڈر سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا'' کے اعلیٰ

عہدے کے فرائض کی انجام دہی میں صرف ہوا وہ شخص کن محرکات کی بناء پر اپنے آرام کی زندگی کو خیر باد کر کے پہلے خود سپاہی بنا، پھر عسکری تنظیم کی قیادت سنبھالی جو خاکسار تحریک کے نام سے ۱۹۳۱ء میں پہلی بار عوام میں متعارف ہوئی۔ خاکسار تحریک کے بانی نے اپنی امیرانہ زندگی کو ترک کر کے خاکی لباس پہنا، بازو پر ''اُخوت'' کی پٹی لگالی، بیلچہ تھاما اور اپنے خدمتی پروگرام کا اعلان کیا ''پس دو لفظوں میں خاکسار تحریک کا پہلا اور آخری مقصد تیرہ سو برس کے بعد پھر خدا اور اسلام کے سپاہی بننا ہے''۔

''اس کے بنیادی اُصولوں میں ۱) اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی ۲) سالار کی مکمل اطاعت ۳) مخلوق کی خدمت ۴) اور سپاہیانہ زندگی'' دیکھتے ہی دیکھتے جذبہ جہاد سے سرشار، کیا بوڑھے کیا جوان، سب ہی اس عسکری تنظیم کو اپنانے لگے اور ہندوستان کے ہر گوشے میں خاکسار شاہراہوں پر

بیلچہ بردار بن، قوم کا سردار بن
تیز چلے خاکسار ، خاکستری

کے نغموں کو جذبوں میں بدلتے گئے۔

خاکسار تحریک، بلاشبہ مسلمانانِ ہند کی واحد عسکری تنظیم تھی جو ہر اعتبار سے منظّم تھی، نظم، جذبہ ایثار و قربانی اور للّٰہیت سے خاکسار مالا مال تھے۔ ان کے اجتماع روح فرسا مناظر پیش کرتے، اطاعتِ امیر کے مظاہرے اپنا جواب آپ تھے۔ دس سال کے اندر اندر اس تحریک نے اپنا لوہا منوالیا، تحریک خاکساراں کے عروج کی یہ مختصر تاریخ ہے۔ قائدِ ملت، علامہ مشرقی کی شہرۂ آفاق کتاب ''تذکرہ'' نواب صاحب سے ان کے غائبانہ تعارف کا وسیلہ بنا، اخبارات کے ذریعے نواب صاحب تحریک اور بانیٔ تحریک سے متعارف اور متاثر تھے، چوں کہ نواب صاحب حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں مسلمانوں کی عسکری تنظیم کو ازبس ضروری تصور فرماتے تھے۔

حسن اتفاق سے ڈسمبر ۱۹۳۵ء میں جب علامہ مشرقی حیدرآباد آئے تو ان کا چار دن کا قیام بیت الامت میں رہا۔ غالب گمان یہ ہے کہ نواب صاحب ۱۹۳۵ء ہی میں اس تحریک سے وابستہ ہوئے، تحریک کے ہر اجتماع میں شریک ہوتے رہے اور ان کے اثر سے جماعت کو کافی

ترقی ہوئی، علامہ صاحب نے ان کی وجاہت اور تقریری ملکہ کو دیکھ کر پورے جنوبی ہند کی کمان ان کے سپرد کرنا چاہی مگر اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کی مصروفیات نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی صرف خاکسار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

علامہ مشرقی کو قائدِ ملت کی بے پناہ صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ تھا وہ نواب صاحب سے بے حد متاثر تھے اور ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ نواب صاحب ساری جماعتوں سے کٹ کر صرف اور صرف خاکسار تحریک کی ذمہ داری کو سنبھالیں، مگر نواب صاحب کے لئے یہ ناممکن تھا، نسبت پیمانہ بھی اس تحریک سے وابستگی غنیمت تھی۔ تحریر فرماتے ہیں :

''آپ سے بہت توقعات وابستہ ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس زمانہ کے عمرؓ کی جھلک آپ میں دکھائی دے رہی ہے''۔ (علامہ مشرقی کے خط سے)

(حوالہ : خاکسار تحریک کا المشرقی خصوصی نمبر گسٹ ۱۹۸۲ء خط مؤرخہ ۸ /اگست ۱۹۳۶ء)

قائدِ ملت کا تعلق خاکسار تحریک سے اس لئے تھا کہ وہ مسلمانوں کی عسکری تنظیم کے خود بھی آرزومند تھے اسی لئے انھوں نے اس تحریک کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا۔ آریہ سماج راشٹریہ سیوک سنگھ ہندومہاسبھا کی جارحانہ فرقہ پرستی نے پرامن فضا کو مسموم کردیا تھا، شولاپور اور بمبئی کی سرحدوں سے دکن کی طرف بھی اس زہریلی ہوا نے اپنا رُخ کیا، دکن کی سرزمین جو ہندو مسلم اتحاد کا گہوارہ سمجھی جاتی تھی، اس پرامن سرزمین کو بھی اشرار نے فسادات اور نقص امن کے ذریعے میدانِ جنگ میں متبدل کردیا تھا۔ ایسی صورت میں خاکسار تحریک، مخالفین کے حوصلوں کو پست کرنے میں کارگر ہتھیار ثابت ہوئی ——— نواب صاحب نے اس نقطۂ نظر سے بھی خاکسار تحریک کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اس تحریک کو پروان چڑھانے میں ان کی عظیم شخصیت اور ان کی بے پناہ تقریری و تنظیمی صلاحیتوں کو بڑا دخل رہا۔ عسکری نظام کے تعلق سے نواب صاحب نے اپنی بصیرت افروز تقریروں کے ذریعے، ایسا شعور بیدار کیا کہ مسلمان اس جانب متوجہ ہوئے اور عسکری تنظیم پروان چڑھی ''مسلمان کی زندگی کا نمایاں پہلو اس کی عسکریت اور سپاہیت ہے، جس حیاتِ مقدس کو کائناتِ ارضی کے سارے انسانوں کے لئے نمونہ بنایا گیا۔ اس پر اگر آپ کی نظر ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ارشاد و ہدایت کے عظیم الشان فرائض کی بجا آوری

کے ساتھ ساتھ جو پہلو اس حیاتِ طیبہ میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ آقائے دو جہاں کی عسکریت ہے۔ ہر مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لئے خدا کی فوج کا ایک سپاہی ہے اور اگر عہدِ حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف غفلت برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول کی پیروی سے غفلت برت رہے ہیں۔ آقائے دو جہاں کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار، نہ لونڈیاں تھیں نہ غلام، نہ املاک تھے نہ تجارت لیکن امہات المؤمنین کے تنگ حجرے اگر آپ کے کسی اثاثہ اور متروکہ سے بھرے ہوئے تھے تو وہ آپ کی تلواریں، آپ کی زرہیں، آپ کے قود اور آپ کی کمانیں تھیں۔ میں مسلمانوں کو اُسوۂ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطورِ خاص متوجہ کرتا ہوں۔ میں ان کے ہر ایک فرزند کو خالدؓ اور ابو عبیدہؓ کا غلام دیکھنا چاہتا ہوں''۔ (حوالہ : خطبات قائدِ ملت ۱۷۷-۱۷۸)

وہ اسلام کی تاریخ کے عسکری پہلو پر جب روشنی ڈالتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی روح للکار رہی ہے۔

''جن قوموں نے اس رازِ حیات اور سرِ زندگی کو پہچانا ان کی رفعت و مرتبت کا پہچاننا دُنیا والوں کے لئے مشکل ہو گیا لیکن جن اُمتوں نے عالم ذلت و رسوائی میں بھی شمشیر و سنان سے بیگانہ ہو کر چنگ و رباب سے دوستی کی وہ دُنیا میں کسی کے لئے قابل رشک نہیں ہیں۔ کیا تم کو ان دنوں کے یاد دلانے کی ضرورت ہے جب کہ دو جہاں کے سردار اور صاحبِ لولاک، خاتم النبین اور رحمۃ للعالمینؐ اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بسر کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپؐ کے قدومِ مبارک متورم ہو جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی جب کہ فاروق اعظم میدانِ جنگ سے آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینہ سے میلوں دور نکل جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا جب کہ دُنیا سے چھوٹے بڑے امیر و غریب اور عرب و عجم کا فرق مٹانے والا کفر و ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعہ حدِ فاصل کھینچ رہا تھا اور اس کے شکم اطہر پر پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اگر یہ سب تم کو یاد ہے تو پھر مجھے تمہاری اس زحمت پر اظہارِ تاسف و ہمدردی کی ضرورت نہیں جو تم نے برسوں سے یہاں برداشت کی ہے۔ زحمت ناآشنائی اور محنت ناشناسی ہی تو ہماری اس نکبت و ذلت کی ذمہ دار ہے جس کو محسوس کر کے پھر ایک مرتبہ ہم آمادۂ عمل نظر آتے ہیں۔ خدا ہمارے ارادوں میں برکت اور ہمتوں میں بلندی عطا کرے اور

جانتے ہیں کہ اس کائنات میں صرف وہی قوم دوام و بقاء حاصل کر سکتی ہے جو قوی اور توانا ہے اور قوت کا راز جمعیت وعسکریت میں پوشیدہ ہے۔ کیا قرآن نے **واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً** کا درس دے کر اکرام الٰہی کے مستحق مومن کی شان میں **یجاھدون فی سبیل اللہ کانھم بنیان مرصوص** کہہ کر اسی اجتماعیت وعسکریت کی تعلیم نہیں دی تھی اور کیا تاریخ نے مسلمانوں کو اپنی پیشانی پر جگہ نہ دی جب تک وہ متحد اور شمشیر بکف رہے اور کیا آج بھی دُنیا کی صرف وہی قومیں سر بلند اور سرفراز دکھائی نہیں دے رہی ہیں جنھوں نے زندگی کے اس راز کو پہچان لیا۔

خاکسار تحریک سے نواب بہادر یار جنگ کی دلچسپیوں کا سلسلہ ۳۹ء تک زیرلب اختلافات کے باوجود برقرار رہا لیکن حاسدین اور خود علامہ مشرقی کی اس کوشش کے خلاف کے نواب صاحب کا مجلس اتحاد المسلمین سے تعلق برقرار نہ رہے، اس مسئلہ پر سخت اختلاف پیدا ہوا، علامہ مشرقی دوسرے دروازے سے نواب صاحب کو ناظم اعلیٰ صوبہ سرحد پھر ناظم مولیان ہند بنا کر مجلس سے ان کو بے تعلق کرنے کی کوشش کرتے رہے اور علامہ مشرقی کا یہ فرمان جاری ہوا کہ کوئی خاکسار کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لے''۔

مخفی مباد بعض اصحاب کا خیال ہے کہ قائدِ ملت کو خاکسار تحریک سے اختلاف قائدِ اعظم پر حملہ کے بعد سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ غلط ہے، قائدِ ملت کو خاکسار تحریک سے اختلاف اس سے پانچ سال پہلے پیدا ہو چکا تھا اور عملی طور پر انھوں نے اس میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا۔

''سالار اکبر نے عملی سیاسیات سے متعلق جو اُلجھن پیدا کر دی ہے، تحریک سے علاحدگی کا اعلان کر دیا تھا اور پریس کو دینے والا تھا کہ سالار اکبر نے مجھ سے لے لیا کہ علامہ صاحب کو نقل بھیج کر مشورہ کر لیں گے۔ (۳/ جولائی ۱۹۳۶ء قلمی مسودہ)

(یہ اعلان اخبارت کو دینا روک کر اس کی نقل علامہ صاحب کے پاس روانہ کی گئی)

(بہادر ۲۰/ ستمبر ۴۸ف)

علامہ مشرقی نے محسوس کیا وار خالی جا رہا ہے بات کو آئی گئی کر دیا گیا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں جب خاکسار تحریک پر برا وقت آن پڑا اور حدود پنجاب میں خاکسار کے ذمہ دار عہدہ داروں کی دارو گیر شروع ہوئی تو نواب صاحب اس وقت مسلم لیگ کے اجلاس

میں شرکت کی غرض سے لاہور پہنچنے کا عزم کرلیا پھر سارے قضیہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی خوبی کے ساتھ میرٹھ کانفرنس کے انعقاد تک خاکساروں پر قابو پالیا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں خاکساروں کی ناعاقبت اندیشی اور قیادت کی غلط رہنمائی نے انھیں جن مصائب سے دوچار کیا، اس قیامت صغریٰ میں جب کہ لاتعداد خاکساروں کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور جیلوں کو ان سے بھر دیا گیا۔ اس نازک وقت میں علامہ مشرقی کو قائدِ اعظم کی یاد آئی ۔

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

اس مسئلہ میں قائدِ ملت کی وساطت ضروری تھی، یہ وہ وقت تھا جب کہ لاہور میں مسلم لیگ کا اہم اجلاس منعقد ہونے والا تھا جس میں '' قرارداد پاکستان'' منظور کی جانے والی تھی اور خاکساروں کے خلاف حکومت کی مہم پورے شباب پر تھی۔ کرفیو کا نفاذ ہو گیا تھا، نواب صاحب کی سعی اور قائدِ اعظم کی فراست سے لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی منعقد ہوا اور تحریکِ پاکستان بھی منظور ہوئی مگر اس خصوص میں قائدِ ملت کو جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کی روئیداد اجلاس لاہور کے باب میں شامل ہے۔ قائدِ اعظم، علامہ مشرقی کو پوری طرح جان گئے تھے، ان کی سیاسی ناعاقبت اندیشی، مسلم لیگ اور خود قائدِ اعظم سے ان کی نفرت سے وہ پوری طرح باخبر تھے، لیکن اس کے باوجود قائدِ ملت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ علامہ مشرقی اور خاکسار تحریک کے تعلق سے قائدِ اعظم کے دل میں نرم گوشہ پیدا کیا جائے، قائدِ ملت کی کوشش یہ تھی کہ خاکسار تحریک مسلم لیگ کا دست و بازو ثابت ہو، قائدِ اعظم کی سیاسی بصیرت کی روشنی میں یہ جماعت، ایک بامقصد جماعت (مسلم لیگ) سے الحاق پیدا کر کے، متحرک ذرے (مسلم لیگ) سے مل کر خاکسار تحریک متحرک ہو جائے۔ اس طرح اس تحریک اور طاقت کو مقصد ملے، کیوں کہ اب تک اس تنظیم کا مقصد غیر متعین تھا۔

دوسری ملاقات

۲۰/مارچ ۱۹۴۰ء کی صبح ۹ بجے دہلی میں مجھے دوسری مرتبہ ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹/مارچ کی شام لاہور میں خاکساروں پر گولی چلی، دو دن بعد لاہور میں آل

انڈیا مسلم لیگ کا وہ اجلاس ہونے والا تھا جس میں تجویز پاکستان منظور ہوئی، خاکساروں اور پولیس کے تصادم نے بڑے تشویشناک حالات پیدا کردیئے تھے۔ نواب صاحب بھی اس روز دہلی میں مقیم تھے، میں ۱۹/مارچ کی شام کو علامہ مشرقی اور قائدِ اعظم سے ملا تھا، علامہ مشرقی نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں مسٹر جناح تک ان کی یہ خواہش پہنچادوں کہ وہ پنجاب گورنمنٹ اور خاکساروں میں سمجھوتہ کرادیں، میں نے جب مسٹر جناح کو ان کا پیغام پہنچایا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ ان سے جا کر کہہ دیں کہ مسلم لیگ کے اجلاس کے دوران میں وہ امن قائم رکھیں اور کوئی ایجی ٹیشن نہ کریں۔ ساتھ ہی چلتے وقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ صبح کو نواب بہادر یار جنگ دس بجے مجھ سے ملنے آرہے ہیں، اس سے قبل ان کو ساتھ لے کر علامہ صاحب سے ملنا اور جو جواب دیں وہ مجھے صبح بتا دینا گویا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ صبح کو جب نواب صاحب تشریف لائیں تو میں بھی ان کے ساتھ جاؤں، میں اسی وقت تقریباً ساڑھے دس بجے شب قرول باغ گیا تو علامہ صاحب کسی خفیہ جگہ روپوش ہو چکے تھے اور میرے آنے کے تھوڑی دیر بعد گرفتار ہو گئے۔ علی الصبح میں نواب صاحب کے پاس کرونیشن ہوٹل گیا اور رات کی دونوں ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ نواب صاحب پریشان تھے لیکن طبیعت کی شگفتگی اور ذہنی انشراح کی وہی کیفیت تھی، نجی گفتگو میں بھی بات بات پر پھلجھڑیاں کھلاتے تھے، ٹیکسی منگائی، مجھے ساتھ لیا پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس گئے پھر قرول باغ گئے اور خاکساروں کے سالار سے ملے جو اس وقت تک گرفتار نہ ہوئے تھے۔ ان کو ہدایت کی کہ ''لاہور میں محاذ کا جو انچارج ہے اس کے پاس فوراً یہ پیغام بھیج دیں کہ جیسے ہی میں لاہور پہنچوں مجھ سے آکر معہ دیگر اصحاب شوریٰ ملیں''۔

وہاں سے سیدھے قائدِ اعظم کے بنگلہ پر پہنچے، قائدِ اعظم ایک منٹ کے بعد ہی خود باہر تشریف لے آئے اور نہایت بے تکلفی اور تپاک سے نواب صاحب سے ملے اور اپنے ساتھ ہم دونوں کو دار المطالعہ میں لے گئے۔

خاکسار تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش

نواب صاحب خود کو مسٹر جناح کا سیاسی شاگرد سمجھتے تھے اور بہت ہی ادب کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی لفظ ان کی طبیعت پر گراں نہ گذرے پھر بھی اپنی

گفتگو کے انداز اور ظرافت آمیز جملوں سے خود بھی ہنستے اور قائدِاعظم کو بھی ہنساتے۔خود قائدِاعظم بھی ان سے جس طرح کھل کر بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے شاید کسی اور سے نہ کرتے تھے، نواب صاحب کی گفتگو کا زیادہ زور خاکسار تحریک کی افادیت پر تھا، ان کو یہ فکر تھی کہ کہیں قائدِاعظم علامہ مشرقی کی غلطیوں کی بناء پر تحریک کے مخالف نہ ہو جائیں۔انھوں نے کافی دیر تک تبلیغی انداز میں اس تحریک کی موافقت میں لیکچر دیا لیکن ہر دفعہ قائدِاعظم نے محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کلام کو قطع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ مجھے تحریک سے کوئی اختلاف نہیں لیکن جس طرح اس کو گذشتہ ایک سال سے چلایا جا رہا ہے اس کا شدید مخالف ہوں۔نواب صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا :

''مسٹر جناح میری کوشش اب تک یہ رہی ہے کہ مسلم لیگ کا دماغ اور خاکساروں کی قوتِ عمل آپس میں مربوط ہو کر ایک ناقابل شکست قوت بن جائیں اور میں اب تک مایوس نہیں ہوا ہوں، میں خاکسار تحریک کو بچانا چاہتا ہوں اور مجھے آپ کی مدد کے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی''۔

قائدِاعظم نے فوراً جواب دیا :

''نواب صاحب مجھے آپ سے ہمدردی ہے، میں نے آپ کو ہمیشہ مسلم لیگ کا دوست اور مسلم سیاست کا ایک مفید ستون سمجھا ہے لیکن یہ آپ کی خام خیالی ہے، آپ نہیں جانتے کہ مشرقی گمراہ قوت عمل کا پیکر ہیں۔ میں نے خود اس امر کی کوشش کی کہ خاکسار تحریک مسلم لیگ کا فوجی بازو بن جائے اور مشرقی بحیثیت سالار تحریک ہماری تنظیم کے ماتحت اس کو چلاتے رہیں، صلح و جنگ کرنے کا اختیار مسلم لیگ کو ہو پھر اگر کوئی طاقت اس جماعت پر حملہ کرنے کی نیت کرے تو ہم پوری طاقت سے اس کی مدافعت کریں، لیکن مشرقی نے اطاعت کورانہ اور تقلید محض کا جو جذبہ اپنے پیروؤں میں پیدا کیا ہے وہ کسی دوسری جماعت کے ساتھ تحریک کو وابستہ نہ ہونے دے گی، مجھے خطرہ ہے یو۔پی میں شیعہ سنی تحریک میں اُلجھ کر اور پنجاب گورنمنٹ کے خلاف غیر آئینی اقدام کر کے مشرقی نے اپنے آپ کو اور اپنی تحریک کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ اب اس کے بقاء اور ارتقاء کی کوئی اُمید نہیں پھر بھی اگر یہ لوگ اپنا طرزِ عمل بدل لیں اور ہماری ہدایت کے مطابق کام کریں تو شاید کچھ دنوں میں حالات معمول پر آجائیں لیکن فوری طور سے ناممکن ہے''۔

علامہ مشرقی کو قائدِ اعظم اور مسلم لیگ سے دلی نفرت تھی، شاید اس کی بڑی وجہ مسلم لیگ کی مسلمانانِ ہند میں مقبولیت اور قائدِ اعظم کی ہر دل عزیزی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمہ حیثیت و شہرت تھی، علامہ مشرقی کا ذہن سیاسی سطح پر کسی بات کو سوچنے کے قابل نہ تھا، کنج تنہائی اور علم کی زیادتی نے انھیں ہمہ دانی کے دھوکے میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاکسار قائد کی حیثیت سے ان کی شہرت نے انھیں خود فریبی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر کسی انسان کو اس کے ظرف سے زیادہ نعمت عطا ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ ان کی راہ میں سب سے اہم رکاوٹ قائدِ اعظم کی ذات تھی۔ ۱۹۴۳ء میں علامہ مشرقی کی ایماء پر رفیق صابر نامی شخص نے قائدِ اعظم پر بمبئی میں قاتلانہ حملہ کیا لیکن قائدِ اعظم بال بال بچ گئے، سارے عالم کے مسلمانوں نے دوسرے دن اخبارات میں جب یہ خبر پڑھی تو دم بخود رہ گئے، علامہ مشرقی سیاسی حیثیت سے اس حادثے کے بعد اپنی موت آپ مر گئے، خاکسار تحریک دم توڑنے لگی۔

۱۱/ نومبر ۱۹۴۳ء کو نواب صاحب نے علامہ مشرقی کو اپنے خط کے ذریعے مطلع فرما دیا کہ اب ان کا خاکسار تحریک سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے، نواب صاحب نے بڑے سخت الفاظ میں یہ خط تحریر فرمایا :

"خاکسار تحریک کے بنیادی اُصولوں سے کامل اتفاق کے باوجود مجھے اب آپ کی قیادت اور صلاحیت قیادت پر قطعاً اعتماد نہیں رہا ہے، اس لئے میں اس تحریک سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کرتا ہوں"۔ (حوالہ : مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول صفحہ ۴۹۸ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

لاہور کے محاذ پر خاکساروں نے سر سکندر کی حکومت کے خلاف جب ہلہ بول دیا تو قائدِ ملت نے خاکساروں کے بڑھتے ہوئے جوش کو قابو میں لے کر مسلمانانِ ہند کی گراں قدر خدمت انجام دی لیکن چند ہی سال بعد اس تحریک نے مرکز گریز رنگ اختیار کرنا شروع کیا بہادر خاں نے اس غلطی کو فوراً پہچان لیا اور خاکسار تحریک و مسلم لیگ میں مفاہمت کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب ہو جاتی، اگر قائد تحریک نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کے خلاف سیاسیات کے میدان میں اپنے گھوڑے دوڑانے شروع نہ کئے ہوتے، علامہ مشرقی نے مدراس جیل سے رہا ہونے کے بعد سیاسیات میں راست حصہ لینا شروع کر دیا اور خاکسار تحریک کو جو ایک خالص عسکری تنظیم تھی،

سیاسی تحریک کا رنگ دے دیا۔

''یہ ضروری تو نہیں کہ کوئی بڑا آدمی آخر تک بڑا ہی رہے'' وہ چھوٹے ہوئے اور اتنے چھوٹے ہوئے کہ چھوٹے بھی انھیں چھوٹا ہی سمجھتے رہے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

◆◆◆

مؤتمر مسلم نوجوانانِ حیدرآباد دکن

۱۹۳۷ء

پر جوش نوجوانانِ دکن جو قائدِ ملت کی قیادت کے ثمرات سے مذہبی و سیاسی شعور کی دولت سے مالا مال تھے۔ ۱۹۳۷ء میں حسبِ ذیل ۵ اغراض و مقاصد پر مشتمل ''مؤتمر مسلم نوجوانانِ حیدرآباد'' کے نام سے ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی۔

الف) کوشش کرنا کہ تمام فرقہ ہائے اسلام کے نوجوان آپس میں متحد العمل رہیں اور ایک دوسرے کے فرقوں کے عقائد کا احترام کریں۔

ب) فرمان روائے دولت آصفیہ سے غیر متزلزل وفاداری اپنا شعار سمجھیں اور ملک کی ہر جہتی ترقی میں حصہ لیں۔

ج) قرآن کریم کی تعلیم سے کماحقہ استفادہ کریں اور تعلیماتِ اسلام کی پابندی کریں۔

د) دوسرے فرقوں کے نوجوانوں سے تہذیبی موالات پیدا کریں اور مشترکہ اُمور میں تعاون عمل کریں۔

مولوی ابوالبیان خواجہ بہاؤ الدین صاحب اس ادارے کے صدر اور مولوی لئیق احمد نعمانی معتمد مقرر ہوئے۔

اس ادارے نے مذہبی اور سیاسی اُمور میں نوجوانوں کی مثالی خدمت اور ان جلسوں کی آمدنی مجلس اتحاد المسلمین کے حوالے کی۔ ان کی جوش و جذبہ اور کام سے قائدِ ملت بے حد خوش ہوئے، مؤتمر کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے قائدِ ملت نے ارشاد فرمایا تھا :

'' حیدرآباد میں ایک مذہبی جلسہ کی حیثیت سے آپ نے جو کیفیت پیدا کی وہ قابل استحسان ہے، مسلم نوجوانانِ دکن ایک دھمکتا ہوا انگارہ ہیں، گو زمانہ کے حوادث کی راکھ اس پر پڑ گئی لیکن اس کے لئے ایک پھونک کافی ہے''۔

بہر حال اراکین مؤتمر میلادی کانفرنس منعقد کر کے ایک اچھی مثال قائم کی، مجلس ان کی محنتوں اور دلچسپیوں کے شکر گذار ہے کیوں کہ آئندہ بھی وہ مجلس اتحاد المسلمین کے معاون ہوں گے"۔ (حوالہ : بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر مرتبہ نذیرالدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدرآباد صفحہ ۴۳۳، ۴۳۴ ۲۳/جون ۱۹۳۹ء)

مؤتمر مسلم نوجوانانِ دکن کی میلاد کانفرنس اور میلادی جلسے اتنے مقبول ہوئے کہ دارالسلام کے وسیع میدان میں ان جلسوں کا انعقاد عمل میں آنے لگا اور ان جلسوں کی صدارت قائدِ ملت نے فرمائی۔

تیسرے سالانہ مؤتمر میلادی کی افتتاحی تقریر میں قائدِ ملت نے مؤتمر کے ذمہ دار کارکنوں کی جس الفاظ میں ستائش فرمائی وہ ان نوجوانوں کی سچی لگن اور ملت کی خدمت گذاری پر نواب صاحب کی عطا کردہ سندِ پسند ہے۔ "یہ نوجوان ملک کے بہترین فرزندوں میں سے چند نوجوان ہیں، جن کے مستقبل پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اگر انھوں نے تواتر و تسلسل سے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا تو قوم کی خدمات بہترین طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ (تقریر ۳/ مئی ۱۹۴۲ء دارالسلام)

میلاد النبیؐ کے ان یادگار جلسوں میں قائدِ ملت کی روح پر تقریریں حیاتِ پاک سے سرمایۂ فراہم کرتی رہیں اور ان نوجوانوں کی جانب سے منعقدہ میلادی جلسے آج بھی ایک یادگار باب کی حیثیت کے حامل ہیں۔

◆◆◆

ڈھول پیٹ کا فساد

۱۹۳۸ء

برطانوی ہند کے بحرِ سیاست سے جو لہریں اُٹھتیں وہ یوں تو بالعموم حیدرآباد کی خاموش سطح سے ٹکرا کر لوٹ جایا کرتی تھیں ۔لیکن ۱۹۳۸ء میں ان لہروں نے اپنے سارے خس و خاشاک ، غلاظت و گندگی کو حیدرآباد کے ساحل پر لا کر ڈال دیا تھا اور اس گندگی وعفونت نے فضاء کو اس قدر مسموم کر دیا کہ بالآخر ڈھول پیٹ کا فساد پھوٹ پڑا اور آئندہ چل کر یہی فساد حیدرآباد کے جسدِ سیاسی کا ناسور بن گیا۔اس نے دکن کی روایتی رواداری کا جنازہ نکالا اور فرقہ وارانہ بھائی چارے کو دیکھتے ہی دیکھتے چتا پر جلا دیا۔(حوالہ : ہمارا قائد از محترم مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۲۹)

حیدرآباد میں سیاسی منصوبہ بندی کے تحت فرقہ وارانہ فضاء ہموار کی گئی ،آریہ سماجیوں نے اس خصوص میں بیرونی امداد بھی حاصل کی ۔''ڈھول پیٹ'' کو اس خصوص میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ، کچھ مسلم نوجوان عدم واقفیت کے باعث فساد زدہ علاقہ میں چلے گئے ، وہاں کی گلیوں سے وہ ناواقف تھے ،ان پر حملہ ہوا، کچھ جان بچا کر زخمی حالت میں واپس ہو سکے مگر چنچل گوڑہ کے دو مہدوی نوجوان جاں بحق ہو گئے ،ان دونوں جوانوں میں ایک نواز خاں تھا اور دوسرا نوجوان سید زادہ اللہ بندہ میاں ، جو ڈھول پیٹ کی تنگ و تاریک گلیوں میں نہتے ہاتھوں ، بے کسی اور بے بسی کے عالم میں جامِ شہادت سے ہمکنار ہو گیا۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح لمحوں میں عام ہو گئی ،سارا شہر ہراساں و سراسیمگی کے عالم میں ڈوب گیا۔مسلمانانِ حیدرآباد کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی ۔قریب تھا کہ برسوں کی پرانی رواداری اور ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

حکومت صورتِ حال سے پوری طرح واقف تھی اور یہ حادثہ حیدرآباد میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔سر اکبر حیدری صدر اعظم تھے اور ٹی جے ٹاسکر وزیر داخلہ،حکومت عاجز و سراسمہ تھی۔

اس حادثہ کا پس منظر آریہ سماجی یورش کا نتیجہ تھا اور اس یورش کا نتیجہ اس خونِ ناحق کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

ڈھول پیٹ (حیدرآباد دکن کا ایک محلّہ) کے فسادات کا زمانہ ہے۔ آریہ سماجی یورش اپنے پورے شباب پر ہے، مسلمان بچوں کو پھلوں اور بسکٹوں میں زہر دیا جا رہا ہے، مسجدوں میں بم رکھے جا رہے ہیں، راہ چلتوں پر پیچھے سے حملے ہو رہے ہیں، بالا خانوں سے مسلمانوں پر تیزاب پھینکا جا رہا ہے۔ مجلس اتحادالمسلمین اس صورتِ حال سے نمٹنے میں لگی ہوئی ہے۔ اتنے میں اطلاع آئی کہ دونو جوانوں کو ہندوؤں نے ایک گلی میں گھیر کر مار دیا۔ مسلمانوں کے جذبات پہلے سے ہی مشتعل تھے۔ بڑا، بچہ ہر ایک سر سے کفن باندھے بیت الامت کی طرف چلا۔ حیدرآباد کے ایک گنجان کاروباری محلے (بیگم بازار) میں بہادر یار جنگ کی یہ رہائش گاہ تھی۔ کاروبار چوں کہ عام طور پر حیدرآباد میں ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا اس لئے یہ محلّہ تو سارے کا سارا ہندوؤں سے پٹا پڑا تھا، مسلمانوں کا ریلا جو بیت الامت کی طرف چلا تو دیکھتے دیکھتے ساری دُکانیں بند ہو گئیں، سب کے ہوش اُڑے تھے، سمجھتے تھے کہ موت دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہے، مسلمان آج کسی کو بخشیں گے نہیں، بیگم بازار کی سڑکوں پر بڑھتے ہوئے مجمع کا شور، اللہ اکبر کی صدائیں اور جوش وخروش سے دل دہلے جا رہے تھے۔ ہندو سمجھ رہے تھے کہ بس کچھ دیر اور پھر ——— ! سر اکبر حیدری وزیرِاعظم، نواب رحمت یار جنگ کوتوال شہر (انسپکٹر جنرل پولیس)، مسٹر ٹاسکر وزیر داخلہ ہر قیمت پر اس صورتِ حال کو قابو میں لانا چاہتے تھے لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ محفوظ پولیس کے جوان بلائے گئے تھے۔ ایک طرف مسلح دستہ تیار کھڑا تھا لیکن سب سمجھتے تھے کہ تمام طاقت کے باوجود آج کی صورتِ حال سے نمٹنا حکومت کے بس کی بات نہیں، خدا ہی خیر کرے۔

ہندو مہا سبھا اور کانگریس کے لیڈر جو اندر ہی اندر بیٹھے بھس میں چنگاری ڈال کر تماشا دیکھ رہے تھے بری طرح گھبرائے ہوئے تھے کیوں کہ سمجھتے تھے کہ مظلوم کا خون ضائع نہیں ہوتا۔ آج مسلمان خونِ ناحق کا بدلہ لینے اُٹھے ہیں ضرور اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

حیدرآباد میں مسز نائیڈو کا ہندو عوام کے ساتھ ساتھ حکومت پر بھی خاص اثر تھا۔ حیدری صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے، حضور نظام سے وہ دوستوں کی طرح ملتی تھیں۔ مسلمان بھی

ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بہادر یار جنگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ماں کہہ کر پکارا کرتے تھے وہ بھی بیت الامت پہنچ گئیں۔ خیال تھا وہ کوئی صورت نکال لیں گی اور سارا قضیہ نبٹ جائے گا لیکن ان کے لئے نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن کا مضمون تھا۔

بیت الامت کے بالا خانے پر نواب صاحب کا دیوان خانہ خاص خاص لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وسیع وعریض کمرے میں ایک طرف کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی تھیں، ایک طرف صوفہ بیڈ پڑا تھا۔ درمیان میں ایک بڑے سے قالین کے گرد بید کی کرسیوں اور صوفوں پر دوست دُشمن سبھی بیٹھے تھے، عوام خواص، عہدہ دار، ایک سرے پر نواب صاحب تھے ایک طرف تازہ دم کیا ہوا حقہ اور پانوں کی ڈبیہ پڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک چھوٹے سے خوبصورت اسٹول پر ٹیلیفون رکھا تھا۔ گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا، مسز نائیڈو گم سم بیٹھی ہوئی تھیں، اتحاد المسلمین کے رضا کار چوکسی کرتے پھر رہے تھے، بالا خانے کی سیڑھیوں پر بار بار عوام چڑھ دوڑتے تھے، رضا کار دروازے میں ڈٹے ہوئے انھیں روک رہے تھے، دیوان خانے میں جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی

نواب صاحب سے ہر کوئی سرگوشی میں بات کررہا تھا۔ مسز نائیڈو کچھ کہہ رہی تھیں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ نواب رحمت یار جنگ نے جو پاس ہی بیٹھے تھے ٹیلیفون اُٹھایا اور جلدی سے نواب صاحب کی طرف بڑھایا—— ''کنگ کوٹھی سے بات ہورہی تھی اعلیٰ حضرت بہ نفس نفیس ٹیلیفون پر ہیں''۔

بہادر یار جنگ نے ٹیلیفون لیا—— ''بہادر خاں'' دوسری طرف کھرے لہجے کی گونج پیدا ہوئی۔ ''حضرت اقدس''!—— بہادر یار جنگ نے جواب دیا۔ ''آداب بجالاتا ہوں'' اور پھر حضور نظام نے اپنے جاگیردار اور نواب زادے سے باتیں کیں، تفصیل سے حکم دیا بحیثیت حکمراں کے اور نواب صاحب کی فہم وفراست کی تعریفیں کیں بحیثیتِ سیاستداں کے۔

ابھی ٹیلیفون کا یہ سلسلہ ختم ہوا ہی تھا کہ سر اکبر وزیر اعظم کا ٹیلیفون آیا۔ پھر مسٹر ٹاسکر نے نواب صاحب سے باتیں کیں۔ اخباری نمائندے اور مجلس کے ارکان نواب صاحب کو گھیرے ہوئے تھے۔ باہر مجمع بے قابو ہوا جارہا تھا۔ شور و پکار کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں پھر ایک ٹیلیفون آیا، یہ ٹیلیفون بھی کنگ کوٹھی سے تھا۔ دوسری طرف سے اعلیٰ

حضرت کے چوبدار خاص احمد علی کی آواز آئی۔ اعلیٰ حضرت ارشاد فرماتے ہیں اور احمد علی نے ایک ایک لفظ کو دہرانا شروع کیا جو نظام ٹیلیفون کے سامنے کھڑے ہوئے احمد علی سے فرما رہے تھے ——— ''تم میری سلطنت کی آبرو ہو، میرے جاگیردار اور میرے جان نثار ہو۔ دیکھو میرے نظم ونسق پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگ جائے'' اِدھر مسلمان تلے بیٹھے تھے جو ہوسو ہوانھیں معصوموں کے خون کا بدلہ چکانا ہے۔

بیت الامت کے سامنے بیگم بازار کی لمبی سڑک پر انسانی سروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سچ مچ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، اپنی تلواریں، برچھے، بھالے ہر طرف فضاء میں بلند تھے، لوگ دیوانہ وار چلا رہے تھے۔ مشتعل مجمع صرف نواب صاحب کی اجازت کا منتظر تھا۔ مسلمان جب نظم وضبط کا مظاہرہ کرنے پر آئے تو تلوار کی دھار اور نیزے کی انی پر بھی ڈسپلن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نواب صاحب کا حکم تھا ——— ''مسلمان میرے مشورے کے بغیر ایک قدم نہ اُٹھائیں'' جذبات کے تیز وتند دھارے پر آج مسلمان قدم اُٹھانے سے پہلے اپنے قائد سے اجازت لینے آئے تھے ——— اور قائد نے بیت الامت کے بالکنی پر کھڑے ہو کر اُبلتے ہوئے لاوے اور دہکتے ہوئے الاؤ کا نظارہ دیکھا، قیامت کا منظر تھا، مجمع میں غم وغصے کی طوفانی لہریں اُٹھ رہی تھیں، بالکنی پر کھڑے ہوئے قائد کو دیکھ کر ایک گروہ نے پکارا ——— ''آج ہم سر سے کفن باندھ کر چلے ہیں''۔ دوسری طرف سے آواز آئی ——— ''آج ہم نے اپنی موت سے پیمان کر لیا ہے''۔ اللہ اکبر کا شور بلند ہوا اور بہت سے لوگوں نے چلا کر کہا ——— ''آج ہم آپ سے آخری بار ملنے آئے ہیں'' مشتعل جذبات کی اس یورش میں جوشِ انتقام سے اندھے اس مجمع کے آگے بہادر خاں خاموشی سے کھڑے رہے، وہ بہادر خاں جس کی عیسیٰ نفسی نے اسلامانِ دکن کے تنِ مردہ میں جان ڈالی تھی، جس کی شعلہ نوائیوں نے طاغوتی طوفان کی زد میں ہر قدم پر جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ عوام کے اس بے پناہ ہجوم کے آگے خاموش کھڑا رہا۔ قائد کا یہ کچھ دیر کا سکوت بڑا کام کر گیا انطونی نے سیزر کے جنازے پر آنسو بہاتے ہوئے اپنی قوتِ گویائی سے دبی ہوئی چنگاریوں کو سلگایا تھا۔ بہادر یار جنگ کو دہکتی ہوئی آگ اور اُبلتے ہوئے لاوے پر بھرے بادلوں سے پانی برسانا تھا۔ یہ کٹھن مرحلہ تھا! بڑا کٹھن مرحلہ! اور یہ مرحلہ گذر گیا۔ انسانی سروں کا اتھاہ سمندر دیکھتے دیکھتے

نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ سڑک پر سے مشتمل ہجوم یوں چھٹ گیا جیسے سطح آب سے کائی پھٹ جائے۔

بہادر یار جنگ نے کیا کہا۔ ان کے الفاظ میں کیا جادو تھا۔ یہ خدا کے دین کی باتیں ہیں۔ مسز نائیڈو نے بڑھ کر نواب صاحب کو لپٹا لیا جیسے ماں اپنے معصوم بچے کی کامیابیوں پر فرطِ مسرت سے بے قرار ہو کر خوشی کے آنسو بہانے لگتی ہے۔ مسز نائیڈو ایسے ہی عالم جوش میں مسکراتے ہونٹوں اور اشک بار آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''بیٹا! مجمعوں کو مشتعل کرتے تو بہت سے لیڈر دیکھے تھے لیکن ایسے غضب ناک اور مشتعل مجمع کو یوں قابو میں کرتے آج تک کسی کو نہ دیکھا تھا۔ یہ خدا کی دین ہے جسے چاہے سرفراز کرے''۔ (حوالہ : دیکھنا تقریر کی لذت از مولوی شاہ بلیغ الدین مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۵ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

۱۲ بجے سے مسلمان چنچل گوڑہ میں ہتھیاروں سے لیس جمع ہونا شروع ہوئے۔ اس زمانے میں چنچل گوڑہ میں بھی ہندوؤں کی دُکانیں اور آبادی تھی ——— نواب صاحب نے اپنے بہ اعتماد ارکان کو بہ ہتھیار ایسے مقامات پر متعین فرمایا۔ چنانچہ کھلا چنچل گوڑہ پر مولوی قادر خاں صاحب (سابق صدر انجمن مہدویہ) متعین کئے گئے تھے، ان متعینہ نوجوانوں کو سخت ہدایت تھی کہ کسی ہندو پر حملہ نہ ہو یا اس کی املاک کو کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے، پونے چار بجے چنچل گوڑہ سے دونوں شہیدوں کا جلوس جنازہ نکلا اور اخباری اطلاع کے بموجب پچیس ہزار مسلمان شریک جنازہ تھے، اپریل کا مہینہ تھا، تپتی ہوئی دھوپ میں صبح سے قائدِ ملت چنچل گوڑہ میں انتظامات میں مصروف رہے۔ دھوپ کی تمازت سے نواب صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ شہداء کی لاشیں فوج کے ذریعے حاصل کی گئیں۔

ٹھگی جیل کے عقبیٰ حظیرہ میں شہیدوں کی ۴ بجے تدفین عمل میں آئی۔ چنچل گوڑہ سے ٹھگی جیل کے راستے تک چادر گھاٹ کے پل پر سے جلوس جنازہ گذرا۔ نواب صاحب کی ہدایت پر کلماتِ تحمید و تکبیر آہستہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ یہ جذبات پر قابو رکھنے کی غایت تھی۔ لحہ لحہ جلوس جنازہ میں شریک سوگواروں میں جوش اُبھرتا۔ نواب صاحب کی آواز ان قدموں کی آہٹ کو محسوس کرتی کیوں کہ یہ کوئی اجنبی قدموں کی آہٹ نہ تھی، فوری نواب صاحب کی آواز بلند ہوتی ''میں

تمہارے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں''۔ قائد کی اس آواز کے ساتھ صرف سانسوں کی آواز باقی رہ جاتی۔

جنازہ اُٹھنے سے پہلے بھی نواب صاحب نے ایک پراثر تقریر فرمائی، ''اگر وہ اپنے غیض و غضب پر قابو نہ رکھیں گے تو ان کے یہ ہتھیار بے کار ہیں، وہ جنازہ میں امن پسند شہری کی طرح شریک ہوں اور خاموشی کے ساتھ سوگ میں ڈوبے رہیں۔ نواب بہادر یار جنگ نے مجمع کو شہیدوں کے خون کا واسطہ دے کر کہا کہ اپنی حکومت اور اپنے ملک کے ناموس کے لئے ہمیں پرامن رہنا چاہئے''۔ (رہبر دکن ۹/اپریل ۱۹۳۸ء)

جنازے کے دفن کے بعد نواب صاحب نے جو اس حادثہ سے بے حد متاثر تھے، شریکِ جنازہ ہزاروں مسلمانوں کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا'' مسلمانو! میں جانتا ہوں کہ تم ان دنوں شہادتوں سے کس قدر دل گیر ہو، میں بھی تم سے زیادہ غم زدہ ہوں۔ لیکن میں تمہیں ان شہیدوں کے خون کا واسطہ دیتا ہوں کہ نہایت خاموشی سے اپنے مکانات کو واپس چلے جاؤ۔ یاد رکھو کہ تمہاری طرف سے کسی ہندو بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ایسا ہی کرو گے۔ سبھوں نے وعدہ کیا اور قائدِ ملت کے حکم کی پابندی کی۔ یہ تھی قائد کی قیادت کی مسیحائی۔ مسلمانوں کے اس عظیم قائد کی عظمت مسلمانوں کے قلب کی گہرائی میں پذیرائی ۔

جو دلوں کو فاتح کرلے وہی فاتح زمانہ

'' جولیس سیزر کے قتل پر مارک انٹونی نے ایسی برجستہ و دل ہلا دینے والی تقریر کی کہ جولیس سیزر کی موت کا ماتم کرنے آئے تھے۔ عالم اشتعال میں سیزر کے قاتلوں کو گرفتار کرلائے اور قتل و غارت کئے بغیر دم نہیں لیا۔ بہادر خاں اگر چاہتا تو بہت ہی آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ بلکہ اس سے زیادہ کرسکتا تھا جو مارک انٹونی نے کروایا۔ وہاں سیزر کے ماتم گسار اس کے چند بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ یہاں ایک پوری قوم غم زدہ تھی۔ وہاں انتقام لینے والوں کے دلوں میں صرف ایک فرد کی محبت یا اپنے ڈکٹیٹر کی وفاداری کا جذبہ تھا یہاں رونے والوں کے سینوں میں نہ صرف معصوم شہیدوں سے محبت بلکہ مذہبی جوش، قومی عصبیت کا جذبہ اور اپنی شجاعت کا یقین تھا، وہاں مقتول ایک قاہر بادشاہ تھا۔ یہاں مظلوم ایک پوری قوم تھی۔ اشتعال انگیزی کچھ زیادہ مشکل

نہیں ہے لیکن مشتعل مجمع پر قابو پانے کے لئے اجتماعی نفسیات کی مہارت سے بھی زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ انٹونی نے جمع ہونے والوں کو اشتعال دلایا۔ بہادر خاں نے انتقام کے جذبہ و ارادہ کے ساتھ ہتھیاروں سے لیس ہو کر آنے والوں پر غیظ و غضب مسلمانوں کے اشتعال کو اپنے قابو میں لے لیا ——— دہکتے ہوئے شعلوں کو اپنے تدبیر و فراست سے ٹھنڈا کیا، زہریلی ہوائیں تھم گئیں۔ فضا صاف ہوگئی۔ ڈھول پیٹ کے فساد نے مسلمانوں میں ایک مرکزیت پیدا کردی۔ اب مہدوی منزل بیت الامت بن گئی۔

(حوالہ : ''ہمارا قائد'' از محترم مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۳۲-۳۳-۳۴)

''وہ ایک سچے اور مخلص امن پسند سیاست داں تھے، بہتر زندگی کے قرآنی تصور کے نمائندے، ان کی زندگی اور اندازِ فکر کے متعلق میں اپنی شخصی اور ذاتی معلومات کی بناء پر پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں اللہ کے حکم سے غافل نہیں رہے کہ 'زمین میں فساد مت پھیلاؤ' وہ امن کے پیامی اور پرستار تھے اور اپنی اس صفت کا ثبوت انھوں نے شہر حیدرآباد میں ایک مہیب ہندو مسلم فساد کی آگ کو ٹھنڈا کر کے پیش کردیا''۔

(حوالہ : نواب بہادر یار جنگ از نواب سر نظامت جنگ صفحہ ۳۲۳-۳۲۴ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

دل گرفتہ بہادر خاں کو ہندو بیرونِ ہند سے تعزیتی پیامات موصول ہوئے جن کے جواب میں نواب صاحب نے شہداء کی موت پر جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ ایک زندہ قوم کے حقیقی قائد کے احساساتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ''میرے عزیز کی موت کا رنج نہ مجھے ہے نہ آپ فرمائیں۔ میں بھی قابل مبارکباد ہوں اور آپ بھی کہ ہمارے ایک نوجوان نے اپنا فرض ادا کیا۔ اقوام و ملل کی کھتیاں، جناب نواب صاحب، پانی سے نہیں خون سے سینچی جاتی ہیں۔ بڈھے خون سے نہیں، نوجوان اور تازہ خون سے۔ افسوس ہے ان کی زندگی پر جن کا خون ان کے اپنے جسم میں خشک ہوجائے اور ملک و ملت کے کام نہ آئے۔'' **اللھم اھدنا الصراط المستقیم''**

(حوالہ : بنام حسن یار جنگ مکتوب ۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء

مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

''کسی کی شہادت باعثِ رنج و ملال نہیں، قابل مبارکباد ہوتی ہے۔ یاد رکھئے اقوام و ملل

کی کھیتیوں کی کھاد صرف نوجوانوں کا خون ہے جو قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے وہ اللہ کی زمین پر جینے کی مستحق نہیں''۔(حوالہ : خط ۸ مکاتیب جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

فرقہ وارانہ فساد کی مذمت اور صلح و آشتی کے ضمن میں فرماں روائے حیدرآباد کا ایک فرمان جاری ہوا۔قاتلوں میں سے ایک اہم قاتل لالہ پہلوان پہلے روپوش ہوگیا۔(سٹی کالج کے سامنے بالاجی دیول میں مقیم رہا اور گھانس کی بنڈی میں چھپ کر وہاں سے شولاپور چلا گیا۔ کچھ ملزمین ہاتھ لگے جن پر مقدمہ چلایا گیا۔۱۶/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو دس بجے نواب بہادر یار جنگ کا بیان (ہائی کورٹ) میں قلمبند کیا گیا۔ملزمین کو سزا ہوئی۔اس خصوص میں نظام کا ایک اور فرمان جاری ہوا جس میں اس ہنگامے کے ضمن میں نواب صاحب کے خدمات کی ستائش کی گئی تھی۔

''رفع غلط فہمی''

''حالیہ ہنگامہ کے موقع پر بہادر یار جنگ نے جو وفادارانہ خدمات انجام دیئے تھے اس کو میں نے اور میری گورنمنٹ نے بنظر استحسان دیکھا اور ان کو خاص خاص مواقع پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لئے کہ ان کا ہر گلی کوچہ میں تقریر کرتے پھرنا آئندہ ان سے ناممکن ہے۔ بایں وجہ کہ وہ بھی اپنے بڑوں کے مانند ذاتی وجاہت و پوزیشن رکھتے ہیں''۔

(روزنامہ صبح دکن ۹/مئی ۱۹۳۸ء)

ہفتہ وار اُردو بمبئی نے اس سانحہ پر منفرد انداز میں شہداء کے حضور مسلمانانِ دکن کے احساساتِ قلبی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اداریہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔کوئی روزنامہ اور ہفتہ وار ایسا نہ تھا جس نے اس سانحہ پر اداریہ نہ لکھا ہو۔

◆◆◆

آہ! اللہ بندہ میاں و نواز خاں شہداء سلام ہو تم پر!

(از حضرت ف-ض صاحب حیدرآبادی)

سلام ہو مظلوم شہیدوں پر جنھوں نے نہتے ہاتھوں بے بسی، بے کسی کے عالم میں دھول پیٹ کی تنگ و تاریک خوفناک گلیوں میں اسوۂ حسینی کی یاد دلانے کے لئے اپنے پاک خون سے آریہ سماجی لودھوں کی پیاس بجھادی۔ ان مقلدانِ اسلام کے اس شعر کے کیف بے خودی میں اپنی نسبت کو ثابت کر دکھایا۔

بناء کردند خوش رسمے نجاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت!

سلام ہو جامِ شہادت سے ہمکنار ہونے والے بے گناہ دونوں نوجوانوں پر جنھیں حورانِ بہشتی نے کفن پہنایا ہے اور جن کی لاشوں پر فرشتے سایہ فگن و شریکِ جنازہ سوگوار تھے ــــــــــ

سلام ہو شہداء کے ان زخموں اور خون آلود جسموں پر، جن سے خونِ جوانی رس رس کر ملتِ اسلامیہ کے بقاء کی ضمانت پر گلکاریاں کر رہا تھا۔

سلام ہو شہداء کے مطہر خون پر جس نے حق و باطل کے حدود قائم کر کے خون کی آبیاری سے نخل اسلام کو سینچا اور گلشن اسلام کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ کیوں کہ اسلام اپنا خون بہانے کے بعد ہی سرسبز ہوا کرتا ہے۔

سلام ہو شہداء کی مقدس لاشوں پر جو بہ جرم حق پرستی تڑپیں اور تڑپ کر شمع وحدت کا فانوس بن گئیں، جن کی پرنور شعائیں ظلمت کدۂ ہند میں ٹھوکریں کھانے والے مسلم کے لئے خضر راہ بن کر رہبری کا سامان ہو گئیں ــــــــــ

سلام ہو شہداء کی عافیت گزیں پاک روحوں پر، جنھوں نے ناموسِ اسلام کے لئے ملک و مالک پر قربان ہو کر اپنی مظلومیت سے شعائرِ اسلامی کی حریت کو بچالیا اور اک اسلامی سلطنت

حیدرآباد میں اپنی اپنی جان ہائے شیریں دے کر حیدرآباد کی ہندو مسلم اتحادی روایات کی لاج رکھ لی۔

سلام ہو شہداء کے ماں، باپ، بہن، بھائی کے تاثراتِ قلبی میں ڈوبی ہوئی ان آہوں پر، جو موہنی صورت والوں کے پامال نقش اور خونچکاں لاشوں پر، مجروح دل سے نکلیں اور شمع فروزاں بن کر سرداران جنت کے آستانۂ پاک پر روشن ہو گئیں۔

سلام ہو ورثاء شہداء کے ان خونبار آنسوؤں پر اور دل گداز آہ و بکاء پر، جن کی دل دوز آوازوں اور خوں ریز قطروں نے عرشِ اعظم کو بھی تھرا دیا۔

سلام ہو شہداء حیدرآباد پر کہ انھیں اسی طرح دھوکے اور دغا سے اغیار نے شہید کیا۔ جس طرح سیواجی نے افضل خاں کو دھوکے سے قتل کیا۔

سلام ہو جنگجو بہادر قوم افغان کے بھولے بھالے نوجوان شہیدوں پر، جنھوں نے اپنی معصوم شہادت سے دردمند نالہ کناں ورثاء اور قوم کو غیر معمولی صبر کی تلقین کرتے ہوئے حضرت امام زین العابدینؑ کے صبر جمیل کی یاد کو تازہ کر دی اور حیاتِ جاودانی کی منزلِ مقصود کو پہنچتے ہوئے موت کی گھاٹیوں پر پڑی ہوئی قوم میں روحِ احیاء پھونک دی۔

سلام ہو شہیدوں کے اس روح فرسا عالم پر! جب کہ مکر و فریب سے ان پر لٹھ، ہتھیار اور برچھوں سے نہایت بے دردانہ پے در پے حملے کئے گئے جن کی ارواح نے بحالت مجبوری انتہائی تڑپ اور بے قراری سے اپنے مسلمان بھائیوں کو اسلام کا حیاتِ جاوید بخش پیام اللہ اکبر کہتے ہوئے سرد ہونے والے آخری سانسوں کے ساتھ سنایا۔

سلام ہو حضرت سید شاہ جلال الدین غازی بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر، کہ جن کے عرس شریف کی یاد میں اغیار نے اپنے ظلمت کدہ میں شہیدوں کے نور کی بجلیاں چمکا کر خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کیا۔

سلام ہو ان تمام شہداء اسلام پر، جنھوں نے (آریہ اور مہا سبھائیوں کی وحشیانہ ذہنیت و حرکت کے شکار ہو کر) سر زمین ہند پر تڑپ کر ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو زندہ کر دیا۔ بمصداق ۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(حوالہ : ہفتہ وار ''اُردو'' بمبئی ۱۴/اگست ۱۹۳۸ء)

مدیر : غالب (حیدرآبادی)

دھول پیٹ کے فساد کو ختم کرنے میں نواب صاحب کی سعیِ مشکور کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے، حیدرآباد کے ایک ہندو بھائی نے منظوم خراج ادا کیا۔ جو مبنی بر صداقت تھا۔

ہندو مسلم کا فساد آخر کو لاتا خوب رنگ
جنگ بڑھ جاتی نہ ہوتے گر بہادر یار جنگ

◆◆◆

قائدِ ملت کا مرتبہ ابتدائی لائحہ عمل مجلس اتحاد المسلمین

۱۹۳۸ء

مجلس اتحاد المسلمین کے پیش نظر جہاں ایک طرف مسلمانوں کے معاشی، مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت ہے وہیں دوسری طرف اس کا فریضہ ہے کہ مسلمانوں میں منظّم بیداری پیدا کرے اور ایسے اسباب مہیا کرے جس سے مسلمان ایک طرف ذہنی وفکری حیثیت سے ترقی کریں تو دوسری طرف جسمانی وعملی اعتبار سے۔ اس مختصر جملہ میں جن مقاصد کے حصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ عملاً اس قدر نہیں ہیں۔ جو آسانی سے بیان کئے جاسکتے ہیں اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہمارا ہر ایک قدم چاہئے آہستہ اُٹھے مگر مضبوط اور مستقل۔

ہماری اکثر کوششیں اسی لئے بے سود اور بے نتیجہ رہ جاتی ہیں کہ ہم اپنی قوتِ عمل کا اندازہ کئے بغیر میدانِ عمل کو وسیع کر لیتے ہیں، میدانِ عمل کی وسعت ایک طرف کارکنوں کے حوصلوں کو پست کر دیتی ہے تو دوسری طرف معاونین کی ہمتیں بھی پست ہو جاتی ہیں۔ اس لئے عملی کوشش کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی آبادیوں کو چھوٹی چھوٹی مستقل وحدتوں (Unit) میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ہم قصبوں میں یا دیہات میں کام کر رہے ہیں تو ہر قصبہ اور گاؤں ایک (Unit) ہوسکتا ہے اور اگر ہم بڑے شہروں میں کام کر رہے ہیں تو مسلمانوں کے ایک ایک محلّہ کو ایک ایک (Unit) یا وحدت قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہر وحدت کا ایک ایک امیر ہو جو وہاں کے تمام کاموں کا ذمہ دار ہو۔ اسے آبادی کے باشندوں نے بہ غلبہ آراء منتخب کیا ہو۔ اس کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہوگا کہ اپنی آبادی سے ایسے اصحاب کا انتخاب کرے جو اپنے وقت کا کچھ حصہ روزانہ بالالتزام قوم کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہوں۔ پھر ان سے آہستہ آہستہ حسبِ ذیل کام لے۔

اس آبادی کی مسلم شماری اس تفصیل سے کی جائے جس کا تختہ درجِ ذیل ہے :

۱) نمبر مکان- ذاتی یا کرایہ کا ۲) سلسلۂ نشان اشخاص

۳) نام معہ ولدیت (اگر مستورات کتخدا ہوں تو شوہر کا نام بھی لکھا جائے)

۴) عمر ۵) کتخدا یا نا کتخدا، بیوہ، یتیم

۶) نام سرپرست ۷) فارغ التعلیم یا زیر تعلیم معہ حوالہ سند یا جماعت

۸) خواندہ یا ناخواندہ

۹) ذرائع آمدنی : ملازمت سرکاری یا خانگی، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، بصراحت قسم، بصراحت رقبہ محاصل ۱۰) اوسط آمدنی ماہانہ

۱۱) کوئی ہنر یا دستکاری جانتے ہیں یا نہیں ۱۲) اگر بیروزگار ہیں تو کب سے اور کیا وجہ ہے

۱۳) جائیداد ۱۴) کیفیت

اس مسلم شماری کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم آبادی کی تفصیلی حالت سے واقف ہو جائیں گے اور اصلاحی تدابیر کے اختیار کرنے میں سہولت ہوگی جس کی تفصیل کہیں آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس تختہ کی تیاری کے بعد کارکنوں کو محسوس ہوگا کہ مسلمان پستی اور انحطاط کے اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں کہ اُونٹ کی طرح ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ معاشی حیثیت سے وہ ہندوستان کی مفلس ترین قوموں میں سے ایک ہیں۔ حصولِ علم ان کے فرائض دینی میں سے ہونے کے باوجود عام طور پر ان میں علم کی کمی ہے۔ اخلاقی حالت ان کی اتنی گری ہوئی ہے کہ جس کو دیکھ کر ان کے ہر دوست (بہی خواہ) کو افسوس ہوتا ہے۔ تنظیم واتحاد ان میں نام کو بھی نہیں ہے اس لئے ایک قومی کارکن جب وہ آمادۂ عمل ہوتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے کہ کس کل کے سیدھا کرنے کی طرف پہلے توجہ کرے، عملی حیثیت سے ضرورت ہے کہ ان میں مدارس دینیات، مدارس شبینہ بالغان، مدارس نسوان اور دارالمطالعے قائم کئے جائیں۔ معاشی حیثیت سے ضرورت ہے کہ صنعتی مدرسے کھولے جائیں، کارخانے قائم کے جائیں۔ نوآبادیاں بسائی جائیں لیکن چوں کہ ان سب کاموں کا بیک وقت انجام کو پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ سب سے مقدم کاموں کی طرف سب سے پہلے توجہ کی جائے۔

مجلس اتحاد المسلمین ان تمام فرائض کی انجام دہی کے لئے اس بات کو مقدم سمجھتی ہے کہ شہروں اور اضلاع پر رہنے والے سمجھدار اور تعلیم یافتہ مسلمان سب سے پہلے بیدار اور منظّم کئے

جائیں تاکہ وہ اپنے لئے ان تمام ضروریات کی فراہمی کا انتظام کریں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، بلکہ دیہات کے مسلمانوں کی طرف بھی متوجہ ہوسکیں۔ اسی لئے مجلس کی طرف سے فی الحال جو پروگرام پیش کیا جارہا ہے وہ اضلاع تعلقات یا بڑے قصبات کے لئے ہے جہاں مجلس کی شاخیں قائم ہوں۔

۱) قوموں کی اصلاح وترقی کے سفر میں سب سے پہلی منزل اتحاد تنظیم ہے اس لئے ہر شاخ کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ تقاریر، مواعظ، مضامین ورسائل اور محافل دعوت وغیرہ کے ذریعے سے مسلمانوں کے باہمی اختلاف وافتراق کو توڑے اور ان میں اتحاد خیال وعمل پیدا کرے۔

۲) محض متحد ہوجانا ہی اس وقت کارآمد نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ مسلمان آمادۂ عمل نہ ہوجائیں اور اپنی تمام خرابیوں کو مٹانے اور تمام ضروریات کو فراہم کرنے کا عزم نہ کرلیں۔ اس کے لئے ایک طرف اصلاح ذہنی وفکری کی ضرورت ہے تو دوسرے طرف قوتِ جسمانی وعملی کی۔

مجلس ابتداء وافتتاح کار کے لئے چاہتی ہے کہ مسلم آبادی میں بلاتاخیر ایک ایسا دارالمطالعہ کھولا جائے جس میں تازہ ترین اخبارات ورسائل آتے ہوں۔ اخبارات ورسائل کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جانا چاہئے کیوں کہ انھیں سے خیال وعمل کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ مجلس کی رائے میں حسبِ استطاعت حسبِ ذیل اخبارات ورسائل مناسب ہوں گے۔

رہبر دکن جو مجلس ہذا کے اغراض ومقاصد کا ترجمان ہے، اخبار پیام فی الحال جس غلط راستہ کی طرف مسلمانوں کی رہبری کررہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس سے کامل انقطاع کیا جائے۔ دوسرے مقامی اخبارات مثلاً صبح دکن، وقت وغیرہ اگر مل سکیں تو ضرور فراہم کئے جائیں۔ بیرونی اخبارات میں الامان، انقلاب، وحدت اور زمیندار اور رسائل میں صدق، ایمان ترجمان القرآن، خلیق، مولوی، معارف اچھے رسائل ہیں۔ رسائل ارشاد وواعظ صدر انجمن اسلامیہ حیدرآباد دکن سے غالباً بلا قیمت حاصل ہوسکتے ہیں۔ نوجوانوں کے ادبی رجحان کے مدنظر عالمگیر، ساقی، ادبی دُنیا، نیرنگ خیال، پیمانہ، ایشیا، سب رس وغیرہ اچھے اور معیاری رسائل ہیں۔ فلمی رسالوں اور ناشائستہ رسالوں سے احتراز ضروری ہے۔ بظاہر ممکن ہے کہ دارالمطالعہ کا قیام ذرا دشوار محسوس ہو

لیکن یہ مشکل اس طرح آسان ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کی کوئی آبادی ایسی نہ ہوگی جس میں کچھ اصحاب کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ نہ منگواتے ہوں، ان سے یہ اخبارات ورسائل حاصل کر کے دارالمطالعہ میں رکھے جاسکتے ہیں ۔ معتمد دارالمطالعہ کا فریضہ ہونا چاہئے کہ سب سے پہلے ان رسالوں اور اخبارات کا خود مطالعہ کرے اور جو مضامین مفید اور قابل مطالعہ ہوں اس پر دوسروں کی ہدایت کے لئے کوئی واضح نشان لگادے یا دارالمطالعہ میں ایک سیاہ تختہ پر ان کا حوالہ درج کردے

۳) تقریری جلسوں اور مجالس مباحثہ کا انعقاد کرکے مقامی اور بیرونی اصحاب سے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مضامین پر تقاریر ومباحثے کرائے جائیں۔

۴) اگر مجلس مقامی اپنے کاروبار کو وسعت دے سکتی ہے تو ایک مدرسہ شبینہ تعلیم بالغان کا ضرور انتظام کرے، یقین ہے کہ اس میں سررشتہ تعلیمات سرکار عالی بھی مدد کرے گا۔ سررشتہ تعلیمات نے اس قسم کے مدارس کے لئے ایک نصاب بھی مرتب کیا ہے جو مناسب اور موزوں ہے۔

۵) تعلیمی سلسلہ میں مجلس کے کارکنوں کی توجہ ان کم عمرلڑکوں کی طرف ضرور ہونی چاہئے جو تعلیمی عمر رکھنے کے باوجود مختلف وجوہ کی بناء پر تعلیم نہیں حاصل کررہے ہیں۔

۶) معاش کا مسئلہ ہر زمانہ میں دُنیا کا سب سے اہم سوال رہا ہے مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت کم نہیں۔ اس شخص کی نماز ہی کیا جس کے دل میں ''چہ خورد بامداد فرزندم'' بسا ہوا ہو اور مفلسی کا اخلاق پر اثر انداز ہونا مسلم ہے۔ اس چھوٹی سی تنظیم میں کسی بڑے معاشی نظام کو تو شروع نہیں کیا جاسکتا البتہ ایسی تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں جن سے معاشی بے چینی کم ہوجائے ذیل میں چند صورتیں پیش کی جاسکتی ہیں :

۱) مسلمانوں میں تجارت اور صنعت سے دلچسپی پیدا کرنا ان کو بتلانا کہ تجارت مسلمانوں کا پیشہ ہے اور باعثِ ننگ و عار ہونے کی بجائے باعثِ عز و شرف ہے اور جو لوگ آمادہ ہوں ان کو کوشش کر کے چھوٹی چھوٹی تجارتوں پر لگانا۔

۲) اگر حالات اجازت دیں تو چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور دستکاری کے تعلیمی ادارے قائم کرنا یا جو لڑکے آمادہ ہوں ان کے لئے ملک کے دوسرے صنعتی اداروں میں تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳) پردہ نشیں مستورات کو آمادہ کرنا کہ اپنے اوقات بے کاری کو کسی مفید کام میں صرف کریں اوراس سے کم ازکم اپنے پاندان کا خرچ پیدا کر کے آمدنی میں شوہر کا ہاتھ بٹائیں یا کم ازکم اپنی ضروریات خود اپنے ہاتھوں تیار کر کے باہر خرچ ہونے والے زائد پیسے بچالیں، ایسی مستورات کے لئے امیر اوراس کی جماعت کا فرض ہوگا کہ دستکاری کی خام اشیاء فراہم کرے۔ تیار شدہ مال کی نکاسی کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔

نواڑ بافی، کمربند بننا، پوت فیتے کی قوریں تیار کرنا، سگریٹ اور دیا سلائی کی ڈبیاں تیار کرنا، لفافہ بنانا، مٹی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے بنانا، کارچوب، کامدانی، زرگری، سلائی کا کام وغیرہ۔

۴) گداگروں میں سے جو لوگ کمائی کے قابل ہوں ان کو کام پر لگانا، جو اپاہج ہوں یا معذور ان کی پرورش کرنا۔

۵) معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں ان تدابیر کے علاوہ جو اُوپر بیان کی گئیں ہیں ایسے باہمی معاہدات سے بھی کام لیا جاسکتا ہے جو بے جا رسوم کے ترک کرنے، مسرفانہ اعمال سے بچنے کے لئے آپس میں کئے گئے ہوں۔ ان میں سب سے زیادہ مستورات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جو لکیر کی فقیر ہوتی ہیں اور رسم کو مذہب کا درجہ دے لیتی ہیں۔

۷) نوجوانوں کی تنظیم کے بغیر کوئی تنظیم خواہ چھوٹی ہو یا بڑی مکمل نہیں ہوسکتی اور نوجوان کسی سامانِ دلکش کے بغیر متوجہ نہیں ہوسکتا، اس لئے ہر حلقہ میں ایسے تفریحی کلب کا انتظام ضروری ہے جس میں میدانی کھیلوں کا انتظام کیا گیا ہو۔ مغربی کھیل مثلاً فٹ بال، ہاکی، ٹینس، کرکٹ اور والی بال وغیرہ بھی اچھے کھیل ہوتے ہیں لیکن اگر کبڈی، لون پاٹ وغیرہ مشرقی کھیلوں کو اُجاگر کیا جائے تو وہ کم خرچ بھی ہوں گے اور ان سے مشرقی آن بان بھی باقی رہے گی۔ پس اس سلسلہ میں ایک ورزش گاہ جسمانی کا انتظام بھی ضروری ہے جس میں علاوہ کشتی کے لٹھ، بنوٹ اور تلوار کا کام بھی سکھایا جائے۔ اس کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کیوں کہ مسلمان جسمانی حیثیت سے دن بہ دن زیادہ کمزور ہوتے جارہے ہیں۔

۸) تنظیم ہرگز مکمل نہ کہلائے گی اگر ہر حلقہ میں بوائے اسکوٹ کے اُصول پر ایک جماعت

رضا کارانِ اتحادالمسلمین نہ قائم کی جائے، اس کی طرف فوری توجہ مبذول ہونی چاہئے۔ اس کی تفصیلات علاحدہ مرتب ہو رہی ہیں، جو متعاقب روانہ کی جائیں گی۔

۹) اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی حیثیت صرف ایک سرسری خاکہ کی ہے جو مقامی حالات کے لحاظ سے مکمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سوال سب سے اہم ہے کہ ان سب کاموں کے لئے سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ان تمام تجاویز پر بیک وقت عمل شروع کر دیا جائے بلکہ انتہائی حزم اور پوری احتیاط کے ساتھ ایک ایک قدم اُٹھایا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ مضبوط اور غیر متزلزل ہو۔ ابتدائے کار کے لئے صرف دارالمطالعہ بازیگاہ اور جماعت رضا کاران کا قیام اور مسلم شماری کا کام کافی ہوگا، باقی کاموں کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھایا جائے۔

دارالمطالعہ اہل محلّہ کے یہاں آنے والے رسائل اور اخبارات کے ذریعہ بلا وقت کھولا جا سکتا ہے یا ماہانہ (پانچ) روپیہ چندہ اس کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ محلّہ کے کسی معزز باشندہ کے مکان کا ایک فالتو کمرہ جگہ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ رفتہ رفتہ جب مذاق ترقی کرے تو اس کو وسعت دی جا سکتی ہے۔ بازی گاہ نوجوانانِ محلّہ کی توجہ سے آسانی کے ساتھ قائم ہو سکتی ہے اگر ہر نوجوان صرف ۲ روپیہ ماہوار چندہ دے۔

مجلس کا مقررہ چندہ یعنی (سالانہ ۲ آنے فی کس) تو مجلس کا مستقل سرمایہ ہے لیکن جب ساکنانِ محلّہ کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ جو معاونت کر رہے ہیں وہ آنکھوں سے ہٹ کر نہیں بلکہ ان سے چند قدم کے فاصلہ پر خود ان کے محلّہ میں براہِ راست ان پر اثر انداز ہو رہی ہے تو وہ ہر قسم کی اعانت سے دریغ نہ کریں گے اگر ان سے کسی ایثار کی توقع کئے بغیر صرف ان کی خیرات وصدقات موجودہ کو ہی منظّم کر لیا جائے اور وہ اپنی زکوٰۃ وصدقات خود خرچ کرنے اور غیر مستحقین میں تقسیم کرنے کی بجائے اپنے مرکزی ادارہ کو دے دیں اور ہر مسئلہ کو اس کی طرف رجوع کریں تو چند روز میں ایک کافی سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ جب اس تنظیم واصلاح کے فوائد اہل محلّہ کے دلنشیں ہو جائیں تو ان سے مختلف صورتوں میں رقم حاصل کی جا سکتی ہے، مثلاً مٹھی فنڈ، ماہواری چندے، یکمشت عطیات وغیرہ ——— مجھے یقین ہے کہ بیت المال کی بھولی ہوئی اور مایوس

کن اسکیم کو بڑے پیمانہ پر تو شروع نہیں کیا جاسکتا مگر اس طرح ایک چھوٹے حلقہ میں کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ مجالس مقامی کے کئی سالہ لائحہ عمل کے لئے کافی ہیں۔ چاہئے کہ احتیاط کے ساتھ اپنے مقامی حالات کے مدنظر ان اُمور کو منتخب کر لیں جو وہاں زیادہ سودمند ہوں اور مجلس کو اپنی کارگزاریوں سے وقتاً فوقتاً مطلع فرماتے رہیں۔

◆◆◆

مجلس اتحادالمسلمین سے علماء ومشائخین کی علاحدگی

۱۹۳۹ء

مجلس اتحادالمسلمین کی تحریک ابتدائی دور سے علماء ومشائخین کے کامل تعاون کی رہین منت رہی۔لیکن ۱۹۳۹ء میں یہ طبقہ مجلس سے الگ ہوگیا۔

''مجلس علماء دکن'' قائم کی، مولانا بادشاہ حسینی صاحب معتمد قرار پائے۔اس مجلس کے قیام سے حیدرآباد کی سیاست میں بعض مزید اُلجھنیں بھی پیدا ہوئیں جنھیں سلجھانے کے لئے قائدِملت کو اپنی توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔(حوالہ : حواشی ۲۵۱ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم از مولوی محمد احمد خاں)

قائدِملت کو ان رفقاء کی جدائی کا بڑا املال رہا اور ہر طرح اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ دوبارہ مجلس میں شامل ہوجائیں۔گذشتہ دور کی قابل افسوس باتوں میں سے ایک ہماری صفوں کا بعض ان ساتھیوں سے خالی ہوجانا ہے جو برسوں ہمارے شریک کار رہے، ہمیشہ ہم نے ان کے اشتراکِ عمل کو احتراماً اپنے لئے ضروری سمجھا، ان کی گذشتہ خفگی کے بعد بھی خواہ اس کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں، ہم نے سعی و کوشش کا کوئی گوشہ خالی نہیں چھوڑا کہ ان کو پھر اپنے مقام پر واپس لائیں لیکن ہم کو سخت افسوس ہے اور رہے گا کہ ہماری ساری کوششیں رائیگاں گئیں اور آج ہم ان کو زینت بخش محفل نہیں پا رہے ہیں، میری آئندہ بھی یہی کوشش رہے گی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی غلط فہمیوں کو دور کریں اور میری دُعا ہے کہ خدا اس نازک وقت میں ہم سب کو صراطِ مستقیم کی طرف رہبری فرمائے، حق وصداقت پر ثابت قدم رکھے اور ہمارے ہر بیم ورجا کو صرف اپنی بارگاہ سے وابستہ کردے۔

''علماء کرام اور مشائخین سے میرا کچھ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔اس لئے ان سے پورے احترام کے ساتھ صرف اتنی گذارش کو کافی سمجھتا ہوں کہ وہ افرادِ ملت کے قلوب کو اپنی محبت اور جذباتِ احترام سے معمور کردیں کیوں کہ اسی پر بڑی حد تک دین و مذہب کی محبت اور

احترام کا دارومدار ہے''۔

'' اللھم اھد قومی فھم لایعلمون ''.

قائدِ ملت کی ساری اخلاقی کوششیں اوران کا اخلاص رائیگاں گیا، علاحدہ شدہ مشائخین و علماء جن میں ایک وکیل بھی شامل تھے جو مولوی کامیاب اور اُردو لاء کلاس کا امتحان پاس تھے ایک مشہور وکیل مولوی جہانگیر علی صاحب کے دفتر وکالت میں منشی تھے جنھیں نواب صاحب کی شخصیت، ان کی روزافزوں شہرت نے ان کے دن کے چین اور رات کی نیند حرام کردی تھی، عوامی سطح پر ناکامی کے بعد حکومتی سطح پر اور بادشاہِ وقت کے حضور میں قائدِ ملت کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے، اس وقت تک قوم پرستوں نے بھی اپنا محاذ بنالیا تھا۔ اس خصوص میں قائدِ ملت کے رفیق کار اور بہ اعتماد ساتھی مولوی عبدالرحمٰن سعید تحریر فرماتے ہیں :

'' مشائخین کو نواب صاحب نے حتی الامکان اپنے ساتھ لے کر کام کیا ہے۔ صابر حسینی صاحب اور بادشاہ حسینی صاحب تو مجلس انتظامی کے ارکان تھے لیکن ان کو سیاسی بصیرت حاصل نہ تھی، نواب صاحب کے عوام میں غیر معمولی مقبولیت پر ان حضرات کا رشک حد سے بڑھ گیا تھا۔ حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر ہر جگہ نواب صاحب کی خدمت میں سپاس نامے پیش ہوتے، ان کی خدمات کو سراہا جاتا تو مشائخین کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ نواب صاحب ان کی دلجوئی کے لئے ان کا احترام کرتے اور ان کو آگے بڑھاتے مگر وہ مسلمانوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے جس کی ان میں صلاحیت نہ تھی ۔ عبدالواحد اویسی وکیل (جو پولیس ایکشن کے بعد مولوی قاسم رضوی صاحب کے عارضی نامزد صدر مجلس اتحادالمسلمین تھے) گمراہ علماء و مشائخین کے مشیر خاص تھے، جنھوں نے آتش حسد کو بھڑکانے کا کام انجام دیا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ مشائخین کی مساعی اور عبدالواحد اویسی کی نامسعود کوششیں ناکام ہوگئیں۔ مسلمان قوم پرستوں نے بھی خلاف محاذ بنایا تھا، ان میں بیرسٹر اکبر علی خاں، حسن الدین صاحب مدیر مملکت، محمد صدیق اور ہندو لیڈر شامل تھے''۔ (حوالہ : مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

لیکن علماء و مشائخین کی ایک جماعت مجلس اتحادالمسلمین اور قائدِ ملت سے وابستہ تھی ۔ جواں سال سیدزادے مولانا سید شاہ نوراللہ حسینی صاحب افتخاری جن پر قائدِ ملت کو بڑا بھروسہ تھا،

اس منزل میں پوری طرح نواب صاحب سے تعاون فرمایا جن کی تفصیل جمعیۃ المشائخ کے زیر عنوان ہے۔

جمعیۃ المشائخ

مولانا سید شاہ نور اللہ حسینی افتخاری مشائخین کے طبقہ سے وابستہ عالم دین شعلہ بیان خطیب اور دردمند رہبر ملت تھے اور اللہ نے انھیں سیاسی بصارت و بصیرت سے بھی نوازا تھا، انھوں نے مجلس علماء دکن کے قیام کے بعد ان مشائخین و علماء کی ایک انجمن کا قیام جو مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت کے قائد کی قیادت پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے اس خصوص میں قائد کی بھرپور مدد کو ضروری اور لازمی سمجھتے ہوں کو جمعیۃ المشائخ کے پرچم تلے جمع کرنا وقت کے تقاضوں کے عین مطابق سمجھا۔ اگرچہ ۱۲ سال قبل اس نام سے ایک انجمن قائم تھی ۔ جو کچھ عرصے بعد سے ایک برائے نام جماعت بن گئی تھی۔ اس جماعت کے احیاء میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

مولانا افتخاری نے ۴/ جولائی ۱۹۴۱ء کو بعد نماز عصر اپنے مکان طریقت منزل چیلہ پورہ میں اکابر مشائخین کا اجتماع عمل میں لایا جس میں بلدہ حیدرآباد اور اضلاع کے اکابرین نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور جمعیۃ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کیا، چوں کہ مختلف علماء و مشائخین شریک اجلاس ہوئے۔

اجلاس کی کارروائی کا آغاز مولوی قاری سید تاج الدین صاحب (تاج القراء) کی قرأت سے ہوا۔ مولانا سید شاہ نور اللہ حسینی صاحب افتخاری نے جو داعی تھے، مشائخین و اکابرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

”آپ کو یہاں آنے کی جو زحمت دی گئی ہے وہ اس لئے کہ ہمارے اسلاف نے جو روحانی خدمات انجام دیئے تھے آج بھی ہم ان کی پیروی میں ایک حد تک وہی کام انجام دے رہے ہیں۔ ان ہی خدمات کے لئے ایک اجتماعی شکل میں جمعیۃ المشائغ ۱۲ سال قبل قائم کی گئی تھی۔

ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی ، خواجہ قطب الدین بختیار کا کی ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی تعمیری و روحانی کارنامے، حضرت مجدد الف ثانی کی صداقت

وحق گوئی، حضرت سید احمد بریلوی کا شوقِ شہادت، حضرت شاہ اسمٰعیل کا ذوقِ جہاد، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دینی وعلمی خدمات نظر انداز کردیئے جائیں تو خاک ہند میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ محمد ابن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری کے مسلسل حملے بلا شبہ ایک اسلامی حکومت کی بنیاد کا باعث ہوئے لیکن بھٹکے ہوئے کو راہِ راست پر لانا اور اسفل السافلین سے نکال کر اعلیٰ علیین تک پہنچانا، گم کردہ راہوں کے لئے مشعل ہدایت بنے رہنا، ہمارے اجداد کا دائمی عمل رہا۔

ہمارے اسلاف کے پیش نظر کسی وقت دولت وحکومت نہیں رہی۔ ہمارے اجداد تاج بخش تھے نہ کہ تاج گیر۔ وقت آ گیا ہے کہ اس روحانی افادیت کے مقصد کو روبہ عمل لایا جائے۔ میرے کان میں یہ صدائیں بھی آرہی ہیں کہ ہماری جمعیۃ کا مطمح نظر معاذ اللہ بعض افراد کو گرانا ہے یا ہماری جمعیۃ کسی اسلامی مجلس سے تصادم یا مسلم افراد کی تخریب کے درپے ہوسکتی ہے، ہمارے تصور میں بھی نفاق وشقاق نہیں ہے۔ ہم یہاں تجدید تعمیر کی غرض سے جمع ہوئے ہیں کسی تخریبی جذبہ کے تحت نہیں''۔

بحث ومباحثہ کے بعد صرف (۴ ارکان کے اختلاف رائے) اکثریت کی تائید سے یہ طے پایا کہ جمعیۃ المشائخ کا احیاء ہونا چاہئے، رات کے ۹ بجے اجلاس اختتام کو پہنچا اور اس طرح جمعیۃ المشائخ کا قیام عمل میں آیا۔ (حوالہ : تلخیص ۷/جولائی ۹/جولائی ۱۹۴۱ء رہبر دکن)

جمعیۃ المشائخ کو قائدِ ملت کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس جمعیۃ میں وہ علماء اور مشائخین شریک رہے جو قائدِ ملت کی قومی مساعی کو مسلمانانِ دکن کی سیاسی بقا کی ضمانت متصور کرتے تھے۔ جمعیۃ المشائخ جو مجلس اتحاد المسلمین کی (علماء ومشائخین دکن پر مشتمل) معاون ومخلص تنظیم تھی کا ذکر تاریخ مجلس اتحاد المسلمین یا نواب صاحب کی کسی سوانح میں درج نہیں ہے، اس لئے اس کی مکمل تاریخ نواب صاحب کی سوانح کے جز کی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے۔

◆◆◆

صدر جمعیۃ المشائخ کا بارھواں سالانہ اجلاس

قائدِ ملت کی شرکت اور یادگار تقریر

صدر جمعیۃ المشائخ حیدرآباد دکن کا بارھواں سالانہ اجلاس ۲۷/ اگست ۱۹۴۲ء کو صبح ۹ بجے زمرد محل ٹاکیز میں بصدارت مولانا ابوالفتح سید شاہ لاڈلے حسینی صاحب بندہ نوازی منعقد ہوا، جلسہ سے پہلے مولانا سید پاشاہ صاحب قادری الموسوی نے پرچم آصفی بلند کیا۔ طلبہ انیس الغرباء نے سلامی دی۔ رسم پرچم کشائی کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ بعض امراء پائیگاہ عہدہ داراں سرکار عالی اور قائدین کے علاوہ عوام سے زمرد محل معمور تھا۔

جلسہ کی کارروائی قاری حسین شاہ صاحب جامعہ نظامیہ کی قرأت سے ہوا۔ انیس الغرباء کے طالبِ علم نے نعت سنائی۔ مولانا سید وحید پاشاہ صاحب قادری کی دُعا کے بعد مولانا سید شاہ عبدالکریم حسینی صاحب بغدادی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ سید محمود پاشاہ صاحب قادری نے ۱۲ سالہ رپورٹ سنائی۔ معتمد نشر و اشاعت حکیم لئیق احمد صاحب نعمانی و فایق نعمانی نے پیامات سنائے جن میں : ۱) حضرت سجادہ نشیں صاحب دیوان اجمیر شریف ۲) علامہ نواب ضیاء یار جنگ بہادر ۳) مولانا قطب الدین عبدالوالی ۴) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۵) مولانا قطب الدین صاحب نہری الاقادری اورنگ آباد ۶) مولانا سید شاہ صابر حسینی ۷) نواب سرامین جنگ بہادر ۸) نواب مرزا یار جنگ ۹) مولوی نصیر الدین احمد منصف دیپاپور ۱۰) قاضی صاحب بمبئی ۱۱) مولانا حکیم سید عبدالاحد صاحب بمبئی ۱۲) مولوی سید احمد صاحب نہری وکیل وصدر مجلس اتحاد المسلمین اورنگ آباد قابل ذکر ہیں۔

اس جلسے کو مولانا عینی شاہ صاحب نظامی، مولوی سید محمد احسن صاحب، مولانا سید شاہ نور اللہ حسینی افتخاری، مولوی عبدالقدوس ہاشمی نے مخاطب کیا۔ نذیر دہقانی نے کلام سنایا۔

سب سے آخر میں قائدِ ملت نے اس اجلاس میں ایک یادگار تقریر فرمائی۔ مولانا مفتی

عبدالقدیر صاحب بدایونی کی دُعا پر یہ یادگار جلسہ اختتام کو پہنچا۔ (حوالہ : رہبر دکن ۲۹/ اگست ۱۹۴۲ء)

جمعیۃ المشائخ کے اس یادگار جلسے میں اولیاء ہند کی خدمات اسلامی اوران کے فیوض و برکات اور دورِ حاضر میں علماء و مشائخین کے فرائض کے زیرِ عنوان جو یادگار تقریر فرمائی تھی وہ پہلی بار ہدیۂ ناظرین ہے۔

جمعیۃ المشائخ کے اجلاس میں قائدِ ملت کی یادگار تقریر

میرے لئے انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ رہنماؤں کی جمعیت میں حاضری کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ جنھوں نے مجھے یاد فرما کر میری عزت افزائی فرمائی۔

دُنیا میں ہر شخص کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے، جہاں مقصد ختم ہوجاتا ہے حیات ختم ہوجاتی ہے۔ میرے نزدیک کائنات میں محبوب ترین شئی حبیب خدا حضرت رسول اکرمؐ کی محبوب اُمت ہے اس لئے میں نے اپنا مقصد حیاتِ ملت اسلام کی وحدت اور منزل حیاتِ ملت اسلام کی خدمت قرار دیا اور اس خدمت پر مجھے ناز رہے گا۔ توحید ہی بہت بڑی امانت ہے جس کو خداوند لایزال نے اپنے تمام پیغمبروں کے سپرد کیا۔ اگر خدائے تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز معقول ہوسکتی ہے تو وہ توحید ہے، خداوند عالم ڈراتا ہے کہ اگر تم نہ مانوگے تو فنا کردیئے جاؤگے۔ شرک کرنے والوں کو فنا کردیا جائے گا۔ ہم کو چھوڑ کر دوسروں کو مانوگے تو ہماری نوازشات سے محروم ہوجائے گے۔

جمعیۃ المشائخ جیسا کہ اس کی رپورٹ سے ظاہر ہے ملتِ مرحومہ کی ایک خاص جماعت پر مشتمل ہے جس نے اسلام کی تاریخ میں ایک گروہ کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس نے امر بالمعروف نہی عن المنکر کے کام کو اپنے ذمہ لیا۔ مخلوق کو خدا کے آستانہ پر جھکایا اور ذکرِ خدا سے طمانیت کا پیام پہنچایا، خود عامل رہے اور دوسروں کو عمل کی طرف راغب کیا۔ اس زمانہ میں قول سے زیادہ عمل پر توجہ دی جاتی ہے ہر ایک رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ اور لائحہ عمل کی پابندی اپنا فرض سمجھتا تھا وہ جانتے تھے کہ عمل میں ساری قوت ہے اور عمل کے لئے نبی کریمؐ نے بطورِ خاص ہدایت فرمائی۔ حتیٰ کہ آنحضرتؐ نے اپنی ہردل عزیز صاحبزادی بی بی خاتون جنت فاطمۃ الزہرا سے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ عمل کرو، یہ نہ سمجھو کہ تم رسول کی بیٹی ہو بخش دی جاؤ گی۔

جیسے جیسے زمانہ اسلاف سے دور ہوتا گیا، ان کے قلوب تعلیماتِ اسلام سے محروم ہوتے گئے روحانیت کم اور مادیت زیادہ ہوتی گئی۔ اعلاء کلمۃ الحق کی بجائے ذاتی استحصال اثر کرتا گیا جس کی وجہ سے نظامِ اسلامی کی چولیں ڈھیلی ہونے لگیں۔ چند خاص ہستیاں گوشہ ہائے عزلت سے نکلیں، دُنیا کے سامنے سنتِ رسول کو جیتی جاگتی چلتی پھرتی صورت میں پیش کیا۔ اس جماعت میں درزی، موچی، حمال اور مختلف پیشہ کرنے والوں کو ہم پاتے ہیں، یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ وہ کون ہے بلکہ یہ دیکھتے تھے کہ جلنے کی صلاحیت کس لکڑی میں ہے اس پر توجہ نہیں دی جاتی تھی کہ وہ کس جنگل سے آئی، وہ خود جلتے تھے دوسروں کو جلاتے تھے ان ہی سے ایمان کی گرمی تھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والوں میں مجھے برملا اعلان کرنے دیجئے کہ سلطان محمود غزنوی، سلطان شہاب الدین غوری، سلطان علاء الدین خلجی نہیں تھے بلکہ ایک بزرگ ہستی سنجر سے نکلی، چشت کے میدان سے ہو کر اجمیر میں پہنچی اور وہ اللہ کا نعرہ لگانے والی ہستی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جن کے سر ہندوستان کی فتح کا سہرا ہے۔ انھوں نے کفرستانِ ہند کے قلب میں ایمان کی شمع جلائی۔ آپ کے بعد حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت برہان الدین غریب اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے اشاعتِ اسلام میں حصہ لیا اور نورِ ایمان سے سارے ہندوستان کو منور کر دیا۔

ان بزرگوں کی زندگی کے دو مقصد تھے ۱) اپنی روح، اپنے قلب، اپنے خیال، اپنی فکر اور اپنے عمل کو غیر اللہ کے ساتھ انتساب و نسبت سے پاک رکھتے تھے اور خدا کے اندر اپنے آپ کو پاک کر دیتے تھے ۲) جس طرح شمع جلتی ہے اطراف کو منور کرتی ہے، لو سے ٹکرانے والا خود جلتا ہے یہاں تک کہ زبان دہن اور فکر و نظر میں سوائے خدا کے کوئی باقی نہ رہتا تھا جو نزدیک ہوتا اللہ کا نعرہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

یہاں تک جذب کرلوں کاش تیرے حسن کامل کو
تجھی کو سب پکار اُٹھیں گذر جاؤں جدھر ہو کر

قوموں کی زندگی کو صحیح قسم کا انسان ہی بدل سکتا ہے، خانقاہ کی بنیاد آقائے کائنات نے رکھی۔ اس خانقاہ نے ایسوں کو پیدا کیا جو نورِ محمدی لے کر باہر نکلے، ہندوستان کی شمع نے دکن میں جو

ضو پھونکی وہ حضرت شاہ راجو قتال کے عالی قدر فرزند حضرت خواجہ بندہ نواز تھے جنھوں نے دکن میں پہنچ کر انقلاب پیدا کر دیا۔ آج دکن کی سرزمین ۲۰ لاکھ مسلمانوں کو ان ہی کی وجہ سے پیار رہے ہیں اس میں بہمنی سلاطین کا کوئی حصہ نہیں ——— بادشاہت ہو یا فقیری ہو، ان دونوں میں ایک ہی چیز پائیں گے جب اس کی شرط محنت وکسب نہیں رہی بلکہ وراثت وابویت ہوگئی۔ اس دن سے اسلام اپنے مقامِ اصلی سے نیچے اُتر گیا۔ شیطان کے بہت سے ہاتھ ہوتے ہیں ان میں سب سے بڑا نظر آنے والا وہ ہاتھ ہے جو لوحِ قلب پر لکھ دیتا تھا۔ لفظ ''تو'' کو مٹا دیتا ہے۔ وہ دن شیطان کی کامیابی اور خدا کی شکست کا ہے جس دن زندگی کا انحصار میری اپنی بڑائی پر نہیں باپ کی بڑائی پر ہو۔ اس دن بڑائی کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ میں نے اس کو فقیر ہی کے ساتھ نہیں بادشاہت کے ساتھ بھی رکھا، میں چاہتا ہوں کہ ان بزرگانِ دین کی مسند پر بیٹھنے والوں کو اپنا صحیح مقتدی رہبر دیکھوں۔ جب میں اپنے آپ کو قیادت کے مقام پر پاتا ہوں تو شرم آتی ہے۔ یہ قوم کی کوتاہ بینی ہے یا ان کی بے توجہی ہے، جس چیز کا میں اُمیدوار ہوں وہ تھوڑی توجہ کی مستحق ہے۔ جس طرح شراب سے نشہ نکل جائے تو پھر وہ شراب نہیں رہتی، اسی طرح سے خلوص کو اگر نکال دیا جائے تو عمل عمل نہیں رہتا۔ میری کامیابی کا اگر کوئی راز ہے تو وہ اخلاص ہے۔

جمعیۃ المشائخ کا یہ اجتماع قوم کی اُمیدوں کی صبح کی آمد ہے۔ خدا شاہد ہے میں انسانی زندگی میں مذہب کا مقام سب سے بڑا اور بلند پاتا ہوں۔ میں سیاست کے میدان میں ہوں اگر میری سیاست قرآنی نہیں ہے تو وہ شیطانی ہوگی اور میری سیاست کا مطلب اعلاء کلمۃ الحق نہیں ہے تو پھر میں غلط راستہ پر جا رہا ہوں۔ بندوں کے ساتھ وابستگی نہ اسلام کا شعار تھا نہ شعار ہے۔ خدا سے وابستگی ہی شعار ہوسکتا ہے۔ مادی مغربی تعلیمات نے خدا سے انسان کو دور کر دیا، خدا سے نزدیک ہونے کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ خدا کی محبت پیدا کی جائے یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب کے مذہب سے محبت پیدا کی جائے۔ کیا انھوں نے یہ تعلیم نہیں دی کہ خدا میں فنا ہونے سے پہلے شیخ میں فنا ہونا چاہیئے۔

بزرگانِ محترم سنو! نوجوان دین سے بھٹک رہا ہے، مادیت پرستی کی طرف مائل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دین دار بنے۔ نوجوان دین دار کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مسلمان کو دیکھنا چاہتا ہے جو

ہوائی جہاز پر بیٹھنا بدعت نہ سمجھے بلکہ ایسا ہو کہ اس کا ہاتھ تو ہوائی جہاز چلا رہا ہو اور دل عرش سے ٹکرا رہا ہو۔ ایک وقت تھا کہ وہ مطلوب تھے میں طالب بن جاتا تھا، وہ نہ مانگتے تھے میں مانگتا تھا وہ نہ دیتے تھے مجھے ٹکرانا پڑتا، مشقت کرنی پڑتی تھی، ان کی زبان سے ایک لفظ نکلتا تھا اور میری کھیتی کو سرسبز کر دیتا تھا لیکن آج آپ طالب ہیں میں مطلوب۔ مجھ سے طلب جاتی رہی۔ مجھے طالب بنانا آپ کا مطلوب ہونا چاہئے۔ میرا نوجوان کارل مارکس کو سمجھ سکتا ہے لیکن خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں سمجھ سکتا۔

مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ہم متوازی اداروں کے متعلق اعلان کر چکے ہیں لیکن جمعیۃ المشائخ کے قیام کا کیا مقصد ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کے بازوؤں کی طاقت تنہا اپنے بازوؤں میں جمع کر کے اس کو کچل دوں گا جو ایک ہی مقصد لے کر آئیں اور مسلمانوں کو بانٹ دیں۔ ایک مقصد لے کر دو ادارے بنانا اپنے پیر پر آپ کلہاڑی مارنا ہے اور جو مسلمانوں کی ایک خاص رنگ میں اصلاح کا کام لیں، میں ان کی خدمت کو اپنا فرض سمجھوں گا اور ایک رضا کار کی حیثیت سے حاضر رہوں گا۔ اگر جمعیۃ کا مقصد سیاسی مسائل میں آ کر مجلس سے ٹکرانا نہیں ہے۔ وحدتِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنا نہیں اور مسلمانوں کو ایک وحدت پر جمع کرنا ہے تو میں جمعیۃ میں ایک رضا کار کی حیثیت سے حاضر ہوں اور جس دن ان کا کام وصل کی بجائے فصل ہوگا۔ خدا شناسائی کے بجائے خود پرستی ہوگا، ملت کی بھلائی کے بجائے نفس پرستی ہوگا، اس دن سارے ادب احترام کو بالائے طاق رکھ کر، ساری صلاحیتوں کے ساتھ جو کھڑا ہوگا تو وہ بہادر خاں ہوگا اور اس کو ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا ایک اہم فرض سمجھے گا۔

جمعیۃ المشائخ کا کام ہے کہ مسلمانوں میں خدا کا ڈر پیدا کرے، اعمال کی اصلاح کا کام انجام دے، سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرے، شراب خوری کو دور کرے، زنا کاری سے بچائے، حلال وحرام میں تمیز پیدا کرے۔ مسلمان بدترین قوم بن گئے۔ جھوٹ کی عادت پڑ گئی، چوری ڈاکہ بہت ہو گیا ہے۔ مشائخین کرام اُٹھیں **ان الارض یرثھا عبادی الصالحون** مسلمان کو صالح بنانے کا کام کریں اور ان کو وراثت کے قابل بنانے کا کام میرا ہے۔ اسلام کے نور سے ابھی کئی نقوش بے بہرہ ہیں۔ آپ کی موجودگی اور کفر کی یہ کثرت، کیا سورج نکلنے کے بعد اندھیرا رہ

سکتا ہے۔ کیا آپ میں آفتاب روحانیت نہیں ہے، آپ کے گنہگار خادم کو آپ نے یاد فرما کر نوازا ہے۔ دکن کی سرزمین کو بادشاہوں کی شمشیروں نے فتح نہیں کیا۔ آپ کی زبانوں نے قلوب کی دُنیا کو بدلا ہے اس لئے دکن کی سرزمین کا چپہ چپہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ شیطان بیٹھا آپ کی شکست پر مسکرا رہا ہے۔ یزداں بہ کمند آور کا درس دینے والو مجھے ابلیس کی یہ مسکراہٹ نہیں بھاتی۔ اگر میں نے گستاخی کی ہے تو چھوٹا سمجھ کر معاف فرمایئے۔ آپ میری رہبری ورہنمائی فرمایئے ——————

دُعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اگلا مقام پھر عطا کرے، خدا آپ سے وہ کام لے جو خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ سے، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے لیا تھا۔ اللہ آپ کے قلوب کو مصفع کی و مصفا کردے، آپ کی آنکھیں اس کو دیکھیں، دل اس کو جانیں اور کان اس کو سنیں۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
تیرے ذکر سے، تیری فکر سے، تیری یاد سے تیرے نام سے

◆◆◆

نواب بہادر یار جنگ کا دورِ صدارت مجلس اتحادالمسلمین

چھ ماہ کی بلادِ اسلامیہ کی سیاحت نے بصیرت و آگہی کو تازگی بخشی، اس وقت تک قائدِ ملت بارہ اسلامی علمی اور اصلاحی اداروں سے منسلک تھے۔ متذکرہ انجمنوں اور اداروں میں مجلس اتحادالمسلمین بھی شامل تھی جس کے بانی ارکان میں نواب بہادر یار جنگ شریک تھے۔ ابتداء ہی سے مجلس کے مسلک اور مقصد سے ان کو دلچسپی رہی۔ لیکن ۱۹۳۳ء سے ان کو مجلس کے کاموں سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ مجلس کے قائد کی حیثیت سے متعارف و مشہور ہو چکے تھے اور اب عنان مجلس ان کے ہاتھوں میں تھی۔

مجلس اتحادالمسلمین کے جدید دستور کے نفاذ کے بعد ۱۹۴۰ء کو بہادر یار جنگ بلا مقابلہ صدر مجلس منتخب ہوئے۔ اس وقت تک مجلس اتحادالمسلمین کے ذریعے مسلمانوں کو متحد کرنے اور آنے والے خطرات سے ان کو مقابلے کے قابل بنانے اور حکومت کو مسلمانوں کے مقام اور مرتبہ سے واقف کروانے کے بنیادی کام سرانجام پا چکے تھے۔

صدارت کی گراں بار ذمہ داری ایک ایسے پر آشوب زمانے میں ان کے کندھوں پر آئی جب کہ برطانیہ ہند سے اُٹھنے والی سیاسی تحریکوں کی سیلابی موجوں کا رُخ پوری طرح ساحل دکن کی طرف تھا اور دوسری طرف یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی، پولستان پر حملہ کر کے دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز کر چکا تھا۔ اس جنگ کے اثرات ہندوستان پر بہت گہرے مرتب ہوئے، جنگ کے دوران سیاسی بازی گری نے مصالحت کے پہلو نکالے۔ سیاسی شعور کی بنیاد پر ہندوستان کو مابعد جنگ مقبوضاتی درجہ دینا طے پایا۔ ایسی صورت میں حیدرآباد کی سابقہ خودمختار حیثیت کی بنیاد پر مفوضہ علاقوں کے استرداد اور حلیف برطانیہ کی حیثیت میں، ریاست کی کامل خودمختاری کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس خصوص میں مسٹر گڈنی رزیڈنٹ سے قائدِ ملت نے خصوصی ملاقات فرمائی۔

صدر اعظم بابِ حکومت کو ایک جامع یادداشت پیش کی، ساتھ ہی ہندو ریاستوں میں

مسلمانوں کے حقوق کے مسائل کی یکسوئی کے لئے ریاستی مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا، ریاستی مسلمانانِ ہند کی وحدت، مستقبل میں سیاسی اقتدار کی بقاء کی ضمانت کا واحد وسیلہ تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ جہاں سیاسی ہتھیار کے لئے مضراب فراہم کرگئی، وہیں جنگ کے پیدا کردہ مسائل معاشی واقتصادی ابتری کا باعث بن گئے یہی وہ دور تھا جس دور میں قائدِ ملت کی حیات بخش قیادت نے برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی، مذہبی، تمدنی اور سیاسی حقوق کی حفاظت وصیانت کے سامان پیدا کئے جو ذہنی وفکری بیداری کا نتیجہ تھے۔ ان کے دورِ صدارت کے خطبہ اول سے خطبہ پنجم تک جنگ کے عواقب اور ہندوستان کے مستقبل میں حیدرآباد کی حیثیت کا مسئلہ غور طلب اور حل طلب رہا۔

''دوسری عالمگیر جنگ آج صفاتِ انسانیت کی تباہی کا سامان پیدا کررہی ہے، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کرنی ہے کہ دو متحارب فریقوں میں کون برسرِ حق ہے لیکن مجھے یہ ضرور دیکھنا ہے کہ اس عظیم الشان جنگ کے نتائج وعواقب ہندوستان اور حیدرآباد پر کیا مرتب ہوں گے۔

جو سوال کبھی کبھی حیدرآبادی مسلمان کے دل میں کھٹک جاتا ہے اور اس کو بےچین کردیتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کی بے ریا، مخلصانہ اور وفادارانہ دوستی کا تاریخ کے ہر دور میں ان کو کیا صلہ ملا اور آئندہ وہ کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اگر اس جنگِ عظیم کا نتیجہ یہی ہے کہ دوسو سال کا غلام ہندوستان دُنیا میں پھر ایک مرتبہ زیرِ سرپرستی تاج برطانیہ آزادی کی سانس لے تو اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یقیناً یہ ہونا چاہئے کہ حیدرآباد نے جتنے اقتدارات ذمہ داریاں اور جتنے علاقہ جات ومقبوضات تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے حلیف کے تفویض کئے تھے، وہ سب بلا کسی شرط کے اس کو واپس کردیئے جائیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوں گے کہ ایک طرف حیدرآباد کے جغرافیائی حدود میں برار شمالی سرکار اور مچھلی پٹن داخل ہوں گے اور دوسری طرف حیدرآباد ایک آزاد اسلامی سلطنت کی حیثیت سے آزاد ہندوستان اور دُنیا کے دوسرے آزاد ممالک سے اپنے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہوگا''۔ (حوالہ : خطبات بہادریار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد)

ایک طرف مسلمانوں کے قائد کی یہ مساعی کہ حیدرآباد اپنے پورے شاندار ماضی اور

سابق جغرافیائی موقف کے ساتھ ایک اسلامی حکومت کی صورت میں آزاد و خودمختار حکومت کی حیثیت سے باقی رہے تو دوسری طرف نام نہاد ناخدا کی ناعاقبت اندیشی کا یہ حال کہ بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے اور دام موج کے پہنچنے سے پہلے وہ کشتیِ حیات کو غرق کردینے پر مائل تھے۔

ناعاقبت اندیش نام نہاد ناخدا کے حال زار پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ ملت نے ارشاد فرمایا :

''ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہیں، طوفان آرہے ہیں، سطحِ مرتفع دکن کے خاک کے ذرے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھ کر دعوت دے رہے ہیں اور کشتی دکن کے نام نہاد ناخدانِ طوفانوں کو اُٹھتا ہوا دیکھ کر لرزہ بر اندام حیات سے مایوس اور دامِ موج کے پہنچنے سے پہلے کشتیِ حیات کو غرق کردینے پر مائل نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد کی انفرادیت اور استقلال کی بقاء ضروری ہے۔ میں آج بھی اس کو اپنے مقصدِ حیات میں سے ایک سمجھتا ہوں''۔(حوالہ : خطبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد)

قائدِ ملت کے اس اعلان آزادی کے مطالبہ سے حکومتی حلقہ میں زلزلہ آگیا۔ حیدرآباد میں رزیڈنس سے دہلی اور شملہ کے دفاتر سیاسی میں ہل چل مچ گئی۔

حیدرآباد کے آزاد سیاسی موقف کی بحالی کے مسئلہ کو انھوں نے اپنے دورِ صدارت میں اولین توجہ کا مرکز بنایا اور اس خصوص میں ان کی جدوجہد جاری رہی۔ قائدِ ملت کی کوئی سیاسی تقریر اور خطبہ صدارت اس پانچ سال کے عرصے میں ایسا نہیں ہے جس میں حیدرآباد کی آزادی کی بحالی اور پیرامونسی کے نظریہ کی مخالفت سے خالی ہو۔

اس خصوص میں نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری صدر اعظم مملکتِ آصفیہ کو مجلس اتحاد المسلمین کے قائد کی حیثیت سے اس مسئلہ پر ان کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

مسٹر چرچل کے حالیہ اعلان اور سر اسٹافورڈ کرپس کی آمد کی خبروں نے ہندوستانی سیاست میں ایک نئے باب کا افتتاح کردیا۔ جب سے ہز ایکسلنسی وائسرائے نے وفاقِ ہند کی اسکیم کو ختم جنگ تک کے لئے ملتوی فرمایا اور ہندوستان کو قانون ویسٹ منسٹر کے مطابق مقبوضاتی مرتبہ دینے

کا اعلان کیا۔مجلس اتحاد المسلمین اس امر پرغور کرتی رہی ہے کہ ہندوستان کومقبوضاتی مرتبہ حاصل ہونے کے بعد حیدرآباد کا موقف کیا ہوگا۔اس کی نسبت اپنے تفصیلی خیالات مجلس نے ایک یادداشت کی صورت میں ظاہر کردیئے تھے، رائیٹ آنریبل سراکبر حیدری مرحوم نے اس کے جواب میں مجلس کو بذریعہ نیم سرکاری مؤرخہ ۹/ آیان ۱۳۴۹ ف مطلع فرمایا کہ ''یادداشت میں جن اُمور کا تذکرہ ہے ان پر نہ صرف سابق میں کامل غور وخوض کیا گیا ہے بلکہ جنگ سے جو نئے حالات رونما ہوئے ہیں اور (Dominion Status) کے متعلق جو حالیہ اعلان کیا گیا ہے ان کی روشنی میں بھی سرکارِ عالی ان پر متوجہ ہے، مجلس کی اس یادداشت کے شائع ہونے کے بعد حیدرآباد کے ہندوزعماء نے بھی اس کی تائید میں اپنے بیانات شائع کئے۔مجلس نے حکومت کے اس جواب سے ایک گونہ اطمینان محسوس کیا تھا لیکن مجلس اب تک بے خبر ہے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں کیا ضروری کارروائی فرمائی۔اب جب کہ سراسٹافورڈ کرپس کے ہندوستان بھیجے جانے کا اعلان ہوا ہے۔مجلس جناب کی توجہ کو اس طرف منعطف کرانا ضروری تصور کرتی ہے۔ یہ امر یقیناً جناب کے پیش نظر ہوگا کہ حیدرآباد کی حیثیت ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بالکل مختلف ہے۔حیدرآباد کا معاہداتی موقف ہمیشہ ایک آزاد اور خودمختار سلطنت کا رہا ہے، اس لئے مجھے اور مجلس کو یقین ہے کہ اس کے مسائل پر عام ریاستی مسائل سے ہٹ کر خصوصی حیثیت میں غور کیا جائے گا حیدرآباد نے اپنے حلیف کی ہر آڑے وقت میں جس کشادہ پیشانی اور وسعت قلب کے ساتھ امداد کی ہے اس کے حقیقی اعتراف کا اگر کوئی وقت ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے۔

(حوالہ : مکتوب نمبر ۲۶۹ مؤرخہ ۱۹/مارچ ۱۹۴۲ء بنام صدر اعظم مملکت اسلامیہ آصفیہ)

قائدِملت نے سراسٹافورڈ کرپس کی آمد کے موقعہ پر دہلی میں حیدرآباد کے معاہداتی موقف پر ان سے نمائندگی کی۔

برطانوی حکومت نے جب ہندوستان کو قلمروی مرتبہ دینے کا اعلان کیا تو بہادر یار جنگ کے سمند ناز کو ایک اور تازیانہ لگا۔انھوں نے پیراموشی کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس مطالبہ میں شدت پیدا کردی۔سیاسی بصارت کا تقاضا یہی تھا اور اس خصوص میں قائدِ ملت کو فوری فیصلہ کرکے دکن کے سیاسی مستقبل کی صیانت کی ضمانت حاصل کرنا تھا

’’سیاست سے زیادہ کسی اور شعبۂ حیات میں فوری فیصلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ مستقل ذاتی رائے رکھتے تھے، بڑی سے بڑی ذمہ داری اپنے سر لینے سے نہیں گھبراتے تھے‘‘۔

(حوالہ : دکن کی ایک کثیر جہتی شخصیت ازڈاکٹرحمید اللہ صفحہ۴ روحِ ترقی ۱۳۶۷ھ)

نواب بہادر یار جنگ کی قیادت کا زمانہ سیاسی اعتبار سے پر آشوب رہا اور ان کے قیادت کے دائرے کی وسعت نے ان کی ذمہ داریوں کو لامحدود کردیا تھا۔

اتحاد المسلمین کی گرانقدر قیادت کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ مسلم لیگ اور ریاستی مسلم لیگ کی ذمہ داریوں اور اس منصبِ قیادت کی حرکیاتی جدوجہد نے حیدرآباد کے فرمانروا جو سیاسی بصارت وبصیرت سے محروم تھے اور ان کے ہم نوا انگریز دوست اور مسلم مفاد دُشمن اکابرین ووزراء سلطنت نے پتھروں سے چشمے نکالنے اور شش جہات دکن کو سیراب کرنے کی تمنا رکھنے والے قائد کو پابہ زنجیر کرنے کی راہیں تلاش کیں۔ زبان بندی سے اس آزمائش کی ابتداء ہوئی۔ جاگیر، مناصب اور اعزازات سے دستبرداری کے بعد شہر بدری کا منصوبہ بنا اور پھر کرسی وزارت کی پیش کش کے ذریعے ریاض رسول کے بلبل کو محل شاہی میں پر کاٹ کر سنہری پنجرے میں بند کرنے کی کوششیں ہوئیں۔

دوسری طرف انگریز حکمرانوں کے سیاسی مشیر سر فرانس ویلی پوری طرح قائدِ ملت کی سیاسی جدوجہد اور ان کے عوامی رتبے سے باخبر تھے۔ اس خصوص میں ان کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مسلم زعماء میں انگریز حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ان کی ذات سے وابستہ ہے۔

بالآخر اس خصوص میں منصوبہ بند منصوبے کے تحت اس آخری حربے کو اپنایا گیا جس کا اظہار استین کے لہو کی زبان سے ہوتا رہا ہے، جب کہ زبانِ خنجر بے زباں ہوجاتی ہے۔

مجلس اتحاد المسلمین کی صدارت پر فائز ہونے کے بعد سب سے بڑا محاذ حکومت حیدرآباد کی کامل آزادی اور استرداد علاقہ جات کا رہا۔ لیکن ساتھ ہی مجلس اتحاد المسلمین کی تنظیم اور استحکام مسلمانوں کے معاشی، تمدنی، اقتصادی اور سماجی مسائل کی یکسوئی کے لئے منظّم پروگرام کی تدوین اور اس پر عمل آوری کے لئے وسائل کی فراہمی سے متعلق ان کی جدوجہد اور کوششیں جاری تھیں۔ بقول قائدِ ملت یہ ایک حقیقت ہے کہ

''کوئی قوم زندگی کے اہم مراحل میں اپنی بنیادوں کے استحکام کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی''۔

مسلم قوم کی وہ چند خصوصیات جو سرمایہ نازش وافتخار رہی وہ'' **اعتصام بحبل اللہ** '' کے قرآنی تصور پر مبنی تصورِ حیات ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے پرچم تلے دکن کے مختلف فرقوں سے وابستہ مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے ہمارے قائد نے کلمہ توحید کو وسیلہ بنایا اور اس خصوص میں فرمایا :

''اسلام پر وہ عبوری دور پھر آ گیا ہے جب کہ تمام مسائل سے قطع نظر کرکے **من قال لا الـہ الا اللہ فـدخـل الـجـنـۃ** کے اعلان کی ضرورت ہے۔ شیعیت وسنیت ، بدعت ووہابیت ، احمدیت ومہدویت ، سب زمانۂ امن کے لمحات فرصت کی پیداوار ہیں۔ آج جب کہ خانۂ اسلام کے اطراف بارود بچھی ہوئی ہے اور شعلہ کفر اس کو بھسم کرنے کی تیاری کررہا ہے۔ میں کافی سمجھتا ہوں کہ لوگ سب کچھ چھوڑ کر صرف **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پر جمع ہوجائیں۔

(حوالہ : خط نمبر۱۳ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم)

دوسری بات جو قائدِ ملت نے کہی وہ یہ تھی کہ

''کسی قوم کو شاہ راہِ عمل کی طرف لانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اس میں احساس صحیح کا پیدا کرنا ہے جو الحمدللہ پیدا ہوگیا''۔

اب ہمارا کام ختم نہیں ہوجاتا ، سچ تو یہ ہے کہ اب شروع ہوتا ہے اس احساس سے ہمیں کام لینا ہے اور ملک کے سامنے ایک ایسا تعمیری پروگرام پیش کرنا ہے جو صدیوں کی نیند میں مبتلا مسلمانانِ دکن کو نہ صرف کھڑا کردے بلکہ منزل کی طرف سرعت کے ساتھ بڑھنے میں ممد ومعاون ہو۔

ہم گذشتہ دوسو سال سے سلاطین آصفیہ کے آغوش میں امن اور اطمینان کی نیند سوتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی فلاح و بہبود کی ساری ذمہ داریاں اپنی حکومت کے دوش پر رکھ دیں اور اپنے قوائے عمل کو بالکل مضمحل کرلیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ چند روز قبل تک ہم اپنے اجتماعی زندگی کے شیرازہ کو منتشر دیکھ رہے تھے۔ آج بھی نہ کوئی ہمارا مسلم ساز تعلیمی نظام ہے نہ مذہبی واسلامی نقطۂ

نظر سے ہم اپنے آپ کو صحیح مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ نہ معاشی حیثیت سے ہم اس قابل ہیں کہ دوسری مال دار قوموں کے دوش بہ دوش میدانِ سیاست میں دوڑ سکیں ۔ نہ ہم نے اس سادہ اور پرکار اسلامی معاشرہ کی خصوصیات کو باقی رکھا ہے جو کبھی ہمارا طرۂ امتیاز تھا۔ مختلف غیر اسلامی رسم و رواج نے ہمارے معاشرہ کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ مجلس اتحادالمسلمین کے زیر ہدایت ہم اپنا پنچ سالہ عملی و تعمیری پروگرام تیار کریں جوان تمام نقائص کو حکمت و دانائی کے ساتھ رفع کرے اور ہم ایک ایسی مضبوط منظّم خود مکتفی با اُصول اور تعلیمیافتہ جماعت بن جائیں جو آنے والے حوادث کا اپنی قلتِ تعداد کے باوجود پوری قوت سے مقابلہ کر سکیں۔

ہماری ان تمام کوششوں کا انحصار دو چیزوں پر ہے : ایک نہایت مخلصانہ صداقت شعار بے لوث کارکن، دوسرے سرمایہ۔ (حوالہ : خطبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد)

قائدِ ملت کے دورِ صدارت میں مجلس اتحادالمسلمین نے اپنے عظیم الشان نظام العمل کی عمل آوری کے لئے دکن کے ۷۰ لاکھ مسلمانوں سے صرف ۵ لاکھ روپئے چندے کی اپیل کی۔

''غریب اور متوسط طبقہ نے اس رقم کی پابجائی کے سلسلہ میں اپنی کامل دلچسپی اور ایثار کا ثبوت دیا۔ بڑی بڑی مجالس میلاد میں چندے جمع ہونے لگے۔ مقامی شاخوں نے ٹکٹ کے ذریعہ زعماء ملت کی تقاریر کا انتظام کیا۔ مؤتمر مسلم نوجوانان نے میلادی مؤتمر کے ذریعہ دو ہزار روپیہ سے زائد رقم مجلس کے لئے جمع کی، مغلپورہ کی ذیلی مجلس نے میلادالنبی کا عظیم الشان جلسہ منعقد کیا اور مجلس کی اعانت کے لئے ٹکٹ مقرر کر کے بارہ سو کی رقمی امداد بہم پہنچائی۔ مجلس اتحادالمسلمین بازار نورالامراء نے تقریباً بارہ سو روپیہ کی رقم جلسہ تشریح اصلاحات کے ذریعہ صدر مجلس کی خدمت میں پیش کی۔ حیدرآباد اور اضلاع میں اجتماعی و انفرادی طور پر رقم جمع کرنے کی کوششیں مہینوں جاری رہیں ———— مولوی محمد قاسم صاحب رضوی وکیل لاتور نے صدر مجلس کے نام پوری جائیداد اور اثاثہ وقف کر دیا۔ ملتِ اسلامیہ کے بعض اور اصحابِ خیر نے اس جانب توجہ کی لیکن پانچ لاکھ روپیہ کی رقم خطیر کی پابجائی متوسط طبقہ سے ناممکن تھی۔ توقع بھی کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کا متمول طبقہ اس کی تکمیل کی جانب متوجہ ہو جائے گا لیکن یہ خواب نا آشنا تعبیر رہا اور معینہ مدت کے اندر اس رقم کی تکمیل نہ ہو سکی جس کی تمام تر ذمہ داری ملک کے

متمول طبقہ پر عائد ہوتی ہے۔ ''مولوی عبدالرحمٰن سعید''

مجلس کو پانچ لاکھ کی رقم جمع کرنے میں جو ناکامی ہوئی اس مسئلہ میں قائدِ ملت نے اظہارِ افسوس فرمایا تھا۔ ساتھ ہی اس سلسلہ کے حل کی تجاویز بھی ان کے پیش نظر تھیں۔

''سرمایہ کے سلسلہ میں بھی مجھے کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے، میں نے اپنی قومی زندگی میں انتہائی کوشش کی کہ چندہ حاصل کئے بغیر قومی ضروریات کی تکمیل کروں۔ لیکن طویل تجربہ نے ثابت کیا کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مجبوراً دستِ سوال دراز کرنا پڑا۔ مجلس کو اپنے مطالبہ کے مطابق پانچ لاکھ کی رقم جمع کرنے میں جو ناکامی ہوئی اس کے کئی وجوہ ہیں۔ مسلمانوں کے سب سے زیادہ مال دار طبقے دو ہیں : جاگیردار اور عہدہ دار، میں نہایت افسوس کے ساتھ اس کا اظہار کرتا ہوں کہ ان دونوں نے اس چندہ میں کوئی حصہ نہیں لیا، جو کچھ صدر مجلس کو وصول ہوا، میں اس کو تمام تر غریب اور متوسط طبقہ کے مسلمانوں کا ایثار تصور کرتا ہوں۔ حضرت علامہ اقبالؔ علیہ الرحمہ کتنا سچ فرماتے ہیں۔

امراءنشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضاء غرباء کے دم سے

لیکن میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس قلیل اور نا قابل ذکر سرمایہ سے قطعاً قومی ضروریات تکمیل نہیں پاسکتیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی مستقل سرمایہ کا انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مسلم کلچر سوسائٹی کے مطالبات کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو ہم میں سے ہر ایک کی آواز ہے جب تک ہمارے اوقاف منظّم ہو کر ان کی آمدنی خود ہمارے مشورہ سے صحیح طور پر صرف نہ ہو، جب تک ہماری لاوارث معاشوں اور جائیدادوں سے متعلق یہ طے نہ کر دیا جائے کہ ان کی وارث ملتِ اسلامیہ ہوگی اور جب تک ہمیں قانوناً اس کا اختیار نہ دیا جائے کہ ہم مسلمانوں کو فریضہ زکوٰۃ کی ادائی پر مجبور کر سکیں اور بیت المال کو ایک نیم سرکاری ادارہ کی حیثیت نہ دی جائے ، مسلمانوں کے تنظیمی مسائل طے نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے معاشی مستقبل کی کامیابی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ (حوالہ : خطبات بہادر یار جنگ صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲ مرتبہ نذیر الدین احمد)

معاشی پروگرام کے آغاز سے قبل تنظیمی بنیادوں پر پوری سلطنت کے مسلمانوں کو Units

یعنی وحدتوں میں تقسیم کرنا ضروری تھا اور اس طرح ہر وحدت کے لئے ایک کمیٹی کا قیام بھی اس کام کی انجام دہی کے بعد مسلم شماری کے کام کا آغاز ہوا تا کہ اعداد و شمار کی روشنی میں مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی، اقتصادی حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار سے حاصل مواد کی روشنی میں منصوبہ بند طریقے پر معاشی پروگرام کا آغاز ہو سکے۔

ابتداءً دارالمطالعہ و کتب خانوں کے قیام اور جلسہ ہائے عام پر قائدِ ملت نے بڑی توجہ دی۔ ذہنی و فکری بیداری کے یہ ابتدائی لوازم تھے۔

پھر عسکری تنظیم کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کروائی، کیوں کہ سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں قومی بقاء کا انحصار عسکری تربیت کے حصول میں مضمر ہے۔

''عسکری تنظیم تاریخ اسلام کا ہمیشہ سے ایک لاینفک جز رہا ہے۔ مسلمان فطرتاً سپاہی ہے اور اس کے مستقبل کی نجات اسی میں ہے کہ اس کو سپاہی برقرار رکھا جائے''۔

(حوالہ : خطبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیر الدین احمد)

اس آواز کی صداقت نے مسلمانوں میں عسکری نظام سے دلچسپی پیدا کی۔ قوم میں اس نظام کو اپنانے کے آثارِ حیات پیدا ہو گئے اور ابنائے وطن من مانی کے منصوبوں کو روبہ عمل نہ لا سکے

تجارت سے دکن کے مسلمانوں کا تعلق برائے نام تھا۔ تجارت کو عیب سمجھا جاتا تھا۔ قائدِ ملت نے مسلم بافندوں کے ہاتھوں سے بنا کپڑا فروخت کرنے کے لئے مصنوعاتِ دکن کے نام سے پارچے کی دکان قائم کی، خود بیٹھ کر مال فروخت کیا اور اس طرح مسلمانوں کو تجارت کی طرف راغب کیا، جس ترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ کپڑا اجناس اور دیگر کاروبار میں مسلمان تاجر قابل لحاظ تعداد میں نظر آنے لگے۔

اصلاحات کے پر آشوب زمانے سے ۱۹۴۴ء تک حکومت اور عوام کی اطلاع اور عمل آوری کے لئے جو یادداشتیں مرتب ہوئیں ان کی حیثیت دستاویزی ہے، ان ہی یادداشتوں میں ایک نظام نامہ بھی ہے جو نظم و نسق کی اصلاح اور مالیاتی استحکام کی تجاویز پر مشتمل ہے۔ اس نظام نامے میں ملک کی معیشت کو بہتر بنانے اور وسائل سے استفادہ کرنے کے لئے ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا، جس نظام نامے کے اہم نکات میں ۱) شرح تبادلہ کی اصلاح ۲) معدنی دخائر سے

استفادہ نئے ذخائر کی تلاش ۳) بیرونی اجارہ داری کی مسدودی ۴) وسائل نقل وحمل کی ترقی ۵) شہری مقروضیت کی روک تھام ۶) صنعتی بنک ۷) صنعتی کالجوں کا قیام ۸) گھریلو صنعتوں کی ترقی ۹) فنی تحقیقات اور فنی تعلیم کے لئے سرمایہ کی فراہمی ۱۰) خام مال کی بہم رسانی ۱۱) حکومتی سطح پر مصنوعات کی فروخت کا انتظام۔

اور زرعی ترقی کے لئے ۱) وسائل آبپاشی میں اضافہ ۲) زرعی محاصل پر نظر ثانی ۳) زرعی قرض داری کا انسداد ۴) زرعی بنکوں کا قیام ۵) کاشتکاروں کے لئے امدادِ باہمی کے اُصول پر زرعی ضروریات کی فراہمی ۶) اراضی سے محروم طبقات کے لئے زمینات کی فراہمی ۷) زرعی تعلیم کا انتظام۔

اور دیگر تجاویز میں ۱) تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے لئے روزگار کی فراہمی ۲) جاگیرداروں کو نظم ونسق کی تربیت ۳) جاگیری رعایا کو سرکاری رعایا کے مماثل معاشی، سماجی ترقی کے مواقعوں کی فراہمی وغیرہ وغیرہ شامل تھے۔

دکن کے نوجوانوں کو قائدِ ملت نے مذہبی، سیاسی حیثیت سے اس محفوظ منزل پر پہنچادیا جہاں وہ حوادث سیاست ہند کے سیلاب سے محفوظ رہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاسی انقلاب کے سیلاب میں محفوظ رہے ورنہ سیاسی تحریکوں کے سیلاب انھیں تنکوں کی طرح حوادث کے سمندر میں بہالے جاتے۔ان کا نصب العین متعین ہوا اور اس طرح وہ معاشی تمدنی اعتبار سے بھی اپنے مستقبل کو سنوارنے کے قابل بن سکے۔ساتھ ہی یہ ضروری تھا کہ قوم کے معاشی وسائل، معیشت کے استحکام کی ضمانت قبول کرتے ،حکومت پر تکیہ اور حکومت کی مسلمانوں سے عدم دلچسپی کے باعث مسلمان معاش کے تمام نفع بخش ذرائع سے محروم ہو چکے تھے۔

مستقبل میں مبتدل سیاسی حالات ان کو زیر وزبر نہ کرسکیں۔اس خیال کے پس منظر میں یہ صورتِ حال اور بھی پریشان کن تھی کہ جاگیر منصب، جمعداری، اہل کاری پر تکیہ نئی نسل کے لئے ''سراب'' سے کم نہ تھا۔اس منزل میں نئی نسل کو وسائل معیشت سے آگاہ کرنا اور انھیں زراعت، تجارت اور صنعت کے میدانوں میں لاکھڑا کرنا، ان کے خوش آئند مستقبل کی ضمانت قبول کرنے کے مترادف تھا۔

اس خصوص میں دستکاری کے تعلیمی اداروں کا قیام، پردہ نشیں خواتین کے اوقات بیکاری میں انھیں ایسا ہنر سکھانا جس سے وہ اپنی روزی کا سامان پیدا کرسکیں مثلاً فیتہ سازی، دیا سلائی اور سگریٹ کی ڈبیاں بنانا، لفافہ سازی، مٹی کے کھلونے، کارچوب سازی، زرگری، سلائی وغیرہ۔

ابتداءً مسلم بافندوں سے معاشی پروگرام کا آغاز ہوا مگر اس کے بعد اس پروگرام نے وسعت اختیار کی کیوں کہ حیدرآباد کی صنعتیں صرف معاشی امداد کی عدم دستیابی اور مال کی نکاسی کے ذرائع کی فراہمی سے محرومی کے باعث دم توڑ رہی تھیں۔

دکن کی صنعتوں میں اورنگ آباد کا ہمرو، پٹن کی ریشمی اور زردوز قوریں، نرمل کی نقاشی اور لکڑی کے کھلونے، کریم نگر کی چاندی کا نقشی اور جالی کا کام۔ نارائن پیٹھ، سنگاریڈی، آرمور کی ریشمی بافت کی ساڑیاں اور کپڑا، ورنگل کے قالین اور شطرنجیاں، دکن کی مشہور صنعتیں تھی۔ اس خصوص میں قائدِ ملت نے تفصیلی معلومات حاصل کئے اور ان کی کوششوں سے ان نیم مردہ صنعتوں کو حیاتِ نو عطا کی۔ اس خصوص میں قائدِ ملت نے حیدرآباد اور گھریلو صنعتیں کے زیر عنوان تحقیقی مواد پر مشتمل اپنے مضمون میں ان صنعتوں کی اہمیت اور اس کی بقاء کے لئے حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا :

''دکن کی وہ سطح مرتفع جو آج سلطنتِ حیدرآباد کہلا رہا ہے، وہ صنعتی ترقی میں نہ کبھی کسی سے پیچھے تھی اور نہ آج اس کی صلاحیتیں بالکل فنا ہوچکی ہیں۔ حکومتِ برطانیہ کے ہندوستان پر تسلط نے اور مشینری کے ذریعے صنعت کی ترقی نے گو ہندوستان دستکاری اور حیدرآبادی صنعتوں کو بہت نقصان پہنچایا، اس کے باوجود ان کا اس وقت تک عالم وجود میں ہونا اس کی صلاحیت، حیاتِ بقاء کا بہترین ثبوت ہے اور ان کے ترقی کے امکانات کا یقین دلاتا ہے۔ آج بھی اورنگ آباد کا ہمرو، پٹن کی ریشمی اور زردوز قوریں، نرمل کی نقاشی اور لکڑی کے کھلونے، کریم نگر کی چاندی کا نقش و نگار اور الندوگرمگاں ناندیڑ اور نارائن پیٹھ کی پارچہ بافی، سنگاریڈی و آرمور کی ریشمی بافت، ورنگل کی قالین سازی، بیدر کی دست کاری، حیدرآباد کی وہ صنعتیں ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس دور میں حیدرآباد کی صنعتی ترقی کو بھی نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اور نہ صرف پارچہ بافی، کاغذ سازی، شکر سازی وغیرہ کے بڑے بڑے مشینی کارخانے قائم ہوئے بلکہ ملک کی دستکاری کی

ہمت افزائی کر کے ان کے لئے سامانِ حیات اور ملک کے لئے اسبابِ ترقی مہیا کئے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صنعتی نمائشوں کے قیام اور فروخت گاہوں کے انتظام سے ان صنعتوں کی نکاسی کا بندوبست اور ابنائے ملک میں ان کے استعمال کا شوق پیدا کیا گیا لیکن جو کچھ ہوا ان کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زمانہ کی رفتار ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین نے اس کو آج سے کئی سال پہلے محسوس کیا اور نہ صرف مسلم بافندوں کی تا بقدرِ امکان خود امداد کا بیڑہ اُٹھایا بلکہ حکومت کی توجہ بھی اپنے نظام نامے کے ذریعے گھریلو صنعتوں کی ترقی کی طرف مبذول کرائی یہ امر مسلم ہے کہ اس زمانے میں دُنیا کے تمام ممالک کی سیاست معاشی مسائل کے اطراف گھوم رہی ہے اور کوئی ملک اپنی فارغ البالی کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی ضروریاتِ حیات کے لئے تا بحد امکان خود مکتفی نہ ہو اور کسی ملک کا خود مکتفی ہونا اس کی زرعی و صنعتی ترقی پر منحصر ہے۔ صنعتی ترقی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بڑی بڑی مشینی صنعتیں قائم کی جائیں اور ملک کی خام پیداوار کو ضروریاتِ ملک کے مطابق تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ابھی ہمارے یہاں ایسی وسیع صنعتوں کے لئے کافی گنجائش موجود ہے۔ اعظم جاہی، عثمان شاہی اور محبوب شاہی ملز جتنا کپڑا تیار کر رہی ہیں۔ اس سے کئی زیادہ روئی ہمارے یہاں سے برآمد ہوتی ہے اور اس کے امکانات ہیں کہ ہم اپنی چارچہ بافی کی مشینی صنعت کو ترقی دیں، ہمارا ملک کل دُنیا کی پیداوار کے پانچویں حصہ کے برابر روغنی اجناس پیدا کرتا ہے اور ان سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ ہمارے ملک کی معدنیات ابھی تک پردہ خاکی میں روپوش ہیں اور ملک ان سے استفادہ کا حق رکھتا ہے۔ حکومت ان تمام اُمور کی طرف متوجہ ہے اور ضرورت ہے کہ ایک طرف ملک کے سرمایہ دار مواقع سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ ہوں اور دوسری طرف ملک کے نوجوان ابھی سے ایسی تعلیم و تربیت حاصل کریں جو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہے لیکن ان بڑی اور وسیع پیمانے پر قائم ہونے والی مشینی صنعتوں سے جہاں پیداوار میں ترقی ہوگی، وہیں اندیشہ ہے کہ بے روزگاری کی وباء ملک میں عام ہوتی جائے گی جو اس وقت دُنیا کے بڑے صنعتی ملکوں میں پائی جاتی ہے، ہندوستان جیسے آباد ملک کے لئے مشینی صنعتوں کے ساتھ ساتھ گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ دیہاتی صناعوں کو شہروں میں جمع ہو جانے سے روکا جائے اور ان کی موجودہ

دستکاری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کو بے روزگاری سے بچایا جائے۔ اضلاع رائچور و گلبرگہ کے دورہ میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ مشینی پارچہ بافی کی ترقی نے جب دستی پارچہ بافی کے لئے بازار میں جگہ نہ رکھی تو سینکڑوں دستی پارچہ بافوں کے گھر اُجڑ گئے اور وہ اپنے پیشے کو ترک کر کے ملازمت یا مزدوری پر مجبور ہوئے یا انھوں نے ترکِ وطن کیا اور بیرونِ ملک کے کارخانوں میں روزی تلاش کرنے لگے۔

دستکاری اور گھریلو صنعتوں کے سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو دریافت کرنے کے قابل ہے وہ ان صنعتوں کے انحطاط کی اصل وجہ ہے اوران کے زوال کے اصلی اسباب ہیں۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی اوراس مسئلہ کا مطالعہ کیا تین ہیں :

۱) خام پیداوار کی فراہمی میں دشواری۔

۲) بدلتی ہوئی دُنیا کے ذوق کی مطابقت کرنے کے لئے صناعوں کی تربیت کا فقدان اور جدید آلات کے استعمال سے ان کی ناواقفیت۔

۳) مال کی تیاری کے ساتھ اس کی فروخت کی ذمہ داری کا بھی انھیں پر عائد ہو جانا اور ان کے مال کی نکاسی کا کوئی انتظام نہ ہونا۔

اگر ان اسبابِ زوال کو رفع کرنے کی کوشش منظّم طریقے پر کی گئی تو مشینی صنعتوں کی ترقی کے باوجود مجھے یقین ہے کہ گھریلو صنعتیں نہ صرف زندہ رہ سکتی ہیں بلکہ بازار میں ان کا مقابلہ کر کے اپنی ترقی کے راستے نکال سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر دیسی پارچہ بافی ہی کو لیجئے اگر اس قسم کی انجمن ہائے امداد باہمی قائم کی جائیں جو پارچہ بافوں کو سوت اور آلات پارچہ بافی فراہم کریں۔ تربیت یافتہ ڈزائنرز کے ذریعہ ان کو بازار کے مقبول اور پسندیدہ ڈزائنز اور پارچہ بافی کی مطلوبہ قسم سے جس کی مانگ ہو واقف کرتے رہیں اور شہران کا تیار کردہ مال ان سے حاصل کر کے اس کی نکاسی کا بھی بندوبست کریں اور سروں پر مال کا بوجھ لئے گاؤں گاؤں اور گھر گھر پھرنے سے ان کو مستغنی کردیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کا بنایا ہوا پارچہ آج بھی ملک میں مقبول اور کامیاب ہو سکتا ہے۔

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ امدادِ باہمی کی کتنی انجمنیں اس مقصد کی تکمیل کر رہی

ہیں تو مجھے تعجب اور افسوس کے ساتھ معلوم ہوا کہ پارچہ بافان، کمبل بافان اور قالین بافان کی ملک بھر میں صرف (۵۹) انجمنیں ہیں، جن کے اس وقت کل (۱۲۵۳) ارکان ہیں۔ میں ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکا ہوں کہ ان انجمنوں کا طریقۂ کار کیا ہے اور ان سے ان صنعتوں کو کس حد تک فائدہ پہنچا ہے میں بھی کچھ دنوں قبل چین میں (کوآپریٹیو انڈسٹریل مومنٹ) کی ترقی پر بعض مضامین اور کتابیں پڑھ رہا تھا جو ۱۸ء سے وہاں شروع ہوا ہے اس تحریک نے چین کی مصیبت زدہ اور جنگ کی وجہ سے خانما برباد آبادی میں ایک نئی لہر پیدا کر دی اور آج جب کہ چین کو رسد کی فراہمی کے تقریباً سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ محض اس تحریک کی بدولت چین کے صناع اپنے ملک کو جنگ کے جاری رکھنے میں مدد دے رہے ہیں اور اپنی کثیر آبادی کو فاقہ کشی کی موت سے بچا رہے ہیں۔ گویا تحریک چھوٹے پیمانے پر شروع ہوئی لیکن آج اس کا جال سارے ملک چین میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں کے دیہاتی صناعوں نے مل کر کام کرنا اور تھوڑی محنت و سرمائے سے زیادہ نفع کمانا سیکھ لیا ہے۔ غور کرنے سے یہ حقیقت نا قابل انکار معلوم ہوتی ہے۔ مذکورہ تین اسبابِ انحطاط میں سے کسی ایک کی تلافی کر کے یا خود صناعوں پر اس کا پورا بار ڈال کر گھریلو صنعتوں کی ترقی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ضرورت ہے کہ ہمارا محکمہ امدادِ باہمی دیہی آبادی کو صرف قرضوں کے بوجھ سے نجات دلانے ہی پر توجہ نہ کرے بلکہ محکمہ صنعت و حرفت کے تعاون کے ساتھ ہر گاؤں کو ایک وحدت قرار دے کر وہاں جس قسم کی دستکاری اور صنعت پائی جاتی ہو، اس کو اجتماعی اور امدادِ باہمی کے طریقے پر چلانے کی کوشش کرے۔ صناعوں کو اشیاء خام فراہم کرے، جدید آلاتِ صنعتی سے روشناس کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے تیار کئے ہوئے مال کی نکاسی کا انتظام کرے تا کہ وہ اطمینان سے اپنی صنعتی ترقی میں مشغول رہ سکیں۔ گھریلو صنعتوں کا ایک قابل توجہ شعبہ زرعی صنعتیں بھی ہیں مثلاً باغبانی اس کے حاصل کردہ میوؤں کی حفاظت، ان سے مربوں اور چٹنیوں وغیرہ کی تیاری، مرغبانی وغیر جانوران زرعی وغیرہ سررشتہ زراعت کی ساری کوششوں کے باوجود ہماری زراعت پیشہ آبادی ابھی ان اُمور کی طرف متوجہ نہیں ہوئی ہے اور نہیں ہوسکتی جب تک افراد کو اس طرف متوجہ کرنے کی بجائے امدادِ باہمی کے اُصول پر جماعتی طریقے پر کام کرنے کا ان کو عادی نہ بنایا جائے اور اس کا انحصار بھی سررشتہ

زراعت کے ساتھ محکمہ امدادِ باہمی کے تعاون پر ہے اس کام کی طرف بھی توجہ کرتے ہوئے گنوار دیہاتیوں کی اس ذہنیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر نئی بات کو خوف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا یہ خوف بڑھ جاتا ہے جب وہ یہ بات باہر سے ان کے سامنے آتی ہے اس لئے گھریلو اور زرعی صنعتوں کی ترقی میں یہ کوشش کرنا ضروری ہے کہ دیہات کے ایسے افراد کا تعاون حاصل کیا جائے جو تعلیم حاصل کرنے کے باوجود دیہی زندگی بسر کر رہے ہوں، یا دیہی مدارس میں اس قسم کا نصاب رکھا جائے کہ وہاں کے تعلیمیافتہ عملی زندگی میں آنے کے بعد اپنے پس افتادہ ہموطنوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوسکیں۔

آخر میں اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس ترقی یافتہ دُنیا میں صرف انسانی دست و باز و صحیح قسم کی قوتِ محرکہ نہیں ہوسکتے ہیں اور ضرورت ہے کہ برقی قوتِ محرکہ کو آبی طاقت سے بعجلت ممکنہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، حکومت کے سامنے یہ اسکیم برسوں سے شرمندۂ تکمیل ہے جب تک اس کے ذریعہ ایک ایک گاؤں بجلی نہ پہنچادی جائے گی اور چھوٹی چھوٹی برقی مشینیں ہر گھر کو ایک چھوٹا کارخانہ نہ بنادیں گی نہ ہم ملک کی صنعتی ترقی کا یقین کرسکتے ہیں نہ ابنائے ملک کو مابعد جنگ پیدا ہونے والے عام بے روزگاری سے بچاسکتے ہیں۔

بلادِ اسلامیہ کے دورے سے واپسی کے بعد سے ویسے تو قائدِ ملت کی دلچسپی مجلس سے قائم و برقرار رہی لیکن ۱۹۳۴ء میں پہلی بار جب ابنائے وقت کے حصولِ اقتدار کی جدوجہد نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور بیرونی سیاسی تحریکوں نے ان کو اپنا آلہ کار بنایا اور پرامن دکن میں شورشیں سر اُبھارنے لگیں۔ اس وقت سے مسلمانوں کو منظّم کرنے، مجلس کو طاقتور بنانے، ان میں سیاسی شعور اُجاگر کرنے، حکومت کو مسلمانوں کے موقف سے اوران کے مطالبات سے واقف کروانے، آریہ سماجی اور دیگر ہندو تنظیموں کی جانب سے ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبہ پر تشدد اختیار کرجانے پر مدافعتی کارروائیوں کو آگے بڑھانے، اصلاحات کو مفادِ ملت کے مطابق بنانے کی سعیِ مسلسل میں ان کے شب و روز گذرے اور جب وہ ۱۹۴۰ء میں مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ دور وہ تھا جب دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوچکا تھا۔ مابعد جنگ حیدرآباد کے معاہداتی موقف کے پس منظر میں آزاد حیدرآباد کا حصول قائدِ ملت کا مطمع نظر بن گیا۔ اس طرح قائدِ ملت کو سیاسی

محاذ پر صف آرائی کرنی پڑی۔لیکن ساتھ ہی ریاست حیدرآباد کے مسلمانوں کی معاشی واقتصادی، تمدنی وتعلیمی مسائل کے حل کے لئے تجاویز اور عملی اقدام کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

عسکری تنظیم،حربی کالج کے قیام اور اسلحہ کی تیاری کے کارخانے ،معاشی نظام جو زرعی و صنعتی پہلوؤں پر مشتمل تھا اُردو زبان کی بقاء اور اُردو ذریعہ تعلیم کے ذریعے اس زبان کی ترویج و اشاعت کے منصوبے،ریاست حیدرآباد کی انتظامی خرابیوں کی اصلاح کی تجاویز،تعلیم کی اشاعت کے ذریعے ناخواندگی کے خاتمے اور قومی ترقی کی راہوں کی ہمواری،غرض ریاست حیدرآباد کے مسلمانوں کا ہر مسئلہ جو توجہ طلب تھا وہ قائدِملت کے پیشِ نظر تھا۔

ملتِ اسلامیہ دکن کی حیاتِ اجتماعی کی فلاح وصلاح اور نجات کا مدار جس مردِحر کی تنہا ذات سے وابستہ تھا وہ بہادر یار جنگ تھا۔

''بہادر یار جنگ کی ساری زندگی ایک حساس اور بے چین دل کی گردشِ پیہم تھی''۔

(حوالہ : رفیق قائدِملت غلام دستگیر رشید صفحہ ۱۷ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد)

◆◆◆

یادداشت بابت اصلاحات دستوری

بگرامی خدمت عالی جناب رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر

صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

جناب عالی ! دکن کی چھ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں کو جو تمدنی و سیاسی اہمیت و اقتدار حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، اس تمام زمانۂ اقتدار میں اس جماعت نے دکن کی جو مختلف النوع خدمات انجام دیں، مختلف طبقوں اور فرقوں کو مشترک قومیت کے رشتہ میں منسلک کرنے کی جو کوششیں کیں اور جس عدیم المثال رواداری اور یگانگت کا ثبوت بہم پہنچایا وہ ہماری تاریخ کے صفحات میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کی رواداری کا بہترین ثبوت اس دور سے ملتا ہے جب کہ انھوں نے ہر قسم کا اقتدار رکھنے اور ہر نوع کی تنقید و نکتہ چینی سے بے نیاز ہونے کے باوجود اپنے اقتدار کا استعمال کسی جانبداری کے ساتھ نہیں کیا۔ حیدرآباد نے آج معاشی، سماجی اور تعلیمی حیثیت سے جو ترقی کی ہے وہ زیادہ تر مسلمانوں کے اسی جذبہ وطنیت اور بے لوث خدمت گذاری کا نتیجہ ہے اس لئے دکن کے مسلمانوں نے ہمیشہ یہاں کی اسلامی حکومت کو بجا طور پر اپنے سیاسی و تمدنی اقتدار کا مظہر تصور کیا اور آج بھی اپنے قلب و دماغ کی پوری صحت اور صداقت کے ساتھ ان کا یہی سیاسی عقیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف دکن کی حکومت کو ہر قسم کے نقائص سے پاک اور رعایا کے فلاح و بہبود کی ضامن دیکھنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف اس کے دستور میں کسی ایسی تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے جس سے مسلمانوں کی روایاتی سیاسی و تمدنی برتری متاثر ہو یا جس سے مختلف طبقات ملک کے ان خوشگوار تعلقات پر برا اثر پڑے جو حیدرآبادی سماج کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔

مسلمانانِ دکن کے اس عقیدہ کی وضاحت ان کی واحد نمائندہ جماعت صدر مجلس اتحاد المسلمین کے مسلک کی ان چند دفعات سے بخوبی ہوسکتی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کے لئے کوئی جدید دستور قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ اس میں حسبِ ذیل اُمور کا تحفظ نہ کیا گیا ہو۔

۱) حیدرآباد کی حکومت ایک کامل الاقتدار بادشاہت ہو جس پر ہمیشہ آصفجاہی خاندان کا ایک مسلمان رکن متمکن رہے۔

۲) ہندوستان کے وفاقی دستور میں حیدرآباد کی شرکت اگر ناگزیر متصور ہو تو حیدرآباد صرف اسی صورت میں مناسب اور شایانِ شان حصہ لے سکے گا جب کہ اس کا سیاسی اقتدار، مالیاتی توازن اور معاشی ترقی کے امکانات متضرر نہ ہوں۔

۳) اگر ملک کی ترقی کے لئے موجودہ دستور میں کوئی تبدیلی ناگزیر متصور ہو تو مسلمانانِ دکن کسی ایسی تبدیلی کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس سے مسلم جماعت کی وہ روایاتی سیاسی برتری متاثر ہو جو حیدرآباد کی تاریخ میں اس کو صدیوں سے حاصل رہی ہے۔

توضیح

(الف) مقنّنہ و ادارہ جات مقامی حکومت خود اختیاری کی ترکیب میں بہر حیثیت مسلمانوں کو آئینی اکثریت حاصل رہے۔

(ب) مسلم نشستیں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ پر کی جائیں۔

۴) اُردو جو ہندوستان بھر کی مشترکہ اور حیدرآباد کی مروجہ سرکاری زبان ہے۔ ہمیشہ حیدرآباد کی سرکاری اور بجز تحتانی جماعتوں کے تعلیمی و جامعاتی زبان رہے۔

۵) ملازمت مسلمانوں کے لئے نہ صرف تاریخی سیاسی وقار کا بلکہ ایک اہم معاشی مسئلہ بھی ہے اس لئے فرقہ واری تناسب کا مطالبہ اس مسئلہ میں پیدا ہی نہیں ہوگا اور مسلمان اس سے محروم ہونے کے لئے کسی حالت میں تیار نہ ہوں گے۔

۶) حیدرآباد میں ہر مذہب و ملت کے لئے جائز آزادی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے اور رہے گی لیکن بادشاہت کا مذہب چوں کہ اسلام ہے اور رہے گا اس لئے عہدۂ صدر الصدور جس سے خدماتِ شرعیہ متعلق ہیں اپنی روایاتی خصوصیات کے ساتھ علیٰ حالہٖ قائم رہے اور مسلم اوقاف اور مسائل مذہبی کے انتظامات سے متعلق ایک آئینی مسلم ادارہ کو حکومت تسلیم کرے۔

۷) حیدرآباد میں شہری آزادی ہر شخص کو بلالحاظ مذہب و ملت حاصل رہے بشرطیکہ اس کا استعمال ناجائز نہ ہو اور اس کو ملک میں باغیانہ اور فرقہ وارانہ جذبات کے اشتعال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

۸) ملک کے اہم پیشوں تجارت، زراعت اور صنعت میں مسلمانوں کا حصہ نفی کے برابر ہے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے، لہٰذا ایسے وسائل و اسباب فراہم کئے جائیں جن سے ان کی معاشی مشکلات رفع ہوں اور وہ ان پیشوں میں شایانِ شان حصہ لے سکیں۔

آج جب کہ ملک شاہ راہِ ترقی پر سرعت کے ساتھ گامزن ہے۔ مسلمانانِ دکن حکومت کی ان اصلاحی تدابیر کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں جو رعایا کی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے اس وقت تک اختیار کی گئیں یا جو آئندہ تنخواہوں میں تخفیف، اخراجات عملہ میں کمی، معاشی ترقی کے اسکیم، محصولات کی منصفانہ تقسیم، محصول آمدنی (Incom Tex) کے نفاذ یا مقامی حکومت خود اختیاری کی وسعت کے طور پر اختیار کی جانے والی ہوں اور ایسے مزید اصلاحات کے متمنی ہیں جو رعایا کے باہمی خوشگوار تعلق کو متاثر کئے بغیر ملک میں معاشی، تعلیمی و سیاسی ترقی کے سامان مہیا کریں، جہاں تک مجلس وضع قوانین کی توسیع اور دستوری تبدیلی کا سوال ہے، مجلس عاملہ صدر مجلس اتحاد المسلمین نے اجلاس منعقدہ ۱۵/اردی بہشت کے ایک ریزولیوشن میں اپنی غور کردہ رائے کو پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ بدقسمتی سے اس وقت ملک میں جو فضاء پیدا کر دی گئی ہے وہ کسی طرح کشادہ دلی سے دستوری اصلاحات کا استقبال کرنے کے لئے سازگار نہیں ہے۔ اس لئے دستوری اصلاحات کے نفاذ سے متعلق ہونے والے اعلان کو ملتوی کر دیا جائے۔

مجلس کی اس رائے کی تائید حضرت حکیم السیاست بندگانِ عالی کے فرمانِ مبارک مترشدۂ ۲۴/ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ نیز خود جناب کی اس تقریر سے ہوتی ہے جو جناب نے بتاریخ ۱۷/ مہر ۴۷ف مجلس وضع قوانین کے ایک عام اجلاس میں فرمائی تھی۔ مسلمانانِ دکن مجلس اتحاد المسلمین کے اس ایقان پر آج بھی اصرار کرتے ہیں کہ دستوری تبدیلی کا اعلان موجودہ فضاء میں نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ سارے ملک کے لئے مصیبت کا باعث ہوگا۔ اگر ملک کی بدقسمتی سے حکومت کو دیگر اصطلاحات کے ساتھ دستوری تبدیلی کے اعلان پر اصرار رہا تو اندیشہ ہے کہ ملک

میں سخت انتشار اور بد امنی پیدا ہو گی۔

ملک میں دستوری تبدیلیاں اسی وقت مفید نتائج پیدا کر سکتی ہیں جب کہ ملک کے بسنے والے مختلف طبقات آپس میں متحد و متفق ہو کر اس دستور کو چلانے میں حصہ لیں اور آپس میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ملک کی بد قسمتی سے اس قسم کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور اب تک ملک کے دو اہم طبقے مسلم جماعت کی کامل آمادگی کے باوجود آپس میں متحد نہ ہو سکے۔ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان اعلانات کو فی الحال ملتوی کیا جائے۔

یہ امر مسلم ہے کہ مقصود غائی اچھی حکومت ہے خواہ وہ کسی طرح سے بھی حاصل ہو، موجودہ طرزِ حکومت میں اگر کسی اصلاح کی ضرورت محسوس بھی کی جا رہی ہو تو اس کو کسی ایسی صورت میں ہرگز مبدل نہ ہونا چاہئے جو چند اور خرابیوں کا اضافہ کر دے، یہ بات اب کسی دلیل کی محتاج نہیں رہی ہے کہ جمہوری طریقہ حکمرانی نے دوسرے اقطاعِ عالم میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً انتخابی طریقہ کو رائج کر کے قوموں کے اتحاد و اتفاق کو سخت نقصان پہنچایا اور کسی قوم یا باشندگانِ ملک کا اتحاد وہ نعمت ہے جو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں دیا جا سکتا اس لئے مسلمان اپنی حکومت کو اپنا یہ غور کردہ مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہے ایسے طریق حکومت سے احتراز کیا جائے جو انتخابات کی کشمکش کو ملک میں پیدا کرے لیکن اگر حکومت ناگزیر وجوہ کی بناء پر نفاذِ اصلاحات سے متعلق اعلانات پر مجبور ہی ہے اور اسی انتخابی طریقہ ہی کو رائج کرنا ضروری سمجھتی ہے تو مسلمانانِ دکن توسیع مقنّنہ کے سلسلہ میں حسبِ ذیل تحفظات کو بنیادی اور لاینفک تصور کرتے ہیں۔

گو یہ مجلس کمیٹی اصلاحات یا ان سفارشات سے متعلق حکومت کے نقطۂ نظر سے باخبر ہونے کے مدعی نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی اصلاحات نے مجوزہ مقنّنہ میں مسلمانوں کے لئے نشستیں محفوظ نہیں کی ہیں جس سے اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ مسلمان ملک میں بلحاظ تعداد کم ہونے نیز ملازمت کے سوا دوسرے معاشی مفادات میں ان کا کوئی قابل لحاظ حصہ نہ ہونے کی وجہ سے مقنّنہ کی اتنی نشستوں کو پر نہ کر سکیں گے جتنی ان کے مسلک کی تکمیل یعنی سیاسی برتری کے بقاء کے لئے ضروری ہوں۔ اس لئے مسلمانانِ دکن کا یہ حق ہے کہ

"مقنّنہ کی ترکیب میں بہر حیثیت مسلمانوں کو آئینی اکثریت حاصل رہے"۔

مسلمانوں کی اس تاریخی اور روایاتی اہمیت کے وزن کو خود ہندو جماعت نے ایک سے زیادہ موقعوں پر تسلیم کیا ہے اور ادعائے اکثریت کے باوجود اس حد تک رضامندی ظاہر کی ہے کہ مقنّنہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی نشستیں مساوی رہیں۔

اس کے اظہار سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہندو جماعت بھی مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے لیکن مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ مطالبہ رہا ہے اور رہے گا کہ مقنّنہ کے نا منتخب نامزد ارکان میں بہر حیثیت ان کو آئینی اکثریت حاصل رہنی چاہئے جس کے بغیر فرقہ وارانہ انتقامی رجحانات کی اس تخریبی رو میں جو آج کل ہندوستان اور خصوصاً حیدرآباد میں جاری ہے۔ مسلمانانِ دکن کی روایاتی سیاسی برتری برقرار نہیں رہ سکتی۔

عدم تحفظ نشست کے علاوہ یہ خبر مسلم جماعت کی انتہائی تشویش کا باعث ہے کہ مجلس اصلاحات نے ان کو جداگانہ انتخاب کے حق سے محروم کر دیا ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ ایک نہایت جائز مطالبہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ورنہ قوی اندیشہ ہے کہ ان کے صحیح نمائندے منتخب نہ ہو سکیں گے اور تحفظ نشست کا منشاء پورا نہ ہوگا، اس لئے مسلمانانِ دکن جداگانہ انتخاب کے حق کو اپنا اساسی اور اُصولی مطالبہ قرار دیتے ہیں۔

ایسے مسودات قانونی کی نسبت جو کسی مذہب یا تہذیب پر اثر انداز ہوں، جناب نے مجلس وضع قوانین کو مخاطب فرماتے ہوئے بتاریخ ۱۷/ آبان ۱۳۴۶ف نہایت درست ارشاد فرمایا تھا کہ ’’یہ اُصول دانشمندانہ اور قرین انصاف معلوم ہوتا ہے کہ دیگر فرقے جو اس سے متاثر نہیں ہوتے اس بارے میں ووٹ دینے سے احتراز کریں‘‘۔

علاوہ ازیں مسلمانانِ دکن مجوزہ دستور میں اس شرط کو لازمی قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں کہ :

’’کوئی مسودہ قانون جو کسی مذہب یا تہذیب پر اثر انداز ہو اس وقت تک قانون نہ بنے جب تک کہ اس فرقہ کے ارکان مقنّنہ کی ۳/۴ تعداد اس کی موافقت میں رائے نہ دے‘‘۔

چوں کہ مسلمانانِ دکن کے یہ ایسے مطالبات ہیں کہ جن کی معقولیت سے کسی مدبر کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور جب کہ ان تحفظات کے بغیر وہ کسی دستوری تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے۔

اس لئے مجلس اتحادالمسلمین نے جو ان کی واحد نمائندہ جماعت ہے جناب کی خدمت میں ان کا فوراً پیش کر دیا جانا ضروری تصور کیا تا کہ حکومت مجوزہ دستور میں ان کو ملحوظ رکھے۔

فقط

پیش کردہ

ارکانِ مجلس عاملہ صدر مجلس اتحادالمسلمین

پیش کردہ

صدر مجلس اتحادالمسلمین حیدرآباد

◆◆◆

اے-آر-پی

A.R.P

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران حیدرآباد میں یہ محکمہ قائم ہوا۔ جس میں نوجوانوں کو ہوائی حملوں سے بچاؤ کی تربیت دی جاتی تھی۔ قائدِ ملت نے اس خصوص میں بڑی دلچسپی لی، وہ چاہتے تھے مسلمان اس تنظیم میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ۔ اس خصوص میں شہر حیدرآباد سے دو ہزار والینٹرس کی بھرتی نواب صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ ساتھ ہی ڈیڑھ سو خواتین کو فرسٹ ایڈ اور نرسنگ کی تعلیم اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کے سلسلے میں ٹریننگ دی گئی۔ ٹریننگ کے دوران الاؤنس بھی مقرر کروایا گیا۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے روزگار کی یہ بھی ایک صورت گری تھی مگر ایسا نہیں تھا۔ بات صرف اتنی اور اتنی سادہ نہیں تھی کیوں کہ نواب صاحب اس ٹریننگ میں خود بھی شریک ہونا چاہتے تھے اور بطورِ خاص طبقہ جاگیرداراں کو اس ٹریننگ سے مستفید ہونے کا مشورہ بھی دے چکے تھے۔ وہ اپنے تدبر سیاسی کی روشنی میں اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"اگر صلاحیتِ عمل آپ کے اندر ہے تو اس کے استعمال کا اس سے بہتر کوئی وقت نہ آئے گا اور اس کی پہلی منزل اے-آر- پی سروس ہے جو ممکن ہے کسی وقت آپ کو شمشیر در دست اور تفنگ بر دوش بنادے"۔

اس خصوص میں نواب صاحب کا خط ، ان کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خط نہیں نوکِ نشتر ہے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، غیر کے جوتے، زمانے نے ان سے صاف کروائے جن کو اپنے بھائی کی جائز اطاعت عار تھی۔

"میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ بہادر خاں کا گلا کٹ سکتا ہے لیکن اس کی کوششیں نہیں رُک سکتیں اور اس کے باوجود میرا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس امانت کی حفاظت کے لئے میں ضمانت

لینے کو تیار نہیں۔ انسان اپنی مساعی کا تو ضامن و ذمہ دار ہو سکتا ہے لیکن نتائج صحیح کی ضمانت خدا کے سوائے کوئی نہیں لے سکتا''۔

جس اے۔آر۔پی کی رضا کارانہ خدمت کو آپ اپنے کفش برداروں سے منسوب کر رہے ہیں، آپ کے جاگیردار بھائیوں نے اس حقیر خدمت کے لئے جوان کی شان سے بہت گری ہوئی تھی، حکومت کو مجبور کر کے ٹریننگ کلاس کھلوائی لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ ٹریننگ کے بعد ان کو ہوائی حملے کی صورت میں برسر موقعہ خدمت انجام دینی پڑے گی تو ان کی تعداد ایک سو سے گھٹ کر صرف پانچ رہ گئی اور آج جب کہ میں خود اس کلاس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ والینٹرز نہ ہونے کی وجہ سے کلاس بند کر دی گئی، جن شاہین زادوں کے دل اتنے کبوتر صفت ہو گئے ہیں۔ آپ ان سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ہاں آپ کی یہ خواہش کہ دارالامراء قائم کیا جائے۔ ہر جاگیردار کے دل کی آواز ہے۔ کیوں کہ وہاں موٹروں کی نمائش، اچھے لباس کے مظاہرے اور زبانی جذبات جان نثاری کے اظہار کا خوب موقعہ ملے گا اور بغیر جسم پر ایک خراش لائے ہوئے۔ ملک کے عوام پر ایک فوقیت جتائی جا سکے گی۔

اے۔آر۔پی کی ٹریننگ اس حفاظت کی ضامن تو نہیں ہو سکتی لیکن اس کا ایک ذریعہ ضرور بن سکتی ہے جس پر میں نے ہفتوں غور کیا ہے۔

بحیثیت آپ کے ایک جاگیردار بھائی کے میرا جاگیرداروں کو یہ مشورہ ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، اپنے دماغوں سے ''پدرم سلطان بود'' کا گھمنڈ نکالیں اور اگر چاہتے ہیں کہ خود وہ اور ان کی اولاد آئندہ زمانے میں دوسروں کی کفش بردار نہ بنے تو جن کو وہ اپنا کفش بردار سمجھتے رہے ہیں، ان کے ساتھ دوش بہ دوش کھڑے ہو جائیں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ آج بابر و شاہ جہاں کے سینکڑوں بیٹے کفش برداری کے لئے بھی ترس رہے ہیں اور کوئی ان کے ہاتھوں سے بھی اپنے جوتوں کو ناپاک کرنا نہیں چاہتا۔

یاد رکھئے! حقیقی عزت مخلوق کی خدمت ہے اور جس جاگیر پر اس وقت ہم کو ناز ہے وہ مجھے عنقریب افسانہ بنتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ سلطنت آصفیہ اگر آج اے۔آر۔پی کے سواء کوئی اور خدمت نہیں کر سکتی اور جاگیرداروں کو تو کیا خود اپنی فوجوں کے لئے اچھے ہتھیار فراہم نہیں کر سکتی تو

اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، یا تو خود آصفی سلاطین ماسبق پر یا ان کے امرائے دولت پر جن کی اولاد ہونے کو آج آپ اور میں قابل فخر سمجھ رہے ہیں اور اپنے اجداد کے کارناموں پر شرمانے کے بجائے اِتراتے ہیں۔ میرے بھائی ۔

دل ہمہ داغدار شد پنبہ کجا کجا نہم

اگر صلاحیتِ عمل آپ کے اندر ہے تو اس کے استعمال کا اس سے بہتر کوئی وقت نہ آئے گا اور اس کی پہلی منزل اے۔آر۔پی (ایر ریڈ پریکاشن) سروس ہے جو ممکن ہے کسی وقت آپ کو شمشیر در دست اور تفنگ بر دوش بھی بنادے۔

(حوالہ : خط نمبر ۲۷۹ صفحہ ۵-۳-۶،۳-۳ مکاتیب بہادر یار جنگؒ جلد اول)

اے۔آر۔پی کے کنٹرولر حمید الدین صاحب تھے، ان کا بڑا اشہرہ تھا۔ بڑی مستعدی سے انھوں نے اپنے فرائض نبھائے۔ موصوف کے اوصاف میں سے ایک وصف، جس پر انھیں اختیار نہیں تھا یہ تھا کہ وہ ضرورت سے بہت زیادہ موٹے تھے، جن پر مجید مرحوم نے ایک شعر لکھا جو شعر تنظیم اے۔آر۔پی سے زیادہ مشہور خاص و عام ہوا ۔

چھوٹی پیالی ، پیالی بڑی ، پیالی کوپ
اے۔آر۔پی کے کنٹرولر حمید الدین توپ

◆◆◆

خطاب وجاگیر سے دست برداری

۱۹۴۱ء

قائدِ ملت کے قومی وملی کاموں میں جو ریاست کی بقاء کی ضمانت تھے، حیدری حکومت کے مشوروں سے قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کر کے نظام آف حیدر آباد نے قائدِ ملت کو اس جگہ لا کھڑا کیا جہاں۔

راستے سب بند ہیں کوچہ قاتل کے سوا

کا پس منظر تھا۔

۸/ ستمبر ۱۹۴۱ء کو جریدۂ غیر معمولی میں نظام کا ایک فرمان شائع ہوا جس کی رو سے معاشداروں کو سیاست میں حصہ لینے کی ممانعت کی گئی لیکن اگر وہ اپنی معاش (جاگیر، منصب وغیرہ) سے دست بردار ہو کر حصہ لینا چاہیں تو وہ اپنے فیصلے میں آزاد تھے۔ یہ فرمان قائدِ ملت کو سیاست سے دست بردار کرنے کی درباری سازش کا آخری وار تھا۔ اس سے قبل مسلسل آزمائشوں سے دوچار ہوتے ہوئے قائدِ ملت مزاجِ باغباں سے واقف ہو چکے تھے۔

اپنی سیاسی زندگی کے تقریباً آغاز ہی میں انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وطن کی آزادی کی منزلِ مقصود میں انگریزوں سے بھی ٹکر ہوگی اور ملک کے مندرجہ ذیل پانچ سرکاری طبقوں میں سے آخر الذکر تین سے بھی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

۱) حقیقی وفادار و بہی خواہ ۲) مرنجاں مرنج و بے ضرر ۳) غدار ۴) بزدل ۵) احمق

اس لئے انھوں نے دو گونہ پالیسی اپنائی۔ ایک تو خانگی زندگی میں کفایت شعاری اور مصارف میں تخفیف۔ اس کفایت سے جو رقم پس انداز ہوا سے جائیداد منقولہ وغیر منقولہ وغیرہ میں لگانا۔ چنانچہ اس پندرہ سال کی کوشش کے بعد وہ اس قابل ہو گئے کہ ان کے امیر گھر کے جو فقیرانہ مصارف تھے خالص خانگی آمدنی سے پورے کر لیں اور جاگیر کی آمدنی سے ایک پیسہ بھی لینے کی

ضرورت نہ رہے۔

اس نقطے پر پہنچنے کے بعد ان کی بہادری بے پایاں ہوگئی اور خود کنگ کوٹھی سے یا تو ان کی بہادری کے امتحان کے لئے یا گورے دباؤ کی مجبوراً پیش بندی کے لئے جو سخت خطوط میں آئے تو یہاں سے جواب سخت تر قسم کے ہی جاتے، خطاب و جاگیر کی واپسی اس کا منتہا تھا‘‘۔

(حوالہ : دکن کی ایک کثیر جہتی شخصیت صفحہ ۳-۴ از ڈاکٹر حمید اللہ روح ترقی رجب ۱۳۶۷ ہجری مطابق جون ۱۹۴۸ء)

درباری سازشوں سے وہ پوری طرح واقف تھے اور اس سازش و آزمائش سے مقابلے کے لئے وہ تیار و آمادہ بھی تھے۔

مجلس کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ملازمین سرکار کو اس میں شرکت کی ممانعت کی گئی اور اب معاشداروں، خطاب یافتہ اور صاحبِ مناصب و اعزاز مسلمانوں کو بھی اس کی شرکت سے ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔ میں اپنے معاشدار ساتھیوں کے جذبات سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ معاشدار رہنے سے زیادہ سلاطین آصفیہ کی نمک خواری کا فرض یہ تصور کرتے ہیں کہ مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ رہ کر تخت و تاج آصفی کی حفاظت کریں لیکن میں اس غلطی کا اعادہ نہ کروں گا جو آج سے بیس سال قبل ہندوستان کے زعماء سیاست نے کی تھی کہ مسلمان بچوں سے مدارس، مسلمان وکلاء سے عدالتیں اور مسلمان ملازمین سے ملازمتیں چھڑوا دیں جن کی تلافی آج تک نہ ہو سکی، میں اپنے تمام معاشدار ارکان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ مجلس اتحاد المسلمین سے الگ ہو جائیں، میں جانتا ہوں کہ اس سے ان کے جذبات ایثار کو ٹھیس لگے گی۔ لیکن کیا تعلیماتِ اسلام میں ایک بڑی قربانی بہت سوں کی طرف سے فدیہ کا کام نہیں دی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میری طرف سے جو ہوگا وہ سب معاشدار ارکانِ مجلس کا فدیہ تصور کیا جائے گا۔

میں اپنے مالک کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے معاشدار رہنے یا سیاست میں حصہ لینے کا انتخاب خود ہماری صوابدید پر چھوڑا۔ اب سونچنا چاہئے کہ آیا میں بحیثیت معاشدار ہر قسم کی سیاسی کوشش سے الگ رہ کر اپنے مالک کا حق نمک ادا کر سکوں گا یا وقت آ گیا ہے کہ سیاسیات حاضرہ سے متعلق رہ کر میں اس نمک خواری کا حق ادا کروں جس کا شرف میری پانچ پشتوں کو نصیب رہا

ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان وفا کا وقت ہے مجھ سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی خودغرض، تن آساں، بندۂ زر اور نمک حرام نہ ہوگا۔ اگر میں اس زمانہ میں محض اپنی جاگیر اور اعزاز کے خیال سے مالک اور ملت و ملک کی خدمت گذاری سے روگردانی کروں، یہ تو بہت مبارک ہوا کہ اب دیوانہ کوئے محبت جیب و دامن کی فکر سے بھی آزاد ہو رہا ہے۔ میں اس کو اپنے لئے نہ کوئی پابندی سمجھتا ہوں نہ سزا بلکہ یہ تو میرے لئے پروانۂ آزادی ہے پابندی بھی ایک سزا ہوتی ہے اور میں کسی سزا کا مستحق نہیں ہوں۔

کسی شاعر نے میرے ہی لئے کہا ہے ؎

وفا خطا تھی خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

میں آج اپنی پانچ پشتوں کے کھائے ہوئے نمک کو حلال کر رہا ہوں اور نہایت مسرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ؎

بیا جاناں تماشہ کن کہ درا بنوہِ جاں بازاں
بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کی زیر خنجر خون خوار می رقصم

انشاءاللہ زمانہ خود بتادے گا کہ میں کیا ہوں اور میں نے کس طرح اقتدارِ شاہی کا تحفظ کیا ہے اور میری یہ خدمات نہ کسی بڑی تنخواہ کی خاطر ہیں، نہ منصب و جاگیر و خطاب کی خاطر!

ان سب کے باوجود یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہِ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں، میں عبدالملک نہیں، عبداللہ ہوں اور دُنیا کا کوئی صاحبِ ایمان عبداللہ کے سوا، اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں تخت و تاج آصفی پر اس لئے قربان نہ ہوگا کہ وہ جلالۃ الملک میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے کسی فردِ واحد کے لئے میری قربانی نہ شہادت ہے نہ ایثار، اور نہ خدا کے پاس اس کی کوئی جزاء، میں اپنی قربانی کو اور اس کی جزاء کو زائل کرنا نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ میں تخت و تاج آصفی اقتدار شاہانِ آصفیہ پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملتِ اسلامیہ کا اقتدار اور تخت و

تاج آصفی کو ملتِ اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں اور اقتدار ملتِ اسلامیہ اعلاء کلمۃ الحق کے سواء کسی اور مقصد کے لئے نہیں ہوسکتا لہٰذا میں حفاظت تخت و تاج آصفی اور تحفظ اقتدارِ شاہی کو تحفظ ملتِ اسلامیہ و اعلاء کلمۃ الحق سمجھتا ہوں اور اسی راستہ میں مٹنے کو موت نہیں بلکہ شہادت اور حیاتِ ابدی تصور کرتا ہوں۔

مجھ سے بار بار سوال کیا جاتا ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ اب بتاؤ کہ تم خود کیا کرنا چاہئے ہو؟ (اس پر جواب ملا کہ ہم آپ کے ہر اشارہ پر جان دینے کو تیار ہیں) میرے لئے جان دے کر اپنی موت کو مردار نہ کرو، جو غیر اللہ کے لئے جان دیتا ہے وہ مردار موت مرتا ہے اور تمہاری جان کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے آشیانے پر بجلی چمک رہی ہے۔ اس کو جل جانے دو تمہارے لئے یہ مبارک فال ہے۔ یہی ابر تمہارے گلشن حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی، میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانہ کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اُٹھاؤں گا۔ ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابر چھٹیں گے۔ آفتابِ اُمید چمکے گا اور دُنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور باطل کے پہاڑ دُھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ (حوالہ : بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا)

۳/ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو قائدِ ملت نے جاگیر، خطاب، جمعداری سے اپنی دست برداری کا استعفیٰ راست نظام کی خدمت میں پیش کر دیا اور قائد اعظم کو اپنے استعفیٰ کی تفصیلات سے واقف کراتے ہوئے تحریر فرمایا :

مائی ڈیر مسٹر جناح!

میرے اسپیشل (Special Messenger) کے آپ کے یہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے اپنی جمعداری نظم جمعیت اور اس سے متعلقہ آنرز (Honours) سے استعفیٰ دے دیا تھرو دی پراپر چینل (Through the Proper Channel) جانے کی بجائے میں نے اپنا استعفیٰ راست اعلیٰ حضرت کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ دوسرے دن انھوں نے اخبارات میں اپنا ایک فرمان شائع کیا جس میں میری تعریف بھی کی اور یہ بھی لکھا کہ میری گورنمنٹ اس پر غور کرے گی۔ بہادر یار جنگ کو جلدی نہیں کرنا چاہئے اور یہ بھی لکھا کہ میں نہیں چاہتا کہ بغیر کسی معقول وجہ

کے ان کے اعزازات لے لئے جائیں ۔ جہاں تک میں جانتا ہوں انھوں نے میرا معروضہ ایگزیکیٹیو کونسل (Executive Council) میں غور کے لئے روانہ کردیا ہے اور غالباً کونسل اس پر عید کے بعد غور کرے گی۔

اس استعفیٰ کی خبر کے شائع ہونے سے پبلک پر بہت اچھا اثر ہوا اور اس معافی نامے کے برے اثرات کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی جو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں، میں نے داخل کیا تھا۔

معاشداروں کے متعلق آرڈرز (Orders) ابھی تک (Withdraw) نہیں ہوئے ، جاگیردار ایسوسی ایشن نے ابھی تین چار دن قبل اپنا ایک وفد، اس کی نسبت، صدراعظم کی خدمت میں روانہ کیا تھا، ڈومینن (Dominion) کے چاروں طرف سے معاشدار بھی مطالبہ کررہے ہیں توقع ہے کہ شاید عید کے بعد حکومت اس کی طرف توجہ کرے گی۔

ایک مسئلہ میں آپ کی معلومات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں ۔ ہماری حکومت نے اپنے ملازمین کو سیاسیات میں یا سیاسی انجمنوں میں حصہ لینے سے تو پہلے ہی منع کردیا تھا لیکن اب انھوں نے آرڈرز جاری کئے ہیں کہ وہ کسی پولیٹیکل مجمع یا پولیٹیکل آرگنائیزیشن کی میٹنگ یا کانفرنس کو اٹنڈ (Attend) بھی نہ کریں ۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے مطلع فرمائیں کہ برٹش انڈیا میں گورنمنٹ سرونٹز (Govt. Servants) کے پولیٹیکل موومنٹس (Political Movements) پارٹی سپیشن (Participation) کے معنی کیا یہ بھی ہیں کہ وہ پولیٹیکل آرگنائیزیشنز کی جنرل میٹنگز (General Meetings) اور اوپن کانفرنسز (Open Conferences) کو اٹنڈ (Attend) بھی نہ کریں۔ آپ رائے دیں مجھے اس حکم کو نظرانداز کرنا چاہئے یا اس پر احتجاج کرنا چاہئے۔ اُمید کہ اب آپ کی صحت بہت اچھی ہوگی۔

(خط بنام قائداعظم حوالہ : خط نمبر ۱۴۳ ۲۰/۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم مرتبہ نذیرالدین احمد)

قائدِ ملت نے ۳/۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو والیٔ ریاست کو اپنا استعفیٰ پیش کیا اور ۴/۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء یعنی دوسرے ہی دن ''معروضہ بہادر یار جنگ'' کے زیرِ عنوان رہبر دکن میں حسبِ ذیل فرمان شائع ہوا

معروضہ بہادر یار جنگ

او التجا کردہ است کہ لوازمہ اعزاز خاندانی او را گورنمنٹ از دست او بگیرد کہ او ایں را بہ

طیب خاطر نذر کردہ است بایں وجہ کہ اونمی خواہد کہ از موجودہ کار قومی کہ اوانجام می دہد دست برد ارشدہ کنارہ کش شود کہ قواعد وضوابط متعلق ہمہ معاش داران شایع شدند لہٰذا پابندی آنہا بر اولازم ہمی آید وغیرہ۔

ما اوراجواب دادہ ایم کہ درایں کار او تعجیل نہ کند تاوقتیکہ ماوگورنمنٹ بر درخواست او کافی غور وخوض کردہ از نتیجہ آں اورا مطلع نہ کنیم۔ چرا کہ مانمی خواہیم کہ بلاوجہ موجہہ اوراز اعزاز خاندانی محروم بکنیم کہ او بلاشک وشنبہ از طبقہ خیر سگالان ماست وہم عاقل وفہیم ——————

حیدرآباد ۲۸/ آبان- قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر نے بارگاہِ جلالۃ الملک میں اپنے ایک معروضہ کے ذریعہ یہ عرض کرتے ہوئے کہ وہ ملک و مالک کی خدمت اس کو تصور کرتے ہیں کہ سیاسیات سے متعلق رہ کر آنے والی صورتِ حال کا مقابلہ کریں۔ ذاتِ شاہانہ سے ادباً یہ استدعا کی ہے کہ انھیں اپنی موروثی خدمت جمعداری اور جمعداری سے متعلق اعزازات سے سبک دوش فرمایا جائے۔

دست برداری کی وجہ

قواعد چال چلن ملازمین نظم جمعیت کی رو سے جمعدار رہ کر آپ سیاسیات میں حصہ نہ لے سکتے ہیں۔ یہ قواعد جدید ہیں اور ۳/ آبان ۱۳۵۰ف (مطابق ۸/ ستمبر ۱۹۴۱ء) کے جریدہ معمولی میں شائع ہوئے ہیں۔

دست برداری کا مطلب

جمعداری سے استعفاء کا مطلب یہ ہے کہ ماہانہ (۵۰۰) روپئے کے ایثار کے علاوہ جو موروثی اعزازات قائدِ ملت کے نام بحال ہوئے تھے یعنی عماری، پالکی، میانہ چتر، آفتاب گیری، بھالا، برچھا، بلم اور ڈنکہ نشان سے آپ سبکدوش ہورہے ہیں۔

ہدایت شاہانہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عجلت سے کام نہ لیں تاوقتیکہ حضرت اقدس و اعلیٰ حکومت کے مشورہ سے قطعی فیصلہ صادر نہ فرمائیں۔

ترجمہ فرمان فارسی
معروضۂ بہادر یار جنگ

انھوں نے درخواست پیش کی کہ حکومت ان کے اعزاز خاندانی کے لوازمات ان سے واپس لے لے اور یہ کہ انھوں نے اپنی خواہش سے اس کو مسترد کیا ہے۔ اس وجہ سے کہ قومی کاموں سے جو وہ فی الوقت انجام دے رہے ہیں ان سے دست بردار ہوکر کنارہ کشی اختیار کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ معاشداروں سے متعلق قواعد وضوابط شائع ہو چکے ہیں اور ان کی پابندی ان پر لازم ہے۔

ہم نے ان کو جواب دیا کہ اس کام میں اس وقت تک جلدی نہ کریں تاوقتیکہ حکومت ان کی درخواست پر غور وخوض کر کے نتیجہ سے مطلع نہ کرے کیوں کہ ہم نہیں چاہتے کہ کسی خاص وجہ کے بغیر ان کو خاندانی اعزاز سے محروم کر دیا جائے اور وہ بلاشبہ ہمارے خیر خواہوں میں سے ہونے کے علاوہ عقل منداور فہیم ہیں۔ (ترجمہ : مولوی عبدالرحمٰن سعید ’سعید صدیقی‘ مصنف لسان الامت شکاگو)

استعفیٰ کو واپس لے لینے کی کوشش ہر سطح سے جاری رہی، مگر غیرتِ نفس اور ملت کے مفادات کو زندہ رکھنے کے لئے پشت ہا پشت کی امارت کو ایک بار جو ٹھوکر لگا دی تو اس دیوانہ کوئے محبت کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب پوری طرح جیب وداماں کی فکر سے مکمل آزاد ہو گیا ہے ؎

سب کچھ لٹا کے غم نہ کیا شاد ہی رہا
تو حریت پسند تھا آزاد ہی رہا

”میرے استعفیٰ کے قبول کرنے میں عجلت کا احساس استعفیٰ کے دوسرے ہی تیسرے دن پیدا ہو گیا۔ خواہش کی گئی کہ استعفیٰ واپس لے لوں ——— خطاب گو میں استعمال نہیں کر رہا ہوں لیکن ادھر سے برابر استعمال ہو رہا ہے۔ بہر حال اب یہ کارروائی ختم ہو گئی اور میں اللہ کے فضل سے مطمئن ہوں“۔ (حوالہ : خط نمبر ۴۴۱ صفحہ ۴۵۱-۴۵۲ موسومہ بشیر احمد علوی مکاتیب بہادر یار جنگ)

۱۹۴۴ء میں پھر نظام نے یہ طے کیا کہ نواب صاحب کا خطاب و جاگیر وغیرہ واگذاشت کردی جائے جو بعنوان نذر پیش کردہ بہادر یار جنگ قبول کردہ محفوظ در خاندان او (یعنی برائے او) کا ذکر ۱۰/ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۶/ اپریل ۱۹۴۳ء کو نظام گزٹ میں شائع ہوا۔

۱۹۴۴ء میں سر سعید الملک نواب صاحب چھتاری صدر اعظم تھے انھیں نظام نے اس خصوص میں کہا "سرکار نے فرمایا کہ سالگرہ کے موقعہ پر بہادر یار جنگ کی جاگیر واپس کر دی جائے ریزیڈنٹ سے کہنا کہ میری بھی یہی رائے ہے"۔

(حوالہ : یادِایام حصہ سوم از نواب صاحب چھتاری صفحہ ۱۶۱ ۷/مارچ ۱۹۴۴ء)

۱۶/مارچ ۱۹۴۴ء کو نواب صاحب چھتاری نے اس خصوص میں ریزیڈنٹ سے ملاقات کی "ریزیڈنٹ سے بہادر یار جنگ کی واپسی جاگیر کے متعلق گفتگو کی"۔(یادِایام صفحہ ۱۶۲)

لیکن اب نواب صاحب کو واپسی جاگیر و خطاب سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ اس خصوص میں قائدِ اعظم کو صورتِ حال سے واقف کرواتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔"میری دہلی سے واپسی کے بعد حکومت اور اعلیٰ حضرت اس امر پر غور کر رہے ہیں کہ میری تقریروں پر جو پابندی عائد کی گئی تھی اس کو برخواست کر کے میرے جاگیرات اور اعزازات مجھے واپس کر دیئے جائیں۔اب بھی یہ خبر گرم ہے کہ یکم رجب کو اپنی سالگرہ کی تقریب میں ایسا کیا جائے گا۔ میں نے چوں کہ ان اُمور سے اب کوئی دلچسپی نہیں رکھی ہے اس لئے تفصیلات معلوم نہ کر سکا"۔

(حوالہ : خط موسومہ قائدِ اعظم محمد علی جناح خط نمبر ۴۲۹ صفحہ ۴۳۸-۴۳۹

مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

اس خصوص میں "آواز دوست" کی صدائیں کانوں سے ٹکراتی اور قلب میں اُتر جاتی ہے محمد بہادر خاں کو بہادر یار جنگ کا خطاب جس فرمانِ شاہی کی رو سے ملا وہ رات کے ایک بجے جاری ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد جب بہادر یار جنگ کی شہرت کا سورج اوج پر اور خطابت کا سمندر موج پر تھا تو انھیں ایک روز نظام دکن کی طرف سے دو فرمان ملے، جن کے عنوان عطا اور سزا تھے۔ بہادر یار جنگ نے طبیعت مشکل پسند اور حق پسند پائی تھی اس لئے سزا والے فرمان کی رسید لکھ دی، خطاب واپس ہوا اور جاگیر ضبط ہوئی۔ فقر میں اضافہ ہوا، عزت اور توقیر بڑھ گئی، ثواب اور درجات کا حال دینے والے کو معلوم ہوگا، خطاب کی واپسی میں بہادر یار جنگ کو خسارے کے بجائے سراسر نفع ہوا، کیوں کہ اس طرح ان کا اصلی نام انھیں واپس مل گیا جس میں حضور اکرمؐ کا نام بھی شامل ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سزا کا فرمان بھیجنے والے کو وہ ادا کیوں

بھول گئی جس سے خوش ہو کر اس نے خطاب عطا کیا تھا۔ وکٹری پلے گراؤنڈ حیدر آباد دکن میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جلسہ ہو رہا تھا۔ نظام اچانک آ پہنچے، رعایا نے حکمراں کو جلسے میں آتے دیکھا تو فرطِ حیرت سے ہل چل مچ گئی مگر مقرر تھا کہ بار بار پکارتا تھا ''اے محمد عربیؐ کے تخت نشین و تاج پوش غلام، آئیں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہِ کونینؐ کی نظر میں انداز ملوکیت کیا تھے''۔ وہ جس نے دُنیاوی قوتوں سے بے باکی اور دُنیاوی خواہشوں سے لاتعلقی کا مظاہرہ برسر عام کیا۔ اپنا شباب ذکرِ حبیبؐ کے لئے وقف کر چکا تھا۔ اسے عطا و سزا کے فرمان ملنے پر رحمۃ للعالمین کا یہ جواب ضرور یاد آیا ہوگا۔

''اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا کر رکھیں اور چاند کو بائیں، تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا، اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے''۔

وہ آنکھ جو جذبوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتی کہ جب ظلمتیں، سحر کے جلوؤں کے درمیان حائل ہونا چاہتے ہیں تو قانونِ قدرت کے مطابق سحر کے جلوے پوری آب و تاب سے ظلمتوں پر چھا جاتے ہیں اور حادثے جب ظرف و نظر کا امتحان لیتے ہیں تو مردانِ حر کے حوصلے پست نہیں ہو جاتے۔ یہ مشکلات ان کے دل کا حوصلہ بڑھانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ جاگیر و خطاب کے چھین لئے جانے کی دھمکی اور شہر بدر کر دیئے جانے کی بابت اس عظیم انسان نے جواباً کیا کہا تھا۔

''مجھے دھمکایا جا رہا ہے کہ میری جاگیرات و خطابات چھین لئے جائیں گے۔ مجھے ڈرایا جا رہا ہے کہ شہر بدر کر دیا جائے گا۔ جہاں تک جاگیرات کا تعلق ہے میں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نہ جان میری ہے اور نہ مال میرا، سب اللہ کا ہے **ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین** رہا خطاب کا سوال، جب میں پیدا ہوا تھا میرا نام ماں باپ نے محمد بہادر خاں رکھا اور آپ کی عنایت سے ۱۸ سال سے نواب بہادر یار جنگ کے خطاب سے پکارا جا رہا ہوں اور محمد کی وابستگی سے محروم کر دیا گیا ہوں، بڑا اچھا ہوا کہ وہ محبوب و متبرک نام پھر سے میرے ساتھ ہے، لہٰذا اس کا مجھے ملال کیوں ہو''۔

”جال پھینکے گئے۔دام بچھائے گئے،اقبال کا شاہین کوہساروں کی بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز رہا۔قصر سلطانی کی گنبد کا کبوتر نہ بن سکا۔زمانے کے سماج کے مروجہ امتیازات عزت وجاہ کے اظہاران سے چھین لئے۔زمانہ انگشت بدنداں تھا۔سب کچھ کھوکر بھی بہادر یار جنگ کا حسن اورنکھر گیا۔آزمائشوں میں عشق،فائز المرام ہوا،زمانے نے انھیں راکھ کا ڈھیر جانا تھا وہ عشق کے آگ تھے،کوئی طاقتور ترین ہاتھ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا تھا،ضمیر دشت و دریا کو اسیر آب و دانہ نہیں کرسکتا تھا۔جب وہ ہزار ہا پرستاروں کے درمیان کھڑا شانِ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

بیا جاناں تماشہ کن کہ درا بنوہِ جاں بازاں
بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کی زیر خنجر خون خوار می رقصم

آنسوؤں کے دریا تھے کہ آنکھوں سے اُبل رہے تھے،دل کے ٹکڑے تھے کہ آنسوؤں میں بہہ رہے تھے۔جس کو جہاں موقعہ ملا اپنا سر پٹک رہا تھا۔ہچکیوں کی آوازیں تھیں کہ پھیلتی ہی جارہی تھیں۔دیوانے نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔

(بہادر یار جنگ ازمولوی غوث خاموشی مشمولہ بہادر یار جنگ اہل وطن کی نظر میں

مرتبہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدرآباد)

ایک قریبی شخصیت نے پوچھا۔یہ کیا کیا؟
تو مسکراتے ہوئے نواب صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا :

آ گئے تھے برق کی زد میں تمام اہل چمن
ہم نے اپنے آشیانے کو مقابل کردیا

◆◆◆

تجارت گاہ مصنوعات دکن

دکن کے مسلم بافندوں کی معاشی حالت قابل رحم حد تک قابل لحاظ ہوگئی تھی، مال کی تیاری کے لئے سرمایہ کی کمی اور تیار مال کی نکاسی کا مسئلہ، قائدِملت نے اس خصوص میں ان کی تیاری مال کے سلسلے میں مدد کے علاوہ تیار شدہ پارچے کی نکاسی کے لئے شہر حیدرآباد میں ایک دکان قائم کی۔ اضلاع اور دیہاتوں کا دورہ کر کے کاریگروں سے معقول قیمت پر کپڑا خریدا گیا۔ دکان کے قیام کے بعد ایک دن قائدِملت نے خود اپنے دستِ مبارک سے کپڑا فروخت کیا وہ دن ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۱ء (مطابق ۲۱/ رمضان المبارک) کا دن تھا۔ شام کے ۳ بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک حسبِ اعلان قائدِملت نواب بہادر یار جنگ نے تجارت گاہ مصنوعاتِ دکن پر پارچہ فروخت فرمایا۔ تاریخ کی کافی تشہیر نہ ہونے کے باوجود عوام کا اژدہام تھا۔ قائدِملت کو دکان پر تشریف فرما دیکھ کر چلتی ہوئی موٹریں ٹھہر جاتی تھیں اور عقیدتاً یا ضرورتاً لوگ پارچہ خریدتے تھے۔ خصوصاً بعد نماز عشاء خریداروں کی بہت زیادہ کثرت ہوگئی اس اجتماع میں آنریبل سید عبدالعزیز صدرالمہام عدالت و اُمور مذہبی سرکار عالی کے علاوہ نواب دوست محمد خاں صاحب، نواب ولی داد خاں صاحب، نواب ماندور خاں صاحب، مسٹر محمد یامین زبیری معتمد مملکتی مجلس، مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن، مولوی حافظ عبدالقدیر صاحب، مولانا سید شاہ نوراللہ حسینی افتخاری، کئی ارکانِ مجلس عاملہ مملکتی مجلس اتحادالمسلمین اور بہت سارے عہدہ دار و وکلاء شامل تھے۔ اس مرتبہ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دو ایک ساہوکاروں نے بھی دیہی صنعت سے دلچسپی لیتے ہوئے قائدِملت کے ہاتھ سے کپڑا خرید۔

قائدِملت بار بار عوام سے متوجہ ہو کر فرماتے تھے کہ ”میں تم میں سے ہوں، ان دولت مند حضرات سے پہلے میں تمہاری ضرورت پوری کرنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو، کوئی کپڑا تمہیں بتاؤں، غرض اس دلکش پیرایہ میں مال کی تعریف کرتے ہوئے عوام کو مسلم بافندوں کا بنایا ہوا

کپڑا خریدنے پر آمادہ کرتے تھے۔ عوام اپنے قائد کو ایک تجربہ کار تاجر سمجھ کر پھولے نہ سمارہے تھے''۔ (اورینٹ پریس، رہبر دکن ۱۵/اکتوبر ۱۹۴۱ء)

مسلم بافندوں کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بارھویں جلسہ سالانہ مجلس اتحادالمسلمین کے خطبہ میں نواب صاحب نے اس مسئلہ کو تیسری تعمیری چیز کا درجہ دیا تھا۔

''میں جس تیسری تعمیری چیز کی طرف مسلمانوں کو متوجہ اور اپنی شاخوں کو آمادۂ عمل کرنا چاہتا ہوں وہ مسلمانوں کا معاشی نظام ہے۔ دوسال ہوئے کہ مجلس نے مسلمانوں کے مختلف معاشی طبقوں میں سے بافندوں کو اپنی پہلی توجہ کے لئے منتخب کیا تھا اور اپنے سرمایہ سے رقم صرف کر کے ایک دوکان بھی قائم کی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جن بافندوں نے اپنی مصنوعات کے لئے بازار نہ پا کر اپنے پیشہ سے دست کشی کرلی ہے ان کے لئے بازار پیدا کیا جائے۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مسلمانوں میں عموماً اور ذمہ دار ارکانِ مجلس میں خصوصاً غریب مسلم بافندوں کا بنایا ہوا کپڑا استعمال کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اس جذبہ کو زیادہ ترقی دینے اور بڑھانے کی ضرورت ہے، جس کے دو فائدے یقینی ہیں، ایک تو مسلم بافندوں کی امداد اور دوسرے شہری مسلمانوں کی زندگی میں سادگی اور کفایت شعاری جو کچھ ہوا وہ ایک بنیاد کی حیثیت سے قابل اطمینان ضرور ہے۔ لیکن جو رپورٹیں مملکتی مجلس میں وصول ہو رہی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مفلوک مگر کارآمد طبقہ کی مصیبتیں ابھی دور نہیں ہوئیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے لئے ایک منظّم کوشش کی جائے ——— اب ایک ایسے کمیشن کا تقرر ہونا چاہئے جو ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے تمام علاقوں کا دورہ کرے اور ایک مفید اور قابل عمل اسکیم جلد سے جلد مملکتی مجلس کے سامنے پیش کرے۔ اس کمیشن کا کام صرف بافندوں کی حد تک تحقیقات اور تجاویز پیش کرنا نہ ہوگا بلکہ وہ شہری و دیہاتی مسلم آبادی کی عام مفلوک الحالی اور اس کے اسباب اور اس کے دور کرنے کی تجاویز پر بھی غور کرے گا۔ اسی سلسلے میں ہر ضلع کے مرکز پر ایک دیسی دکان کا قائم ہونا ضروری ہے جیسی مملکتی مجلس نے قائم کی، تا کہ اس ضلع کے مصنوعات کی نکاسی کی طرف سے صناع بے فکر ہو جائیں ایسی چھوٹی چھوٹی دکانیں مشترک سرمایہ اور امدادِ باہی کے اُصول پر بڑی آسانی سے قائم کی جاسکتی ہیں۔

مجلس تو یہ سب کچھ کرے گی لیکن یہ امر سرکارِ عالی کی توجہ کے قابل ہے کہ مسلمان جو اپنی معاشی پست حالی کی وجہ سے ملک کا ایک مفلوک الحال طبقہ بنتے جارہے ہیں ان کو کس طرح سنبھالا جائے۔ صرف بافندوں کی حالت سنبھالنے کے لئے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ فی الحال اضلاع گلبرگہ، رائچور اور محبوب نگر میں پارچہ بافی کے ایسے چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کئے جائیں جہاں ان بافندوں کی کھپت ہو سکے۔ ہمارے ملک نے صنعتی حیثیت سے گذشتہ چند سال میں جو ترقی کی وہ قابل ستائش ضرور ہے لیکن ابھی قابل اطمینان نہیں ہے''۔

(خطبہ صدارت قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بارھواں جلسہ سالانہ منعقدہ دارالسلام ۱۱/اپریل ۱۹۴۰ء)

مسلم بافندوں کے سلسلے میں قائدِ ملت کی کوششیں بڑی حد تک ثمر آور ثابت ہوئیں۔ وہ اپنی ان کامیاب کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''مسلم بافندوں سے متعلق ہماری سعی کو لیجئے۔ ہم نے ان کے بنائے ہوئے مال کی نکاسی کے لئے آٹھ ہزار کے سرمایہ سے ایک دکان قائم کی اور اب اپنی گرہ سے اس میں اضافہ کئے بغیر اس دکان کے سرمایہ کے بیس ہزار تک پہنچا دیا لیکن جب ہم بافندوں کی طرف بڑھے اور ہم نے ان کی تنظیم کرنی چاہی تو جاپان کے جنگ میں شریک ہو جانے کی وجہ سے عالمگیر ہنگامہ دست و خیز کے باعث سوت کی گرانی اور رنگ کے فقدان نے ہمارے راستے روک دیئے اور دستی کرگوں پر کام کرنے والے بافندوں کا مسئلہ حیدر آباد ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں قابل توجہ بن گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ مدراس کے مختلف مقامات پر پارچہ بافوں کی بڑی تعداد نے مقامی حکام کی فرودگاہوں پر مظاہرے کئے اور خود حکومت ہند اب تک ان کی مشکلات کا کوئی صحیح حل دریافت نہ کر سکی۔ حکومت ہند کی طرح گو ہماری حکومت نے بھی اپنے کارخانوں کے تیار کردہ سوت کی پانچ فیصد مقدار دستی پارچہ بافوں کے لئے محفوظ کر دی ہے لیکن وہ کسی طرح ان کی حقیقی ضرورت کو پورا کر کے ان کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتی۔ بہرحال اس سلسلہ میں مجلس کی مساعی ناکام ہے نہ ناقص۔ مجلس اسی فکر میں ہے اور انشاءاللہ کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر کے رہے گی''

(حوالہ : خطبہ صدارت قائدِ ملت لسان الامت نواب بہادر یار جنگ تیرھواں جلسہ سالانہ مملکتی مجلس اتحاد المسلمین منعقدہ جالنہ، اورنگ آباد ۳۱/ڈسمبر ۱۹۴۱ء)

جنگ کے زمانے میں بافندوں کا مسئلہ جب نازک موڑ اختیار کر گیا تو اس وقت قائدِ ملت کے مشورے سے حکومت ان کی مدد کرنے پر مجبور ہوئی اور اس خصوص میں مجلس کے بافندوں سے متعلق شعبے کو اب زیادہ سرگرم عمل رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیوں کہ امداد جنگ مسئلہ کے تحت قحط کی گنجائش سے ایک بڑا پروگرام بافندوں کے لئے مہیا ہو گیا۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے قائدِ ملت نے ارشاد فرمایا :

''ہم نے ان نیم برہنہ اور فاقہ کش دیہاتیوں کے ایک طبقہ کو جو بافندگی کا پیشہ کرتے ہیں، اپنی امداد کے لئے منتخب بھی کیا اور ان کے مال کی نکاسی کے لئے مارکٹ فراہم کر کے ان کی بڑی حد تک امداد بھی کی۔ آج کل مجلس کا یہ شعبہ اس لئے زیادہ برسر عمل نہیں ہے کہ خود حکومت نے بڑھتی ہوئی قحط سالی کی گنجائش اور جنگ کی لائی ہوئی مصیبتوں کے مدنظر اپنی قحط کی گنجائش سے بلا لحاظ مذہب و ملت ان بافندوں کی امداد کا بیڑہ اُٹھالیا اور ان سے اے- آر- پی کے وارڈنز کا لباس، زخمیوں کی پٹیاں اور معیاری کپڑا تیار کروانا شروع کیا ہے۔ اس سے مجلس کے کام میں بڑی حد تک سہولت پیدا ہوگئی۔ لیکن مجلس ہمیشہ یہ محسوس کرتی رہی ہے کہ بغیر ایک مستقل معاشی نظام کے دیہاتی مسلمانوں کی پریشان حالی کو رفع نہیں کیا جا سکتا''۔

(حوالہ : خطبہ صدارت قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ چودھواں جلسہ سالانہ دارالسلام حیدر آباد ۲۱/ڈسمبر ۱۹۴۲ء)

بافندوں کے معاشی مسئلہ کے حل کے سلسلے میں مخالفین کے قلم سے اس پروگرام کی مخالفت پر جب زورِ قلم صرف ہونے لگا تو اس کے جواب میں نواب صاحب نے (باوجود اس پروگرام کی شاندار کامیابی کے) ارشاد فرمایا :

''کوئی جماعت اپنا معاشی پروگرام، طاقت اور دولت کے بغیر پورا نہیں کر سکتی۔ میں اس قوم کی نمائندگی کر رہا ہوں جو حیدر آباد میں اقتدار رکھنے کے باوجود جماعتی حیثیت سے بے اقتدار اور معاشی حیثیت سے مفلس ہے''۔ (حوالہ : خطبہ صدارت ۳۱/ڈسمبر ۱۹۴۱ء)

◆◆◆

کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

۱۹۴۰ء

۱۹۴۰ء میں کل ہند مسلم ایجوکیشنل کے اجلاس کے موقعہ پر مولوی نواب صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی نے نواب بہادر یار جنگ سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ آئندہ اجلاس حیدرآباد دکن میں ہو، قائدِ ملت نے آئندہ سال انعقاد اجلاس کی دعوت دی۔ جو اربابِ کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے منظور کی اور اس کا اعلان کیا گیا۔

اس خصوص میں نواب صاحب نے ۸/ نومبر ۱۹۴۱ء کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں ان کی ۳۱/ ڈسمبر ۱۹۴۱ء تک کی مصروفیات کا حوالہ دیا گیا۔

بالآخر تیسری اور چوتھی مارچ ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ تقریباً تین مہینے تک نواب صاحب اس کانفرنس کے شایانِ شان انتظامات کے سلسلے میں شب و روز مصروف رہے۔ اس دوران اپنے سارے پروگرام ملتوی کردیئے۔ کوئی دعوت قبول نہیں کی، ہر ایک سے معذرت خواہی کی اور جلسوں میں اپنی عدم شرکت کی وجہ ظاہر کی۔

نواب صاحب کو صدر استقبالیہ بنایا گیا تھا۔ سید الطاف علی بریلوی صاحب علی گڑھ سے نواب صاحب کا ہاتھ بٹانے آگئے۔ مہمانوں کی فہرستیں مرتب ہوگئیں، دعوت نامے تیار کردیئے گئے۔

اچانک ۱۰/ فبروری ۱۹۴۲ء کو نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تار وصول ہوا کہ کانفرنس کی اسٹائیڈنگ کمیٹی نے بعض وجوہ کی بناء پر اس کے سالانہ اجلاس کو آئندہ ڈسمبر تک ملتوی کردیا ہے۔

اچانک التواء کا اعلان نہ صرف حیران کن بلکہ موجب پریشانی تھا۔ ہزارہا روپیہ چندوں

کے ذریعے اخراجات کی پابجائی کے لئے وصول کیا گیا تھا۔ اخلاقی حیثیت سے اس کی تمام تر ذمہ داری نواب صاحب کے سر تھی۔ نواب صاحب کو شدید صدمہ پہنچا، ان کی دن رات کی محنت وقت اور سرمایہ کی بربادی، بغیر کسی معقول وجہ کے التوا کا اعلان دراصل ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ حاسدین نے پہلے تو اس بات کی کوشش کی کہ کانفرنس کا اجلاس حیدرآباد میں نہ ہو، دوسری کوشش یہ کی گئی کہ فرمارواا اس اجلاس کی اجازت نہ دیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی اعانت حاصل نہ ہو۔ سرکاری سطح پر کوئی معاونت نہ ہو، اکابرین کا تعاون حاصل نہ ہو سکے۔ محض قائدِ ملت کو نیچا دکھانے کے لئے حیدرآباد کی سازشی ٹولے نے بڑے پیمانے پر اس خصوص میں اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا جن میں ہر قدم پر ناکامی ہوئی، جب ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور مایوسی ہوئی تو علی گڑھ میں وہاں کے کچھ سازشیوں کے اشتراک سے اس پروگرام کو روبہ عمل لایا گیا۔

نواب صدر یار جنگ بہادر میرے بزرگ ہیں اور ان کا خط میرے لئے قابل احترام، لیکن اگر وہ خط آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں ہے تو ان سے میری طرف سے درخواست کیجئے کہ ایسا خط تحریر کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں''۔

(حوالہ : مکتوب نمبر ۳۵۵ صفحہ ۳۶۴ مکاتیب بہادر یار جنگ)

جناب مکرم و محترم! مجھے افسوس ہے کہ کل میں شب کو بارہ بجے کے بعد علی گڑھ پہنچا اور اس قدر تھکا ہوا تھا کہ سبجیکٹس کمیٹی (Subjects Committee) میں شرکت کی ہمت نہ کر سکا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اربابِ حل وعقد نے اپنے غلط طریقۂ کار اور غلط فیصلہ سے مسلمانانِ مملکت اسلامیہ آصفیہ کو جو روحانی اور مالی صدمہ پہنچایا ہے اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تمام ہندوستان کے علم دوست اصحاب اس سے واقف ہوں اور اس پر اظہارِ افسوس کریں۔

قرارداد

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس عام کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے اس طرزِ عمل کو جو اجلاس سالانہ کے دارالسلطنت حیدرآباد میں منعقد ہونے کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا غلط اور سخت قابل افسوس قرار دیتا ہے اور مسلمانانِ مملکت اسلامیہ آصفیہ کی اس دعوت پر جو اخلاص و محبت

کے ساتھ کانفرنس کو دی گئی تھی اظہارِ تشکر کرتے ہوئے ان کو جو صدمہ ورکنگ کمیٹی کے اس غلط فیصلے سے پہنچا ہے اس پر اپنی ہمدردی کا یقین دلاتا ہے''۔ (حوالہ : مکتوب نمبر ۳۸۵ صفحہ ۳۹۸-۳۹۹)

اگر چہ اجلاسِ عام میں یہ قرارداد پیش نہیں کی گئی، لیکن نواب صدر یار جنگ بہادر، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی معتمد عمومی کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کھلے اجلاس اپنی تقریر میں مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن منعقد ہونے والی کانفرنس کے التواء پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے طرزِ عمل کی مذمت کی۔ ساتھ ہی حیدرآباد دکن کی تحریک علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اُردو کے بے مثال امداد و اعانت اور احسانات کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانانِ مملکت آصفیہ اسلامیہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی پرخلوص دعوت کا شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس کے انتظامات اور انعقاد کی تیاریوں پر جو زیر باری اور مالی نقصان ہوا اور التواء کی وجہ سے جو روحانی صدمہ پہنچا اس پر اظہار ہمدردی کیا۔

(حوالہ : ۱۹۸-۱۹۹ علی گڑھ تحریک از مولوی حسام الدین غوری)

اس کانفرنس کے التواء کا نواب صاحب کو بہت دُکھ تھا۔ اس تعلق سے ان کے تاثرات، ان کے جذبات دلی کے ترجمان ہیں :

''کانفرنس کے التواء کا دُکھ ناقابل تلافی ہے۔ اللہ مسلمانوں کے لئے کام کرنے والوں کو مسلمانوں کے لئے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے''۔

اقبال نے غالباً میرے دل کی ترجمانی کی ہے

تجلی کی فراوانی سے فریاد
خرد کی تنگ دامانی سے فریاد

گوارا ہے اُسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

خدا مجھے توفیق عطا کرے کہ آئندہ تعاونِ عمل کے لئے صحیح اشخاص اور اداروں کا انتخاب کرسکوں۔

◆◆◆

مجلس اتحاد المسلمین مملکتی کا نظام نامہ

۱۹۴۱ء

بگرامی خدمت عالی جناب کرنل نواب سر احمد سعید خاں بہادر آف چھتاری

صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

یہ بات عالی جناب سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مجلس اتحاد المسلمین مملکتِ آصفیہ اسلامیہ مسلمانانِ دکن کی واحد نمائندہ جماعت ہے جس کی چار سو سے زیادہ شاخیں تمام ممالکِ محروسہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس تنظیم کے ساتھ تمام مسلمانِ دکن وابستہ ہیں۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور مسلک سے واقفیت اور اس کی کل حیدرآباد وسیع تنظیم کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے دستور العمل کی ایک کاپی رشتہ دوز ہے۔ مجلس اس پر فخر کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت سے متعلق ہے جس کا شعار ہمیشہ سے رعایا کی فلاح و بہبود رہا ہے اور جس کے سایۂ عاطفت میں اپنے اور پرائے ہمیشہ امن و راحت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ ملک میں اچھی حکومت مجلس کی بہترین تمنا ہے لیکن دُنیا کی کوئی کامیاب سے کامیاب حکومت بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ نقائص سے پاک اور تنقید سے بالاتر ہے، مجلس نہایت صداقت کے ساتھ اور اصلاح کی نیت سے ہمیشہ محسوس اور ظاہر کرتی رہی ہے کہ ہمارے نظم ونسق میں بہت سی باتیں اصلاح کے قابل ہیں اور ملک شاہ راہ ترقی کی ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر ملک کی طاقتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال کیا جاتا تو ہمارا ملک اس سے کہیں زیادہ بہتر اور آگے ہوتا جیسا اور جہاں اس کو ہم دیکھ رہے ہیں اس لئے مجلس کا ہمیشہ سے یہ شعار رہا کہ اس نے حکومت کو ہر مناسب موقعہ پر دوستانہ انداز میں دعوتِ اصلاح و ترقی دی اور عوام کے صحیح جذبات و ضروریات سے آگاہ کیا تاکہ صحیح معنوں میں حکومت کامیاب اور ترقی پذیر کہلائی جاسکے۔

مجلس عہدۂ جلیلہ صدارتِ عظمیٰ کی تبدیلی کو ملک کے لئے ایک فال نیک تصور کرتی ہے

اور عالی جناب سے متوقع ہے کہ صحیح رائے عامہ کو پیش نظر رکھ کر مملکت کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی طرف جلد سے جلد توجہ فرمائی جائے گی۔ مملکت کے دستور سے متعلق مجلس نے اپنے خیالات اپنی یادداشت مؤرخہ اردی بہشت ۱۹۴۸ف موسومہ عالی جناب صدر اعظم بہادر وقت میں تفصیل سے ظاہر کردیئے ہیں اور حیدرآباد کے بیرونی تعلقات عسکری استحکام اور علاقہ جات کی واپسی پر اس کے مسلک کی ترجمانی اس کی یادداشت مؤرخہ ۲۰/ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ م ۹/ جولائی ۱۹۴۰ء موسومہ صدر اعظم بہادر سے ہوتی ہے ان دونوں یادداشتوں کا ایک نسخہ عالی جناب کی توجہ کے لئے منسلک ہے، نظم ونسق حکومت کی نسبت مجلس نے اپنی متعدد قراردادوں کے ذریعہ حکومت کو وقتاً فوقتاً متوجہ کیا اور عالی جناب کی تشریف آوری کے ذکر سے فائدہ اُٹھا کر لاتور کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بعض اہم اور اُصولی باتوں کی طرف عالی جناب کی توجہ مبذول کرائی تھی مجلس ممنون ہے کہ اس کی طرف توجہ فرمائی گئی اور یقین رکھتی ہے کہ اس توجہ کے نتائج بہت جلد برآمد ہوں گے، اپنی اس تقریر میں میں نے اعلان کیا تھا کہ مجلس عنقریب مفصل تجاویز مرتب کرکے جناب کی خدمت میں پیش کرے گی چنانچہ مجلس نے ان تجاویز پر کامل تین مہینے غور کیا اور اب مجلس عاملہ کی منظوری اور مجلس شوریٰ کی توثیق کے بعد ان تجاویز کو عالی جناب کی خدمت میں پیش کرنے کی مسرت حاصل کی جاتی ہے یہ تجاویز مجلس کے اس مسلک کے پیش نظر مرتب کی گئی ہیں :

’’ملک میں حکومت کو کسی خاص جمہوری نوعیت کے دستور کا پابند کئے بغیر اچھی حکومت ہو جس کا مفاد بلالحاظ مذہب وملت ملک کے ہر باشندہ کو حاصل ہو‘‘۔ ان تجاویز کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجلس کو حکومت کی مشکلات کا پورا پورا اندازہ ہے۔ مجلس جانتی ہے کہ ان تجاویز میں سے بعض ایسی ہیں جن کو فوراً پورا نہیں کیا جاسکتا۔ بعض تجاویز کے لئے حکومت کی مالیہ کا پوری تفصیل سے جائزہ لینا پڑے گا لیکن پھر بھی بہت سی تجویزیں ایسی ہیں جن پر فوراً توجہ کی جاسکتی ہے اور جس سے نظم ونسق کی تین چوتھائی برائیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ مجلس یقین رکھتی ہے کہ عالی جناب مسلمانانِ دکن کے ان متفقہ جذبات کا پورا پورا احترام فرمائیں گے اور ان کے ان مشوروں پر اپنی پہلی فرصت میں توجہ فرما کر ملک کی ان توقعات کو پورا فرمائیں گے جو عالی جناب سے اس نے وابستہ کی ہیں۔

آپ کا مخلص بہادر یار جنگ بہادر (صدر مجلس اتحاد المسلمین مملکتی)

نظام نامہ

۱۹۴۱ء

منظورہ مجلس عاملہ مؤرخہ ۱۹/ آذر ۱۳۵۱اف م ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۱ء

وتوثیق کردہ مجلس شوریٰ ۳/دے ۱۳۵۱اف م ۷/نومبر ۱۹۴۱ء

نوعیتِ اصلاح

(الف) مصارفِ نظم ونسق

مجلس کی رائے میں ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اعلیٰ ملازمین حکومت کی تنخواہوں، بھتوں، الاؤنس اور دیگر لوازمات نظم ونسق پر صرف ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے تعمیری اور اصلاحی کاموں کے لئے حکومت کے پاس بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے اور رعایا کی اقتصادی اور سماجی زندگی ضروری ترقیات سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ

۱) اعلیٰ ملازمین حکومت کی تنخواہوں، بھتوں اور الاؤنس وغیرہ پر نظر ثانی کی جائے۔

۲) تمام غیر ضروری خدمتوں کی تخفیف عمل میں لائی جائے اور غیر اہم و غیر مفید شعبہ جات نظم ونسق کو برخاست کردیا جائے۔

۳) دیگر مصارف نظم ونسق میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔

(ب) تقرر وترقی

مجلس کی رائے میں نظم ونسق کی اعلیٰ اور ادنیٰ خدمتوں پر تقرر وترقی کے جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ ایسے ہیں جن کی وجہ سے ایک طرف تو نظم ونسق کی کارکردگی اور دیانت پر برا اثر پڑ رہا ہے اور دوسری طرف ملک کے تعلیمیافتہ طبقہ میں بے چینی و بے اطمینانی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ مجلس اس صورتِ حال کو حکومت اور ملک کے لئے خطرناک سمجھتی ہے اور حسبِ ذیل طریقوں پر اس کی اصلاح ضروری خیال کرتی ہے۔

۱) نظم و نسق کی تمام خدمتوں پر تقرر کا اصلی معیار ذاتی قابلیت، فطری صلاحیت اور مالک و سلطنت کے ساتھ وفاداری قرار پائے تا کہ بے جا پاسداری و اقرباء نوازی کا انسداد ہو اور ملک کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کو خدمت کا موقع مل سکے۔

۲) ترقی کا اصلی معیار کارگزاری کو قرار دیا جائے اور اس غرض کے لئے ہر ملازم کی دیانت و بددیانتی و کارگزاری اور عدم کارگزاری کا صحیح ریکارڈ مرتب رکھا جائے۔

۳) کسی شخص کا کسی درجہ ملازمت پر اس طرح راست تقرر نہ کیا جائے کہ اس سلسلہ کے ترقی پانے والے متاثر یا محروم ہو جائیں بجز اس کے کہ ایسے تقررات کسی خاص معیار یا قواعد مروجہ کے لحاظ سے مخصوص ہوں۔

(ج) مدت ملازمت اور وظیفہ

ملازمتوں میں توسیع کے طریقہ کو کلیۃً مسدود کر دیا جائے تا کہ نظم و نسق میں زیادہ قوت و توانائی پیدا ہو۔

(د) تنظیم جدید

۱) نظم و نسق کے تمام شعبوں کی تنظیم جدید کی جائے اور عہدِ حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق ان کی تشکیل عمل میں آئے جو ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں زیادہ سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوں۔

۲) ترقیاتِ عامہ کے تمام شعبوں میں قریبی اشتراک و تعلق پیدا کیا جائے اور ان سب کو ملک کی تعمیر و ترقی کے ایک ہی معین پروگرام کا پابند کیا جائے اور اس کے لئے ایک مستقل قلمدان وزارت کا قیام عمل میں آئے۔

۳) شعبۂ جات نظم و نسق کے لئے موجودہ قواعد و ضوابط پر نظر ثانی اور ضروری قواعد و ضوابط کی تدوین کی جائے تا کہ فرائض کی انجام دہی اور اختیارات کے استعمال میں سہولت ہو۔ نیز ان تمام قواعد و ضوابط کو منسوخ کر دیا جائے جن کی افادیت مفقود ہو چکی ہو۔

(ھ) اضلاعی نظم و نسق

مجلس کی رائے میں ملک کا اضلاعی نظم و نسق اصلاح طلب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

اضلاعی نظم ونسق میں عملاً مرکزیت موجود نہیں ہے لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ انتزاع اختیارات عدالتی کو متاثر کئے بغیر تعلقداروں کو زیادہ سے زیادہ قوی کیا جائے۔

(و) دیہی نظم ونسق

چوں کہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور حکومت کا حقیقی استحکام اور بڑی حد تک انحصار دیہاتوں پر ہے لہٰذا رعایا کی مرفہ الحالی کے لئے ضروری ہے کہ نظام وطن داری کو کلیۃً برخاست کیا جائے اور اس کی جگہ ایک تنخواہ یاب اور قابل تبادلہ سروس کا قیام عمل میں آئے۔ اس سلسلے میں حکومت پر اگر مزید اخراجات عائد ہوتے ہیں تو انھیں بھی برداشت کیا جائے۔

ملک کی اقتصادی تعمیر وتنظیم

مجلس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ مملکت کی اقتصادی تعمیر وتنظیم پر فوراً توجہ کی جائے اور اس غرض کے لئے حکومت جلد از جلد ایک سہ سالہ یا پنچ سالہ پروگرام مرتب کر کے اس کو روبہ عمل لائے۔ مجلس کی رائے میں یہ پروگرام دو اجزاء پر مشتمل ہو۔ ایک صنعتی اور دوسرا زرعی اور اس کا نصب العین یہ ہو کہ معاشی نقطۂ نظر سے مملکت کو زیادہ سے زیادہ خود مکتفی بنا دیا جائے۔

(الف) صنعتی تجاویز

صنعتی پروگرام کے متعلق مجلس کی تجاویز یہ ہیں :

۱) گھریلو صنعتوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں ہیں ان کی فنی تحقیقات کروائی جائیں اور ان کو دور کرنے کے طریقے تلاش کر کے ان پر عمل کیا جائے۔

۲) گھریلو صنعتوں کی ترقی اور امداد کے لئے ایک مستقل سرمایہ قائم کیا جائے۔

۳) امدادِ باہمی کے اُصول پر گھریلو صنعتوں کے لئے خام مال کی فراہمی اور مصنوعات کی فروخت کا انتظام کیا جائے۔

۴) صناعین کی اولاد کے لئے فنی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔ صنعتی پروگرام کا دوسرا جزء بڑی صنعتوں کا قیام ہے، اس کے لئے مجلس کی تجاویز یہ ہیں :

۱) ان تمام صنعتوں کو قائم کیا جائے جن کے لئے ملک کے پاس ذرائع اور وسائل موجود ہوں۔

۲) معدنی ذخائر سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔ ملکی سرمایہ اور محنت سے جدید معدنی ذخائر

کی تلاش کی جائے اوران سے نئی نئی صنعتوں کا قیام عمل میں آئے۔معدنی ذخائر پر بیرونی اجارہ داری کے مضرت رساں طریقہ کوفوراً مسدود کیا جائے۔

۳) صنعتوں کے قیام اور معدنی ذخائر کے لئے حکومت فراہمی سرمایہ کا انتظام کرے۔اس فرض کے لئے ایک جداگانہ صنعتی بنک کا قیام عمل میں آئے اور ملک کے سرمایہ داروں کوترغیب دی جائے کہ وہ اپنے سرمایہ کوصنعتی کاروبار میں لگائیں۔حسبِ ضرورت حکومت کی جانب سے فنی رہنمائی بھی کی جائے تاکہ سرمایہ داروں کواپنے سرمایہ کی حفاظت اور معقول منافع کا یقین ہوسکے۔

۴) صنعتی کالج جلد از جلد قائم کئے جائیں تاکہ صنعتی تعلیم زیادہ سے زیادہ عام ہواور وافر مقدار میں محنت یا مہارت دستیاب ہوسکے اور صنعتی ترقی وترویج کے لئے صنعتی تجارت گاہیں قائم کی جائیں۔

۵) شہری مقروضیت کسی طرح دیہی مقروضیت سے کم خطرناک نہیں ہے اس لئے غریب اور مقروض شہری آبادی کوقرضہ کے بارے میں اسی طرح نجات دلائی جائے جس طرح دیہی آبادی کے لئے انتظام کیا گیا ہے اور بذریعہ قانون سازی ان کوساہوکاری دست برد سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جائے۔

۶) ریلوے کی پالیسی میں تبدیلی کی جائے اور ملک میں ریلوے کا جال بچھایا جائے۔ ریلوے کے نظم ونسق کوملک کے عام نظم ونسق کا جزءاور تابع بنایا جائے۔

(ب)

پروگرام کا دوسرا جزءزراعت میں تنظیم وترقی ہے۔اس خصوص میں مجلس کی تجاویز حسبِ ذیل ہیں :

۱) زرعی محاصل پراس طرح نظرثانی کی جائے کہ خالص آمدنی اور محاصل میں صحیح تناسب قائم رہے۔

۲) ایسے قوانین نافذ کئے جائیں جن سے کاشتکار اپنے قدیم قرضوں سے نجات پاسکیں اور ان کے لئے زرعی بنکوں وغیرہ کے قیام سے فراہمی سرمایہ کا معقول انتظام کیا جائے۔

۳) اُصول امدادِ باہمی کے ذریعہ کاشتکاروں کے لئے فراہمی سرمایہ تخم وکھاد، مویشی، آلات

زرعی اور فروخت اجناس کا بہتر انتظام کیا جائے۔

۴) زرعی مزدوروں کے حقوق کی تعین اوران کے تحفظ کے لئے قانون سازی کی جائے۔

۵) محفوظ طبقات میں جن کے پاس زرعی اراضی موجود نہ ہوں یا جن کے پاس صرف غیر معاشی مقبوضہ ہو۔آسان شرائط پر قابل کاشت افتادہ زمینات کی تقسیم کی جائے۔

۶) ایسی دیہی صنعتوں کو فروغ دیا جائے جن کے ذریعہ اوقات فرصت میں مزارعین اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکیں۔

۷) مزارعین کے بچوں کے لئے زرعی تعلیم کا جلد انتظام کیا جائے۔

۸) ذرائع آب پاشی میں اس طرح توسیع کی جائے کہ اس سے ملک کی فارغ البالی اور حکومت کے مالیہ میں اضافہ ہو۔

۹) محکمہ جات زراعت، امدادِ باہمی، علاج حیوانات اور آبپاشی کو دیہی آبادی کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے۔

(ج) مملکت کا مالیہ

مملکت کے استحکام اور ملک کی سماجی واقتصادی ترقی کے لئے مجلس یہ ضروری سمجھتی ہے کہ ٹیکس کو درجہ واری تناسب کے لحاظ سے قائم رکھا جائے۔شرح تبادلہ کی اصلاح کی جائے اور اضافہ آمدنی کے لئے نئے وسائل کی تلاش کی جائے۔

(د) تعلیمیافتہ بے روزگاری

ملک کے تعلیمیافتہ طبقہ میں جس سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے اوراس کی وجہ سے ملک کے تعلیمیافتہ نوجوانوں میں جو بے چینی پیدا ہو رہی ہے مجلس اس کو نہایت تشویش کی نظروں سے دیکھتی ہے اور ضروری سمجھتی ہے کہ تعلیمیافتہ بے روزگاری کے مسئلہ پر حکومت پوری ہمدردی سے توجہ کرے۔مجلس کو توقع ہے کہ اگر اس کی مندرجہ بالا تجاویز پر جلد توجہ کی گئی تو اس بے روزگاری کا بڑی حد تک ازالہ ہوسکتا ہے۔

(ھ) پیشہ ملازمت

مجلس کی رائے میں ملازمت کا سب سے بڑا معیار اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے ساتھ

وفاداری نظم ونسق کی صلاحیت اور ملک کی مختلف اقوام میں معاشی توازن کا اُصول ہونا چاہیئے۔ جس کے لئے مجلس کی تجاویز حسبِ ذیل ہیں :

۱) اس پیشہ کو عزوجاہ کی ہوس اور جلب منفعت کی خواہش سے کلیۃً پاک ہونا چاہیئے اور اس کو بے لوث خدمت کے جذبہ پر مبنی رکھا جائے۔

۲) ملازم پیشہ طبقہ کے اقتصادی اور مالی استحکام کے لئے لازمی پس انداز کی مختلف تجاویز روبہ عمل لائی جائیں اور متوفی ملازمین کے پسماندگان کی کفالت کی ذمہ داری لی جائے تاکہ ملازمین حکومت فکر مستقبل سے آزاد ہوکر کامل دیانتداری سے خدمت انجام دے سکیں۔ اس سلسلہ میں اگر پراویڈنٹ فنڈ کے طریقہ پر بھی غور کیا جائے تو مناسب ہوگا۔

۳) اعلیٰ وادنیٰ خدمتوں کی تنخواہوں میں جو عظیم الشان تفاوت اس وقت موجود ہے اس میں ایک مناسب توازن قائم کیا جائے۔

(و) طبقہ جاگیرداران

مجلس کی رائے میں اس طبقہ کی اہمیت وافادیت کے مدنظر اس کی اصلاح و تنظیم کے لئے حسبِ ذیل تدابیر کا اختیار کیا جانا ضروری ہے :

۱) اس طبقہ کی نئی نسل کی تربیت اور تعلیم کا انتظام اس نہج پر کیا جائے کہ وہ دیگر ابنائے ملک کے ساتھ مل کر ملک اور مالک کی خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکیں۔

۲) جاگیرداروں کے بچوں کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ فراغتِ تعلیم کے بعد نظم ونسق کی تربیت حاصل کریں۔

۳) جاگیرات کی رعایا کے لئے اقتصادی اور سماجی ترقی کے وہی مواقع فراہم کئے جائیں جو حکومت سرکارِ عالی کی رعایا کو حاصل ہیں۔

۴) جاگیرات کے مصارف نظم ونسق میں کفایت اور انتظام ملک میں سہولت کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ جاگیرات کے منتشر مواضعات کو یکجا کیا جائے۔

(ز) پست اقوام

پست اقوام کی اصلاح اور ترقی کے مسئلہ کو مجلس نے ہمیشہ بہ نظر ہمدردی دیکھا ہے، مجلس کی

رائے میں اس طبقہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ :

۱) اس طبقہ کی تعلیمی ترقی کے لئے خاص تدابیر اختیار کی جائیں۔

۲) اس طبقہ کے سماجی حقوق کی حفاظت کی جائے کہ اس کی ترقی میں جو موانع حائل ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔

۳) ملک کی اقتصادی اور سماجی زندگی میں اس طبقہ کو وہی حقوق عطا کئے جائیں جو ملک کے دیگر طبقوں کو حاصل ہیں۔

(ح) لاوارث جائیدادوں کی شرعی تنظیم

شرعی اُصول کے تحت ملتِ اسلامیہ کے لاوارث افراد کی وارث ملتِ اسلامیہ ہے۔ جس طرح حکومت نے شاستر کے اُصول کو تسلیم کر کے ہندو قوم کو یہ موقع عطا کیا ہے کہ اپنی لاوارث جائیدادوں کو بذریعہ تبنیت اپنی ہی قوم میں محفوظ رکھے۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی طرح شرع شریف کے اُصول کے تحت مسلمانوں کی لاوارث جائیدادوں کو بحق ملتِ اسلامیہ بحال رکھا جائے

(ط) مذہبی وثقافتی آزادی

مجلس اتحاد المسلمین کی رائے ہے کہ ہر قوم کو یہ حق ملنا چاہئے کہ اگر وہ چاہئے تو اپنی الہامی کتابوں کے پیش کئے ہوئے ضابطہ حیات کے بموجب اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل بذریعہ قانون کر سکے۔

مسلمانوں کی اقتصادی پستی اور پیدا آور ذرائع معیشت سے ان کی بے تعلقی کے مدِنظر نیز ان کو اس سلطنت میں جو خاص تاریخی و روایتی حیثیت حاصل رہی ہے اس کے برقرار رکھنے کے لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ حسبِ ذیل تدابیر اختیار کرے۔

۱) زراعت، صنعت و حرفت اور ملک کے دیگر منفعت بخش پیشوں میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے اور ایک مستقل سرمایہ قائم کیا جائے تا کہ پیدا آور اغراض کے لئے وہ آسانی سے رقم حاصل کر سکیں۔

۲) مسلمانوں کی اقتصادی و سماجی تنظیم کے لئے اُصول زکوٰۃ کو بذریعہ قانون نافذ کیا جائے

۳) غیر شرعی عادات کا انسداد بذریعہ قانون کیا جائے اور تمام مسرفانہ رسوم کو قانوناً منسوخ

قرار دیا جائے۔

محمد یامین زبیری (معتمد)

۷/نومبر ۱۹۴۱ء

اقتباسات

یادداشت ہائے محولہ خط موسومہ عالی جناب نواب صدر اعظم بہادر کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں :

مسلمانوں کے لئے کوئی جدید دستور قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ اس میں حسبِ ذیل اُمور کا تحفظ نہ کیا گیا ہو۔

۱) حیدرآباد کی حکومت ایک کامل الاقتدار بادشاہت ہو جس پر ہمیشہ آصف جاہی خاندان کا ایک مسلمان رکن متمکن رہے۔

۲) ہندوستان کے وفاقی دستور میں حیدرآباد کی شرکت اگر ناگزیر متصور ہو تو حیدرآباد صرف اسی صورت میں مناسب اور شایانِ شان حصہ لے سکے گا جب کہ اس کا سیاسی اقتدار مالیاتی توازن اور معاشی ترقی کے امکانات متضرر نہ ہوں۔

۳) اگر ملک کی ترقی کے لئے موجودہ دستور میں کوئی تبدیلی ناگزیر متصور ہو تو مسلمانانِ دکن کی ایسی تبدیلی کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس سے مسلم جماعت کی وہ روایاتی سیاسی برتری متاثر ہو جو حیدرآباد کی تاریخ میں اس کو صدیوں سے حاصل رہی ہے۔

توضیح

(الف) مقنّنہ و ادارہ جات مقامی حکومت خود اختیاری کی ترکیب میں بہر حیثیت مسلمانوں کو کثافتی اکثریت حاصل رہے۔

(ب) مسلم نشستیں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ پر کی جائیں۔

۴) اُردو جو ہندوستان بھر کی مشترکہ اور حیدرآباد کی مروجہ سرکاری زبان ہے ہمیشہ حیدرآباد کی سرکاری اور بجز تحتانی جماعتوں کے تعلیمی و جامعاتی زبان رہے۔

۵) ملازمت مسلمانوں کے لئے نہ صرف تاریخی و سیاسی وقار کا بلکہ ایک اہم معاشی مسئلہ بھی

ہے،اس لئے فرقہ واری تناسب کا مطالبہ اس مسئلہ میں پیدا ہی نہیں ہوتا اور مسلمان اس سے محروم ہونے کے لئے کسی حالت میں تیار نہ ہوں گے۔

۶) حیدرآباد میں ہر مذہب وملت کے لئے جائز آزادی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے اور رہے گی لیکن بادشاہت کا مذہب چوں کہ اسلام ہے اور رہے گا، اسی لئے عہدۂ صدرالصدور جس سے خدماتِ شرعیہ متعلق ہیں۔ اپنی روایاتی خصوصیات کے ساتھ اعلیٰ حالہٖ قائم رہے اور مسلم اوقاف اور مسائل مذہبی کے انتظامات سے متعلق ایک آئینی مسلم ادارہ کو حکومت تسلیم کرے۔

۷) حیدرآباد میں شہری آزادی ہر شخص کو بلالحاظ مذہب وملت حاصل رہے بشرطیکہ اس کا استعمال ناجائز نہ ہو اور اس کو ملک میں باغیانہ اور فرقہ وارانہ جذبات کے اشتعال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

۸) ملک کے اہم پیشوں تجارت، زراعت اور صنعت میں مسلمانوں کا حصہ نفی کے برابر ہے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ لہٰذا ایسے وسائل واسباب فراہم کئے جائیں جن سے ان کی معاشی مشکلات رفع ہوں اور وہ ان پیشوں میں شایانِ شان حصہ لے سکیں۔

۲-(الف) مجلس

۱) حکومتی افواج میں توسیع اور

۲) حربی اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے تا کہ اس جنگ کے خاتمہ کے بعد اس کی حربی طاقت خود اس کی دفاع کا موجب ثابت ہو۔

(ب) مجلس اس اضطراب کے ساتھ حکومت حیدرآباد سے وقت کی اس اہم ترین ضرورت کے پیش نظر برطانوی ہند کو مقبوضاتی مرتبہ ملنے کی توقع پر حسبِ ذیل اُمور کی نسبت حکومت برطانیہ سے گفت وشنید آغاز کرنے کا شدید مطالبہ کرتی ہے۔

۱) امدادی افواج کی برخواستگی جن کو حکومت برطانیہ نے حکومت آصفیہ کے مصارف پر حدود مملکت میں متعین رکھا ہے اور نتیجتاً مفوضہ علاقہ کا استرداد۔

۲) برطانیہ کے ساتھ حلیفانہ تعلقات کی اس طرح تجدید کہ جس کے ذریعہ حیدرآباد کی داخلی اور خارجی آزادی اور انفرادیت کا تیقن حاصل ہو جائے۔ فقط

حیدرآباد کی مردم شماری

۱۹۴۱ء

۱۹۴۱ء میں حیدرآباد میں حکومت کی طرف سے مردم شماری ہوئی۔ اس مردم شماری میں مجلس اتحادالمسلمین نے مسلم شماری کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کی، یہ پورے ایک ہفتے کا پروگرام تھا۔ اس خصوص میں قائدِ ملت نے پورے انہماک سے اس مہم کو سر کیا۔ یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمگیر جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔

"ہفتہ مردم شماری منایا جائے"

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر کا بیان

''میں اندازہ کر رہا ہوں کہ مردم شماری کی پوری پوری اہمیت لوگوں کے ذہن نشیں نہیں ہوئی ہے۔ یہ وہ اہم کام ہے جو قوموں کی زندگی کے ہر ایک پہلو پر مؤثر اور ان کی ارتقائی منزلوں کے لئے قدمِ اول ہوتا ہے۔ صحیح اعداد کی فراہمی قوموں کی معاشی، سماجی، سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں بہت مفید ہوتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے کہ خصوصاً مسلمانوں نے اس کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا بلکہ اس کے برخلاف اس کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں کہیں ابھی تک توہم پرستی کا دور دورہ ہے اور خیال کیا جا رہا ہے کہ صحیح تعداد کے بتانے سے کہیں گھر کو نظر نہ لگ جائے کہیں یہ خوف ہے کہ یہ اعداد جنگ کی بھرتی کے لئے فراہم ہو رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مردم شماری بجائے مفید ہونے کے غیر مفید بنتی جا رہی ہے، میں تمام مسلمانانِ دکن سے عموماً اور کارکنانِ اتحادالمسلمین سے خصوصاً خواہش کرتا ہوں کہ اس کی اہمیت کو محسوس کریں ناواقف لوگوں کو محسوس کرائیں اور رضا کاروں کے ذریعہ شمار کنندوں کو مدد دیں۔ خصوصاً عورتوں کے توہمات کو دور کرنے کے لئے جلسے منعقد کئے جائیں۔ سب سے بہتر ہوگا کہ آئندہ ہفتہ کو ہفتہ

مردم شماری کی صورت میں منایا جائے جس میں مردم شماری کی اہمیت اور صحیح اعداد کی فراہمی کے فوائد پر تقریریں ہوں''۔

حکومت نے (۲۷) ستائیس سوالات پر مشتمل سوال بند تیار کیا جو حسبِ صراحت ذیل تھا ۱) نام ۲) مرد، عورت، ہیجڑا ۳) فرقہ جات، ذات، قوم، نسل ۴) مذہب (معہ گروہ) ۵) ناکتخدا، کتخدا، بیوہ، مطلقہ ۶) عمر ۷) بچوں کی تعداد جو عورت کو پیدا ہوئے (اور تعداد جو بوقتِ شمار بقیدِ حیات ہیں ۸) شادی شدہ عورت کی عمر بوقت ولادت اولاد اولیں ۹) خود کماتے ہو، زیر پرورش ہو، کسی کے ساتھ مل کر جزوی کمانے والے ہو ۱۰) اگر زیر پرورش ہو تو جس کے پاس یا جس خاندان کے زیر پرورش ہو اس کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ۱۱) تم نے ملازم رکھے ہیں، تنخواہ یاب، اگر ایسا ہے تو کتنے ملازم ہیں ۱۲) خاندان کے افراد کتنے ہیں ان کی تعداد ۱۳) کیا تم اب برسر کار ہو یا نہیں ۱۴) ذریعہ معاش بلحاظ اہمیت ۱۵) مندرجہ صدر پیشہ جات میں سے سال کے کتنے عرصہ تک تم مصروف رہتے ہو ۱۶) اگر تم کسی دوسرے کے بہ معاوضہ نقد ملازم ہو تو اس کا کاروبار کیا ہے ۱۷) کیا تم ممالک محروسہ سرکار عالی میں پیدا ہوئے ہو اگر نہیں تو کہاں ۱۸) کتنے عرصہ سے تم ممالک محروسہ سرکار عالی میں رہتے ہو ۱۹) کیا تمہارے خاندان کے لوگ بیرونِ ممالک محروسہ سرکار عالی، عارضی طور پر گئے ہیں، اگر ایسا ہو تو کتنے تعداد، کہاں، کتنے عرصہ تک ۲۰) مادری زبان ۲۱) دوسری زبانیں جو تم جانتے ہو ۲۲) کیا تم لکھ اور پڑھ سکتے ہو، یا صرف پڑھ سکتے ہو۔ کونسی زبان تم لکھ سکتے ہو ۲۳) تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے یا سب سے بڑا کون سا امتحان کامیاب کیا ہے ۲۴) آیا تم نے صرف اُردو کی تعلیم حاصل کی ہے یا انگریزی و اُردو دونوں کی ۲۵) کیا تم کوئی دستکاری جانتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو کونسی؟ ۲۶) کیا تم کو کبھی مرض نارو ا ہوا تھا۔ اگر ہوا تو کب ۲۷) کیا تم کو کبھی اندھاپن، بہرہ، گونگاپن یا پاگل پن یا کسی قسم کی معذوری لاحق ہوئی تھی۔

اب اس خصوص میں قائدِ ملت کی ہدایت پر ایک تفصیلی چار ورقی (بڑا سائز) ورقیہ شائع کیا گیا جس میں مردم شماری کی اہمیت و افادیت اور خانہ پری سے متعلق ہدایات و تفصیلات سے عوام کو آگاہ کیا گیا۔

مسلمانوں سے مردم شماری کیا ہے؟

ہندوستان مسلمانوں کا نہیں رہا لیکن آج ــــ بھی

حیدرآباد مسلمانوں کا ہے؟

مملکت ہماری بادشاہ ہمارا تخت و تاج اسلامی ہے

لیکن

آپ کے اقتدار اور حیدرآباد پر حکومت کرنے کے حق کو یہ کہہ کر چھین لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی تعداد ہی کیا ہے!

اس مرتبہ ''مردم شماری'' کو ایک پروپگنڈہ اور باقاعدہ مہم کی صورت دے دی گئی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟

وہ قوم جو تعداد میں زیادہ ہے چھوٹی قوموں کو، ان کی زبان کو، ان کی تہذیب اور ان کے مذہب کو جذب اور ضم کر لینا چاہتی ہے۔ بڑی ذات والے چھوٹی ذات والوں کو اپنے نام پر لکھ لینا چاہتے ہیں ـــــــ کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟

آنے والے دس سال تک مردم شماری کی جو رپورٹ اب تیار ہو رہی ہے وہ ایک دستاویز ہے جس پر ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ، عیسائی، ہریجن غرض ہر چھوٹے بڑے طبقوں کے سیاسی مرتبہ، باہمی حقوق منحصر ہوں گے۔ آج کی مردم شماری (گنتی) کل کے بیسیوں مسائل کی بنیاد ہوگی اس لئے اگر آپ نے غلطی کی، غفلت برتی یعنی مردم شماری کو یوں ہی جانے دیا تو مسلمان سیاسی اور معاشی حیثیت سے دس سال پیچھے رہ جائیں گے۔ آپ کا فرض ہے کہ ''مردم شماری'' میں اپنی صورت کو بگڑنے یا بگاڑنے نہ دیں، صحیح تعداد درج کرائیں، اندراجات اور پروپگنڈے کے مقابلہ میں کارکنانِ مردم شماری کا ہاتھ بٹائیں یہی کافی نہیں ہے کہ مردم شماری کے کاغذات کی حد تک تکمیل ہو، اس غرض سے کہ کہیں غلط اندراجات تو نہیں ہو رہے ہیں، اپنے صحیح معلومات سے

سرکاری شمار کنندوں کی مدد کیجئے۔ حکومت صحیح اعداد و شمار جمع کرنا چاہتی ہے آپ کی کوششوں کی قدر کرے گی اور اس کو قدر کرنا چاہئے۔

ہر حلقہ اور ضلع کے لئے مسلمانوں کی واحد تنظیم مملکتی مجلس کی مردم شماری کی کمیٹی کی جانب سے ایک کمشنر مقرر کر دیا گیا ہے جس سے مل کر آپ اپنی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

کمیٹی مردم شماری کی جانب سے ضروری ہدایات طبع وشائع کی گئی ہیں ان کو حاصل کیجئے، پڑھئے، خود سمجھئے دوسروں کو سمجھایئے۔ مردم شماری کے جلسوں میں شرکت کیجئے اور دیگر تبلیغی اور تنظیمی کاموں میں رضا کارانہ کام کیجئے، اپنے ضلع کے کمشنر یا تعلقہ کے سب کمشنر کے ہدایات اور احکام کی اپنا فرض سمجھ کر تعمیل کیجئے۔

اگر بالفرض کسی تعلقہ یا قصبہ میں مجلس اتحادالمسلمین کی شاخ نہ ہو تو وہاں کے سر برآوردہ بزرگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیں گے اور دس سال کے مسلسل نقصان سے بچیں گے اور مسلمانوں کو بچائیں گے، وہ مردم شماری کے متعلق ہدایات، پمفلٹ اور سارا لٹریچر اپنے ضلع یا تعلقہ کے (جیسی صورت ہو) کمشنر یا سب کمشنر یا راست کمیٹی مردم شماری کے دفتر ''معظم بلڈنگ'' سے طلب فرمالیں۔

''کمیٹی مردم شماری مملکتی مجلس''

ذاتی سوالات میں چار سوالات نہایت اہم ہیں۔ نام، قوم، مذہب اور زبان۔ نام کا سوال اس لئے اہم ہے کہ اضلاع میں خصوصیت کے ساتھ ناموں کے تلفظ کو کچھ اس طرح بگاڑ کر ادا کیا جاتا ہے کہ ان کے غیر مسلم ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مثلاً نام رحمٰن صاحب ہے وہ اپنی زبان میں رحمیا کہے گا جس کی بگڑی ہوئی صورت سننے میں رامیا ہو جائے گی، عورت کا نام رحمت بی ہے لیکن اس کو کچھ اس طرح ادا کیا جائے گا کہ وہ غیر مسلم نام معلوم ہوگا، عرف میں وہ رحمو پکاری جاتی ہے اور رحمو زبان کی جنبشوں میں رامو ہو جاتی ہے، اس لئے نہ صرف سرکاری شمار کنندوں کا بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ نام کو سمجھ کر لکھیں اور لکھوائیں۔

پہلے سوال کا جواب نام کے صحیح تلفظ کے ساتھ دیجئے۔ دوسرے سوال کا جواب آسان ہے،

تیسرا سوال فرقہ جات کا ہے اور اس سوال کو دراصل مسلمانوں سے تعلق نہیں ہے۔ اس لئے آپ کا پہلا جواب ''مسلمان'' ہونا چاہئے، اسی کے ساتھ اگر آپ نسل لکھوا دیں تو کوئی ہرج نہیں ہے، یعنی پٹھان، عرب، ترک مغل وغیرہ۔ چوتھا سوال مذہب یا گروہ سے تعلق ہے۔ مسلمان ایک قوم ہیں جس کا مذہب صرف اسلام ہے اس لئے اس کا صرف ایک جواب ''اسلام'' لکھوا دیجئے، پانچواں سوال نا کتخدا یا کتخدا یا بیوہ یا مطلقہ عورتوں سے متعلق ہے۔ یہ سوال کہ کوئی عورت مطلقہ ہے یا نہیں خلاف تہذیب ہے کوئی مہذب اور جواب دینے کے قابل سوال نہیں۔ مطلقہ کا تصور بھی اگر عقد ثانی نہ ہوا ہو تو بیوہ ہی کا ہے۔ اس لئے آپ صرف نا کتخدا، کتخدا جیسی بھی صورت ہو، یا بیوہ درج کرا دیجئے۔

چھٹے سوال میں عمر کو بڑھا کر نہ بتائیے۔ ساتواں سوال بچوں کی تعداد کا ہے۔ جتنے بچے آپ کے ہوں ان کی صحیح تعداد بتا دیجئے، یہ سوال کہ کتنے بچے پیدا ہوئے، کتنے چل بسے اور کتنے باقی ہیں ایک گھر کے غم کو تازہ کرنے والا سوال ہے لیکن بعض دفعہ شرح پیدائش و اموات کا اندازہ لگانے میں کام آتا ہے۔ اس لئے اس تکلیف کو بھی گوارا کیجئے۔ آٹھواں سوال یہ ہے کہ اولاد اولیں کے وقت عورت کی عمر کیا تھی کم از کم مسلمان مرد یا مسلم عورت کو اس سوال کا جواب دینا گوارا نہ ہو لیکن جب آپ سیاہہ میں عمر لکھواتے ہیں تو حافظہ سے جواب دینے میں کوئی ہرج نظر نہیں آتا۔ نویں سوال کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا آپ آزاد روزی پیدا کرتے یا کسی دوسرے کی محنت پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں یا یہ کہ کچھ آپ پیدا کرتے ہیں اور کچھ دوسرے کی مدد سے جیتے ہیں، مسلم معاشرہ اس وقت معاش کے تعلق سے آزاد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے پر منحصر (Interdependent) ایک کماتا ہے بہت سے کھاتے ہیں۔ اس واقعہ کو بطورِ خاص درج کرائیے۔ ہمیں معلوم ہے آپ کا جواب کیا ہوگا؟ دسویں سوال میں بزرگ یا کسی خاندان یا جس کسی کے زیر پرورش ہوں ان کا نام لکھائیے۔ نو اور دس دونوں سوالات کے جواب میں کہیں آپ صرف عورتوں ہی کو زیر پرورش لکھائیں گے، مردوں کو بھی بطورِ خاص جو زیر پرورش ہوں درج کرائیے۔ گیارھواں سوال آپ کے ملازمین سے متعلق ہے ان کی پوری پوری تعداد درج کرائیے اور ہر ملازمین سے متعلق شمار کنندہ کے ایک علاحدہ فارم پر خانہ پوری کرائیے کہیں وہ اس وجہ سے

چھوٹ نہ جائے کہ وہ کہیں کام پر چلا گیا ہے یا بوقت تنقیح بازار میں ہے گھر میں نہیں ہے۔ سوال ۱۲، ۱۳، ۱۴ اہم سوالات ہیں واقعہ یہ ہے کہ باوجود اس مملکت کے اسلامی ہونے کے مسلمانوں میں بڑی بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے، کہیں آپ بے روزگاری عیب سمجھ کر غلط درج کرادیں گے اگر کسی کی محنت سے آپ کھاتے ہیں اور اپنا روزگار آپ پیدا نہیں کرتے تو شرم کرنے یا شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے جرأت سے بتادیجئے کہ آپ بے روزگار ہیں، اس میں مرد وعورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، ان عورتوں کو چھوڑ کر جو اپنے شوہروں کے زیر سرپرستی ہیں باقی تمام عورتوں کو اوران یتیم ویسیروں کو جو کسی کی مدد پر جیتے ہیں، اپنے آپ کو بے روزگار لکھانا چاہئے۔ تیرھواں سوال تلاش روزگار کی مدت کا ہے، دو چار ماہ کی بے روزگاری کوئی بے روزگاری نہیں ہے۔ اگر بے روزگاری مسلسل ہے تو بتادیجئے مسلسل ہے۔ چودھواں سوال ذریعہ معاش کا ہے، جب روزگار نہیں تو ذریعہ معاش بھی کچھ نہیں ہوسکتا۔ کمیٹی نہیں چاہتی کہ آپ غلط اندراج کرائیں۔ آپ پر صرف ان سوالات کی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ پندرھواں سوال بلدہ والوں سے بہت کم متعلق ہے زیادہ تر اضلاع والوں سے متعلق ہے۔ عموماً اضلاع والوں میں زرعی مزدور، دستکار اور کسان، دیہی صناع سال تمام کام نہیں کرتے سال کے کچھ حصہ میں موسموں کے لحاظ سے کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد جہاں تک اضلاع کا تعلق ہے زرعی مزدوروں کی ہے اگر سال میں دو ماہ کھیتوں پر کام کرنے سے کچھ غلہ مل جاتا ہو تو اس کو سال کی کوئی بڑی مصروفیت نہ سمجھنا چاہئے، متعین طور پر اگر اتنی مزدوری نہ ملتی ہو کہ آپ سال بھر زندگی نہ بسر کرسکیں۔ سال کا کم سے کم مثلاً پندرہ دن، ایک ماہ تین ماہ لکھوادیجئے۔ سوالات ۱۶، ۱۷، ۱۸ کوئی اہم سوال نہیں ہیں اس لئے ان کے جوابات آپ آسانی سے دے سکتے ہیں۔ سوال ۱۹ اس حیثیت سے اہم ہے کہ آپ کے خاندان کے لوگ اگر باہر گئے ہوئے ہیں اگر وہ ستائیس فبروری تک واپس نہ آئیں اور ان کے حیات کی تصدیق آپ نہ کریں اور ان میں سے ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ فارم ابتدائی شمار کنندہ سے مرتب نہ کروالیں تو آپ کی تعداد غلط ہوجائے گی، اس لئے ابتدائی شمار میں ان کے علاحدہ علاحدہ فارم تکمیل کرائیے اور آخری تنقیح کے روز بصورت واقعہ حیات کی تصدیق اور ان کی موجودگی کا یقین دلانا آپ کا فرض ہے۔ اگر آپ نے ابتدائی شمار میں جو یکم فبروری سے شروع ہوچکی ہے ان

کے علاحدہ علاحدہ فارم لکھوالئے تو ۲۸/ فبروری کو تصدیق یا اخراج کی نوبت ہی نہیں آئے گی
______ ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ سوالات اہم ترین سوالات ہیں اگر آپ کا بچہ کم پڑھا لکھا ہوتو اس کو بے پڑھا لکھا نہ سمجھئے۔ سوال ۲۰ کا جواب اُردو ہے جو زبان آپ جانتے ہیں، وہ لکھوا دیجئے۔ مثلاً فارسی، عربی، انگریزی خصوصاً یہ ہدایت اضلاع کے مسلمانوں کے لئے اہم ہے۔ سوال ۲۲ کا جواب غلط نہ دیجئے، سوال ۲۳، ۲۴ کے جوابات مشکل نہیں ہیں اگر کم تعلیم یافتہ ہوتو اس کے اظہار سے نہ شرماؤ۔ سوال ۲۵، ۲۶، ۲۷ کوئی ایسے اہم سوالات نہیں ہیں جن کے جواب کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہو۔

فقط

کمیٹی مردم شماری مملکتی مجلس اتحاد المسلمین

اس پروگرام کے مطابق قائدِ ملت نے مردم شماری پر بعد نماز جمعہ مکہ مسجد میں تقریر فرمائی۔ اپنی تقریر میں نواب صاحب نے مسلمانوں کو اس خصوص میں ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے حکومت کے اس اہم مسئلہ میں بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اضلاع اور دیہات پٹیل پٹواریوں کے سپرد ہیں، شکایتوں کا سلسلہ بندھا ہوا ہے اس لئے حکومت پٹیل پٹواریوں کے ساتھ ایک مسلم شمار کنندہ کو ساتھ رکھے اور اگر ہمارے رضا کار کو ساتھ نہیں لیا جارہا ہے تو کم از کم مدرسین کو جو سرکاری ملازم ہیں ان کے ساتھ شریک رکھا جائے اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مسلمانوں کو اس مردم شماری پر اعتبار نہ ہوگا۔ جہاں ہم صحیح اعداد و شمار درج کرانے کی مسلمانوں کو ہدایت کر رہے ہیں صداقت ہمارا شیوہ ہے۔ وہاں دوسرے ہماری تعداد کو گھٹا رہے ہیں اور اپنی تعداد کو غلط طور پر بڑھا رہے ہیں۔ بڑھانے کا پروپگنڈہ کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے دو فرائض ہیں، ایک دوسروں کی تعداد کو غلط طور پر بڑھنے نہ دینا اور دوسرا اپنی تعداد کو غلط طور پر گھٹنے نہ دینا۔ آٹھ دن کے لئے آپ کو سارے کام چھوڑ دینا چاہئے۔

(حوالہ : مردم شماری تقریر قائدِ ملت صفحہ ۴۸۸-۴۸۹ ۸/فبروری ۱۹۴۱ء

بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد)

مردم شماری کو صحیح بنانا آپ کا فرض ہے

محترم بہنو! زمانہ تیزی سے بڑھ رہا ہے وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جو زمانہ کا ساتھ دے رہی ہیں جو ساتھ نہ دیں گی وہ فنا ہو جائیں گی۔ آپ کا فریضہ ہے کہ اس مردم شماری کو صحیح بنانے کا تہیہ کر لیں۔ محلّہ کے دس پندرہ گھر ذمہ لے لیں ان کے پاس پہنچ کر مردم شماری کی اہمیت سے واقف کرائیں۔ آپ پردہ کے التزام کے باوجود کام کر سکتی ہیں۔ مجلس کے پیام کو دور دور تک پہنچا سکتی ہیں اور مردوں کو باخبر کر کے اپنی باخبری کا ثبوت دے سکتی ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ خواتین میں وہ شعور پیدا ہو جائے جو دکن کے مستقبل کی کامیابی کا ضامن ہو''۔ (حوالہ : بہادر یار جنگ کی سیاسی تقریریں مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۴۵۲-۴۹۰-۴۹۱ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی حیدر آباد)

بہادر خان کی ایک خصوصیت جوان کو قومی رہنماؤں میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی سیاست میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب کا کوئی مقام نہ تھا۔ ۱۹۴۱ء میں مردم شماری کی اہمیت اور اس کے مسائل، مسلم عوام کے ذہن نشیں کرانے، قمر باغ میں ایک مباحثہ اس سلسلے میں ترتیب دیا گیا کہ دونوں پہلو عوام کے سامنے آجائیں۔ موضوع بحث تھا :

''مردم شماری قومی مسائل کے حل کے لئے بہترین دستاویز ہے''۔

لطیفہ آرائیوں، نوک جھونک اور شوخیوں کی اس فضاء میں یکا یک ایک آواز بلند ہوئی۔ ''مجلس اتحاد المسلمین کی ہدایت کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ اغیار جھوٹے حربے استعمال کر کے اپنی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں اور اس طرح اپنے تناسب میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میری سیاست میں جھوٹ اور مصلحت کوشیوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ مجھے یہ منظور ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تیس فیصد سے گھٹ کر ایک فیصدی رہ جائے لیکن یہ گوارا نہیں کہ جھوٹ اور دھوکے سے صحیح تناسب قائم رکھا جائے''۔

یہ آواز قائدِ ملت بہادر خاں کی تھی۔ اس میں کوئی شوخی یا طنز نہیں تھا۔ بے باک صداقت اور مومن کا جوش جو تعداد اور کثرت کے پیمانوں کا پابند نہیں ہوتا۔ (حوالہ : ایک شخصیت ایک مطالعہ از مولوی محمد عمر مہاجر مرحوم صفحہ ۲۸۷-۲۸۸ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، کراچی)

مردم شماری کا یہ مرحلہ نواب صاحب کے سیاسی تدبر سے ثمر آور ثابت ہوا۔ اس مردم شماری

کی ہدایات میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ مسلمان اپنے کوصرف مسلمان لکھائے۔ بعض ناسمجھوں اور قیادت کی ہوس رکھنے والوں نے اس سیدھی سادی بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ بہادر خاں کی مہدویت کو اچھالا اور ایک نام نہاد انجمن اہل سنت والجماعت کے نام سے قائم کردی۔ پروپگنڈہ شروع ہوا کہ اہل سنت وضاحت کے ساتھ اپنے فرقہ کا نام درج کروائیں جب یہ خبریں قائدِ ملت کے کانوں تک پہنچیں تو انھوں نے اس معاملہ میں سکوت اختیار کیا——— مخالفین کی یہ تحریک اپنی موت آپ مرگئی۔ (حوالہ : ہمارا قائد صفحہ ۱۳۳-۱۳۴ ازمولوی محمد احمد خاں صاحب)

ان کے عزم جواں، جرأت و بے باکی، سعی پیہم، ایک مسلسل تڑپ و اخلاص کے باعث ملت کے لئے ان کی کوششیں ہمیشہ کامیاب وکامراں رہیں۔

◆◆◆

شرن بسپا کا دیول

۱۹۴۲ء

ریاست حیدرآباد کے ۱۶ ضلع تھے، ان میں ایک ضلع گلبرگہ شریف بھی ہے جہاں خواجہ بندہ نوازؒ کی آخری آرام گاہ ہے۔

اسی شہر گلبرگہ میں لنگایت فرقے کے مذہبی پیشوا شرن بسپا مادھو کے نام سے موسوم ایک بڑا مندر ہے۔

مندر سے ملحقہ ایک زمین کے بارے میں ایک عرصے سے مسلمانانِ گلبرگہ اور مقامی مسلمانوں کے درمیان تنازعہ فساد کی صورت اختیار کر گیا۔ صوبیدار صاحب گلبرگہ مولوی نواب امیر علی خاں صاحب صوبیدار سے اس خصوص میں تصفیے کئے۔ نواب صاحب سے خواہش فرمائی، دیول متذکرہ کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے کہ اس نزاع کا تصفیہ نواب صاحب فرمائیں، اس خصوص میں نواب صاحب نے جناب عبدالکریم صاحب تماپوری رکن عاملہ مملکتی مجلس اتحاد المسلمین کو اس خصوص میں مطلع کرتے ہوئے تحریر فرمایا :

صوبیدار صاحب گلبرگہ، مجلس عاملہ کے دوسرے یا تیسرے ہی روز میرے یہاں جاگیر تشریف لائے تھے اور دیول کی پوری کیفیت سمجھائی اور دیول کے بڑے پجاری صاحب کی طرف سے مجھے ایک خط دیا۔ میں نے ان سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور قصد کیا ہے کہ مجلس عاملہ کا آئندہ اجلاس گلبرگہ میں منعقد کیا جائے تاکہ برسر موقعہ اس قضیے کا قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔ عنقریب اجلاس کی تاریخوں سے مطلع کروں گا جو یقیناً ابتدائے جون میں ہوں گے، کیوں کہ ارکان عاملہ مئی میں ضلع کانفرنسوں کی وجہ سے مشغول ہیں۔

(حوالہ : خط نمبر ۱۸۸ صفحہ ۱۴۶ مؤرخہ ۳۱/ مئی ۴۲ء مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم)

مجلس عاملہ کا اجلاس اس خصوص میں گلبرگہ شریف میں منعقد ہوا، بعد موقعہ معائنہ مثل

متعلقہ اور وثایق سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانانِ گلبرگہ کا ادعا حق بجانب نہیں ہے اور عاملہ نے متعلقہ طور پر نواب صاحب کے ایماندارانہ فیصلے کی تصدیق کی اور فیصلہ صادر ہوا کہ زمین نزاعی زیر بحث کا علاقہ دیول شرن بسپا سے متعلق ہے۔ اس فیصلے نے گلبرگہ کے مسلمانوں کے ایک گروہ کے خیالات کو باغیانہ صورت گری کا موقعہ فراہم کیا جو بہرحال اس زمین کو مسلمانوں کی ملک سمجھتے تھے۔ اس خصوص میں کئی خط آئے۔ کئی وفود ملنے کے لئے آئے۔ نواب صاحب نے متذکرہ مسئلہ کے متعلق ایک خط کا جواب تحریر فرماتے ہیں :

''مکرمی! آپ کا تجربہ آپ کو گواہی دے گا کہ آپ کی مجلس نے آج تک کوئی کام حکومت یا ہندوؤں سے مرعوب ہوکر نہیں کیا اور الحمدللہ کے آج بھی اس کے کارکنوں کا ضمیر پاک ہے۔ اگر میرے ساتھیوں کے قلوب میرے قلبی تاثرات قبول کر سکتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سوائے للّٰہیت کے اور کچھ نہیں ہے اور جو فیصلہ خدا کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے اس میں ہماری فکر سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن ہماری نیت خراب نہیں ہوسکتی۔ سرن بسپا کی دیول کے سلسلہ میں مملکتی مجلس عاملہ نے جو کچھ کیا وہ خدا سے دُعائیں مانگ کر اور انصاف کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے، جس سے ممکن ہے مسلمانوں کو آج تھوڑا دُکھ پہنچے لیکن ان کے لئے کل اس میں بہت سا فائدہ ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ بے جا بدگمانیوں کو اپنے دل سے نکالیں، اپنی مجلس پر بھروسہ رکھیں اور اس کے امداد کے متوقع ہوسکتے ہیں۔ اگر ابھی تک آپ نے اپنی نمائندہ جماعت کی اطاعت کا درس نہیں سیکھا تو آئندہ قوم کو آپ سے کوئی توقع نہ رہے گی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ آپ کی نمائندہ جماعت نے فیصلے میں غلطی کی ہے تو مملکتی مجلس کے صدر کے خلاف آپ اپنی جماعت کے اندر رہ کر، مملکتی مجلس شوریٰ میں بے اعتمادی کی تحریک لانے کا حق رکھتے ہیں''۔ (حوالہ : خط نمبر ۳۰۶ مؤرخہ ۱۷/ جون ۱۹۴۲ء صفحہ ۳۲۴ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

نواب صاحب کی رائے کو تبدیل کرنے کی ہر کوشش ان کے ایمان صادق کے سامنے کارگر نہ ہوسکی۔ اس خصوص میں نواب صاحب کا آخری بیان نواب صاحب کی صداقت وانصاف پسندی کا آئینہ دار ہے۔

حیدرآباد ۱۷/امرداد- قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر سے دریافت کیا کہ ’’گلبرگہ کی خبروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے بعض مسلمانوں نے مملکتی مجلس عاملہ سے دیول شرن بسپا کے کمپاؤنڈ کے متعلق مجلس عامہ کے فیصلہ کی نظر ثانی کے لئے درخواست کی ہے‘‘۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ ایسی کوئی درخواست اب تک میرے پاس نہیں آئی اور اگر وصول بھی ہوتو اب اس پر کوئی توجہ نہیں کی جاسکتی کیوں کہ مجلس عاملہ نے اس مسئلہ پر کافی غور کیا ہے۔ راست معلومات حاصل کرنے کی غرض سے گلبرگہ ہی میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ ضلع کی مجلس عاملہ سے کئی گھنٹے کی ایک نشست میں مملکتی مجلس عاملہ نے تبادلہ خیال کیا۔ سرکاری امثلہ سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ موقعہ کا ایک سے زیادہ مرتبہ معائنہ کیا اور اس کے بعد جو رائے قائم کی اس کو لنگایت قوم کے نمائندوں نے بھی منظور کرلیا۔ اس لئے اب اس پر کوئی نظر ثانی نہیں ہوسکتی اور جو اُمور طے پاگئے ہیں ان کی تفصیلات کا پریس میں لانا بھی مناسب نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہر سنجیدہ آدمی مجلس عاملہ کے فیصلہ کو پسند کرے گا اور اس سے اتفاق رکھے گا۔

مسلمانانِ گلبرگہ کو میں حیدرآباد کے دوسرے اضلاع کی بہ نسبت زیادہ بیدار، زیادہ منظّم اور زیادہ باشعور پاتا ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ مجلس عاملہ نے جو فیصلہ کیا وہ اس کو دل سے قبول کریں گے، مملکتی مجلس کی طرف سے مولوی عبدالکریم صاحب تماپوری صدر مجلس ضلع گلبرگہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ صلح نامہ پر دستخط کریں۔ میں خوش ہوں کہ ایک دیرینہ نزاع کا باعزت اور منصفانہ تصفیہ ہوگیا۔ مجلس کی پالیسی ہمیشہ صداقت و انصاف رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی اور مسلمان کا سب سے بڑا شیوہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت اس آیت شریفہ کو پیش نظر رکھے۔ **ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھوا قرب للتقویٰ . واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون .**

(ترجمہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی مخالفت تم کو انصاف سے روک دے۔ انصاف کرو کیوں کہ یہی تقویٰ سے قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے خبر دار ہے۔ (حوالہ : رہبر دکن ۱۸/امرداد ۱۳۵۱ف م ۲۳/جون ۱۹۴۲ء سہ شنبہ)

’’مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ بہادر خاں مسلمانوں کے لیڈر ہیں، اس لئے مسلمانوں کے حق

میں فیصلہ کریں گے۔ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ ایک سچا انسان ہے کیوں کہ پکا مسلمان ہے اس لئے وہ ناانصافی نہیں کرے گا۔ نواب صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوؤں کا دعویٰ درست ہے اور مسلمانوں کا غلط، چنانچہ انھوں نے یہی فیصلہ دے دیا۔ مسلمان ناراض ہوگئے لیکن بہادر خاں نے انھیں قرآنی ارشاد سنایا کہ ''کسی قوم سے مخالفت تم کو ناانصافی پر نہ ڈال دے۔ انصاف کرو کہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے''۔ مسلمان تو خاموش ہوگئے لیکن ہندوؤں نے سمجھا کہ ان کا اندازہ کتنا صحیح تھا کہ ایک سچے مسلمان پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ سچا مسلمان شریف انسان ہوتا ہے''۔ (حوالہ : کیا پوچھتے ہو ——— کسے کھو دیا   ازمحترم المقام مولوی سید خلیل اللہ حسینی صاحب صدر کل ہند تعمیر ملت   مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں   مرتبہ نذیر الدین احمد   صفحہ ۲۵   ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد)۔

وہ مہرباں کہ غیر بھی اپنا کہیں جسے

◆◆◆

دارالسلام

۱۹۴۳ء

جب مجلس کی تنظیم ۴ صوبوں، ۱۶ ضلعوں اور ۱۹ تعلقات میں مستحکم ہوگئی تو مرکزی دفتر اور مسلمانوں کے اجتماعات کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت پوری شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ نواب صاحب کے صدر مجلس منتخب ہونے کے بعد سے مجلس کا دفتر نواب صاحب کی ڈیوڑھی بیت الامت میں تھا۔ اب بیت الامت کی وسعت بھی مجلس کی قومی ضرورت کے پیش نظر، اپنی تنگ دامنی کی شکوہ سنج بن گئی تھی۔ مسلمانانِ دکن کے واحد مرکزی نمائندہ ادارے کے لئے ایک وسیع عمارت کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی۔ جہاں مرکزی دفاتر کے علاوہ ملت کے اجتماع تعلیمی تربیتی ضروریات کی تکمیل ہوسکے۔ دارالسلام سے متصل ایک قدیم اور وسیع باغ موسومہ قمر باغ کے عدالتی ڈگری میں نیلام کا نواب صاحب کو علم ہوا۔ یہ عمارت اور ملحقہ زمین جو قمر باغ کے نام سے موسوم تھی (نواب ولی دادخاں کے جدِاعلیٰ نواب قمرالدین خاں) نے بنوائی تھی۔ قمر باغ کا مادۂ تاریخ ۱۲۵۶ ہجری ہے۔ مرحوم کا شاندار مقبرہ دارالسلام کے روبرو واقع ہے نواب ولی دادخاں کی ملک تھی۔ نواب صاحب نے اس جائیداد کو جو باون درا (جس میں ۵۲ دروازے ہیں) یا قمر باغ کے نام سے موسوم تھی۔ ۲۷ ہزار مربع گز اراضی اور ۳ بڑی عمارت پر مشتمل تھی نود ہزار روپے میں اس کی خریدی طے فرمالی۔ بیعانہ دے دیا گیا، مگر رقم کا بندوبست ایک مشکل مسئلہ بن گیا۔ اس خصوص میں نواب صاحب نے منتخب شخصیتوں کے نام خطوط لکھے جو دردمندانِ قوم تھے۔ یہ جائیداد نواب صاحب کیوں خریدنا چاہتے تھے اور اس جائیدا کو خریدنے کے بعد کیا منصوبے تھے، نواب مظفرنواز جنگ کے موسومہ خط میں اس کی وضاحت موجود ہے :

۱۵/مارچ ۱۹۴۳ء

نواب مظفر نواز جنگ بہادر

بلدہ، حیدرآباد

نواب صاحب مکرم ومحترم!

آپ میرے ان چند کرم فرماؤں میں سے ہیں جنھوں نے آج تک بغیر میری استدعا کے مجلس اتحادالمسلمین اور آل انڈیا مسلم لیگ کی سرپرستی فرمائی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آج میں پہلی مرتبہ آپ کے سامنے دستِ سوال پھیلا رہا ہوں۔ مجلس اتحادالمسلمین کے دفاتر ابھی تک میرے اپنے مکان میں تھے اور دکن کے مسلمانوں کی اس مرکزی جماعت کا اب تک کوئی مستقل مرکز نہیں بنا تھا اور اس کے بڑھتے ہوئے کاروبار کے مدنظر دن بہ دن اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بلدہ کے اندر کوئی ایسا وسیع مقام نہ تھا جہاں مجلس کی تمام ضروریات پوری کی جاسکیں۔ اب الحمدللہ ایک بہت اچھا مقام دستیاب ہو گیا ہے اور میری جرأتِ رندانہ نے اسباب ووسائل کا خیال کئے بغیر محض اللہ کے فضل اور آپ جیسے کرم فرماؤں کی سرپرستی کی توقع پر اس کا بیعانہ بھی کرلیا۔ نواب محمد ولی دادخاں صاحب جمعدار کا ''قمر باغ'' چوبیس ہزار گز زمین اور تین پختہ وسیع عمارت پر مشتمل ہے جہاں مجلس کا مرکزی دفتر رضا کاران کا مرکز اور مسلم طلباء کے لئے دارالاقامہ بغیر کسی تعمیر کے آسانی سے قائم کیا جاسکتا ہے اور تھوڑی کوشش سے مجلس کے لئے مستقل آمدنی کے ذرائع بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہ جائیداد ایسے اچھے مقام پر واقع ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ روپئے کے قریب کیا جارہا تھا لیکن مجلس نے اس کا معاملہ صرف نود ہزار روپئے میں طے کرلیا ہے اور آخرار دی بہشت تک مجھے رجسٹری کی تکمیل کروانی ہے۔ مجھے میرے اللہ نے آج تک شرمندہ نہیں کیا لیکن اس مرتبہ میں سخت پریشان ہوں اور آپ سے ملتجی ہوں کہ نہ صرف اپنے گرانقدر اور شایانِ شان عطیہ سے بعجلت ممکنہ مجھے ممنون فرمایئے بلکہ اپنے عالی مرتبت خاندان اور معزز احباب میں بھی ممکنہ سعی فرما کر جس قدر ممکن ہو میری امداد فرمایئے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا اور ملتِ اسلامیہ ہمیشہ آپ کی مرہون منت رہے گی اس خصوص میں امراء حیدرآباد میں بابوخاں، الہ الدین، عبدالرزاق کیمنٹ اور مظفر نواز

جنگ نے پورا پورا تعاون کیا اور ۱۰ ہزار روپے فی کس ان چاروں مغیر اور دردمندانِ قوم نے بطورِ عطیہ دیئے۔ عوام سے بھی کچھ رقم وصول ہوئی جو کچھ رقم تکمیل طلب تھی نواب صاحب نے اپنے جیبِ خاص سے ادا فرمائی۔ اس خصوص میں نواب سالار جنگ سے بھی نواب صاحب نے ملاقات فرمائی جو کبھی بھی ملی مفاد کے کاموں میں مالی معاونت نہیں کیا کرتے تھے کیوں کہ انھیں ملی کاموں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور مجلس سے انھیں بیر تھا۔ سالار جنگ نے جواباً کہا کہ میرے پاس ایک پرانا پرنٹنگ پریس ہے اسے فروخت کر کے اس سے جو رقم مل جائے وہ لے لیں۔ نواب صاحب نے ان کے اس پیش کش کو مسترد فرما دیا۔ (حوالہ : مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

نواب صاحب کا یہ ارشاد کہ ”مجھے میرے اللہ نے آج تک کبھی شرمندہ نہیں کیا“ اللہ پر اللہ کے اس نیک بندے کا یقین اس بار بھی اس کی للّٰہیت کا ثبوت بنا۔

۵/اپریل ۱۹۴۳ء کو قمر باغ کی مجلس اتحادالمسلمین کے نام رجسٹری عمل میں آئی۔

دارالسلام میں مجلس اتحادالمسلمین کا مرکزی دفتر قائم کیا گیا اور ذیلی شعبوں کے دفاتر کے قیام کے علاوہ اضلاع کے طلبہ کے لئے اقامت خانہ قائم کیا گیا۔ مولوی عبدالقدوس ہاشمی مؤدب مقرر کئے گئے۔

مولوی علی شبیر ہاتمی کی زیرنگرانی علومِ مشرقیہ کی تعلیم کا ادارہ قائم ہوا، جہاں میٹرک تک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔

مولوی علی شبیر ہاتمی کے زیراہتمام، اراکین مجلس کے تحت ایک بورڈ دارالاشاعت سیاسیہ کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے تحت ملک وملت کی سیاسی تربیت اور آگاہی کے لئے لائق ترین عمائدین و مصنفین سے مختلف سیاسی مسائل پر ۱۰ کتابیں لکھوائی گئیں اور ان کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔

حصول دارالسلام کے موقعہ پر مولانا ماہرالقادری نے اپنا منظوم نذرانۂ عقیدت بڑے دلکش انداز میں پیش فرمایا تھا۔

وہ زمین جو ویراں تھی زمانے سے
خدا کی شان کہ دارالسلام بن کے رہی

عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کی ہڑتال

۱۹۴۳ء

دکن کی مشہور جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ اور ریلوے ملازمین میں ۱۹۴۳ء میں ایک زبردست جنگ چھڑ گئی تھی ، ایسی ہی ایک جنگ سر اکبر کے دور میں بھی چلی تھی ۔ ۱۹۴۳ء کے جھگڑے کی ابتدا ایک معمولی واقعہ سے ہوئی ۔ بلا ٹکٹ سفر پر ریلوے پولیس نے ایک طالبِ علم کو ہتھکڑی لگا دی، بس پھر کیا تھا، ریلوے اسٹیشن نذر آتش ہوا۔ ریلوے پولیس، پولیس اور حکام سے طلبہ نے جذبہ انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اپنی توہین کا پورا پورا بدلہ لیا۔ ریلوے پولیس جو برٹش حکومت کی تھی ایک فریق بن گئی اور اس مسئلہ کو رزیڈنٹ نے سرکار برطانیہ کی عزت کا مسئلہ بنا دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے لڑکوں نے اس لڑکے کو جسے برٹش پولیس نے گرفتار کر لیا تھا حملہ آور ہو کر اس لڑکے کو چھڑا لیا اور پولیس کو بے بس کر دیا، لڑکا حسبِ ہدایت غائب کر دیا گیا۔ رزیڈنٹ کو اس بات پر اصرار تھا کہ لڑکا حاضر کیا جائے نظام کے وزراء پریشان تھے کہ کس طرح اپنے انگریز رزیڈنٹ آقا کے عتاب و غیض و غضب کو ٹھنڈا کریں۔ نواب صاحب چھتاری وزیر اعظم تھے، ان کی سرکاری قیامگاہ شاہ منزل میں وزراء اور متعلقہ عہدہ داروں کی میٹنگ طلب کی گئی ۔ علی یاور جنگ نے لڑکوں سے وعدہ لیا کہ وہ مفرور لڑکے کو ۱۹/ نومبر ۴۳ء کے دن حاضر کر دیں گے، لڑکا اگر حاضر ہو جاتا تو نواب صاحب چھتاری اور ان کے وزراء نے یہ طے کیا تھا کہ لڑکے کو یونیورسٹی کونسل سے اسے سزا دلائی جائے اور پھر اسے انگریز پولیس کے ذریعے گرفتار کر کے رزیڈنس کی عدالت کے سپرد کر دیں ۔ علی یاور جنگ اور وزیر فینانس مولوی غلام محمد کے مشورے کی روشنی میں رزیڈنٹ سے یہ طے پایا کہ اگر یونیورسٹی اس لڑکے کو سزا دے گی تو رزیڈنسی پولیس اپنا کیس واپس لے لے گی ۔ مفرور لڑکے کے حاضر ہونے کی اپیل کی گئی اور یہ بھی طے پایا کہ جب تک مفرور لڑکا حاضر نہ ہوگا ہڑتال میں حصہ لینے والے طلبہ کو یونیورسٹی میں حاضری کی اجازت نہیں دی جائے گی

فرداً فرداً ہر طالبِ علم کو معافی مانگنی پڑے گی ورنہ رسٹی کیٹ کر دیا جائے گا جب معلوم ہوا کہ ہڑتالی طلبہ کی تعداد ۸سو ہے تو اس تجویز کو مسترد کر دینا پڑا ـــــــــ اس نازک صورتِ حال میں اُمید کی ایک ہی صورت تھی، ثالت کی حیثیت سے قائدِ ملت کو تشریف لانا پڑا۔ نواب صاحب چھتاری سے ملاقات کی اس وقت ان کے پاس گریگسن بھی بیٹھے ہوئے تھے، طے پایا کہ ۲۵/ نومبر کو نواب صاحب چھتاری (جامعہ عثمانیہ میں) اس واقعہ پر اظہارتأ سف کریں اور لڑکوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کریں گے اسی وقت مفرور لڑکا وہاں موجود ہوگا۔ نواب صاحب چھتاری نے تقریر کی۔ مفرور لڑکا حاضر کر دیا گیا دوسرے دن رزیڈنٹ سے حسبِ قرارداد طے پایا کہ سکندرآباد کی عدالت میں لڑکے کو نیک چلنی کی ضمانت کے مچلکہ پر چھوڑ دیا جائے اور ایک سال کے لئے اسے یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ رزیڈنٹ سے گفتگو کے دوران رزیڈنٹ بہادر یار جنگ سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ یادِ ایام میں نواب صاحب چھتاری نے لکھا ہے کہ ’’ پھر وہ (رزیڈنٹ بہادر) بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ رزیڈنٹ نے کہا کہ وہ بہادر یار جنگ سے ملنا چاہتے ہیں، میں نے کہا میں انھیں چائے پر بلالوں گا‘‘۔ (یادِ ایام صفحہ ۱۵۲ سرسعید الملک نواب صاحب شطاری)

اس ہڑتال سے پورا شہر متاثر تھا۔ حکومت کی سطح پر جو کام نہ ہوسکا وہ قائدِ ملت کے ایک اشارے پر ہوگیا۔ رزیڈنٹ اس جادوئی شخصیت سے متعارف تھا لیکن اس واقعہ نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے فوری نواب صاحب سے شاہ منزل میں ملاقات کی عزت حاصل کی۔ گفتگو رزیڈنٹ اور نواب صاحب کے درمیان رہی۔ کوئی تیسرا آدمی وہاں نہیں تھا۔ والیٔ دکن کو اس ملاقات کی اطلاع نے بہت پریشان اور بدگمان و متفکر کر دیا کہ آخر رزیڈنٹ نے بہادر یار جنگ سے تنہا اتنی تفصیلی گفتگو کس پس منظر میں کی۔

یہ قائدِ ملت کا اعجاز تھا کہ ۵/ ڈسمبر ۴۳ء کو دوسرے ہی دن بغیر نیک چلنی کے صداقت نامے کے اور بغیر عدالت میں پیش کیے لڑکے کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

اور اس طرح نواب صاحب چھتاری اور ان کی کابینہ کے وزراء کی جان میں جان آئی۔

◆◆◆

اسلام کا معاشی نظام

۱۹۴۳ء

بین الاقوامی طبقاتی کشمکش اور نیا نظام معیشت جس نے زارروس کی دولت کو مزدوروں کا حق سمجھا، یہ انقلابی اشتراکی نظام، نظام ہائے معاشی کی کشمکش کے دوران پورے آب وتاب کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ ایک ایسا سیاسی معاشی نظام تھا جو خدا کے رازق ہونے کے تصور سے بعید دلوں سے خدا کو ہٹا کر سیاسی خدائی کا طوق گلے میں ڈالنے اور لینن و کارل مارکس کے نظریوں کے دروازے پر دستک دینے کی دعوت دے رہا تھا ——————

بہادر خاں، اپنے وقت کے دربار کے نقیب تھے، اسلامی مفکر کی حیثیت سے اس نظام معاشی کے خدوخال پر نظر ڈالی تو انھیں نئی نسل کے لئے ایک عظیم خطرہ، پرکشش نقاب اُوڑھے ہوئے، ان کے مذہبی، تہذیبی اقدار کو صف ہستی سے مٹانے پر آمادہ، برسرِ پیکار نظر آیا۔

”کارل مارکس کے فلسفہ کی جاذبیت اور اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر انھوں نے اس امر کا تہیہ کرلیا تھا کہ اسلام کے معاشی نظام پر باضابطہ مفصل تحقیقات کروائی جائے یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا جس کی طرف انھوں نے اپنی پوری توجہ مبذول کی تھی۔ اسلامی معاشیات پر تحقیق کی انھوں نے تین مختلف کمیٹیاں بنالی تھیں، ایک کمیٹی علوم عمرانی معاشیات و سیاسیات کے ماہرین پر مشتمل تھی اور دوسری کمیٹی کے ارکان علومِ اسلامی کے ماہر تھے، تیسری کمیٹی میں انھوں نے معاشیات، سیاسیات اور علومِ اسلامی کے ماہرین کو شریک کیا تھا اور ان ساری کمیٹیوں کی روح رواں وہ خود ہی تھے، ان کمیٹیوں نے اپنا ابتدائی کام تقریباً مکمل کرلیا تھا“۔

(حوالہ : ہمارا قائد ازمحترم مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۱۲۲-۱۲۳)

اپنی شہادت سے صرف ۹ ماہ قبل اس کام کا آغاز فرمایا۔ اہل علم وفن و ماہرین علوم متعلقہ کے نام حسبِ ذیل مضمون کا خط روانہ فرمایا اور پہلی نشست منعقد ہوئی۔

''یہ امر آپ سے زیادہ کس پر واضح ہوسکتا ہے کہ دُنیا اس وقت مختلف نظام ہائے معاشی کی باہمی کشمکش کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور مسلمان اپنے سے کسی مرتب نظام معاشی کو موجود نہ پا کر پریشان ہیں کہ کس تحریک کا ساتھ دیں، ان کا یہ ذہنی انتشار اکثر صورتوں میں ان کو غلط راستوں کی طرف لے جارہا ہے، میں ان مسائل میں کوئی ماہرانہ نظر نہیں رکھتا، لیکن ایک عام فردِ ملت کی حیثیت سے ان پر غور کرتا رہا ہوں۔ بعض تجاویز جو ایک خوشگوار خواب کی طرح میرے پیش نظر ہیں ان کی تعبیر آپ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لئے باعثِ منت ہوگا اگر آپ بتاریخ ۱۴/ شوال ۱۳۶۲ م ۱۴/ اگست ۱۹۴۳ء روز پنجشنبہ بوقت ۶ ساعت شام میرے ساتھ چائے نوش فرمائیں۔ آپ کا جواب میرے اطمینان کا باعث ہوگا ——— ''آپ کا مخلص محمد بہادر خاں''

(حوالہ : تاثرات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۶۴-۶۵)

اس خط کو جو پہلی کمیٹی سے متعلق تھا، حسبِ ذیل اصحاب کو روانہ کیا گیا : ۱) ڈاکٹر انور اقبال قریشی ۲) پروفیسر عبدالقادر ۳) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۴) ڈاکٹر حمید اللہ ۵) ڈاکٹر جعفر حسین ۶) ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷) پروفیسر غلام دستگیر رشید ۸) مولوی مظہر الدین صدیقی ۹) کامریڈ مخدوم محی الدین ۱۰) مولوی الیاس برنی ——— آخر الذکر کے سوا تمام اصحاب نے نواب صاحب کی دعوتِ فکر میں نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ پورا پورا تعاون کیا۔

اس کمیٹی کا مقصد تمام نظام ہائے معاشی کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام معاشی کا تقابلی مطالعہ کرنا اور اسلامی نظام معاشی کو ایک قابل عمل مرتب شکل میں دُنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔

اس معاشی کمیٹی میں مزید ارکان کا اضافہ بھی ہوتا رہا، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر یوسف الدین، خواجہ حمید احمد وغیرہ۔ (اسلام کے معاشی نظریے از ڈاکٹر یوسف الدین)

کام آگے بڑھتا گیا، اس خصوص میں اپنی شہادت سے ایک ماہ قبل نواب صاحب نے سفیر روس متعینہ کابل کو ۲۴/ اپریل ۱۹۴۴ء کو حسبِ ذیل خط روانہ فرمایا :

''حیدرآباد کے علمائے معاشیات اور مسلم علمائے دین کی ایک جماعت مستقل عالم کے معاشی نظام کی نسبت غور وفکر کررہی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پیش نظر سویت روس کا موجودہ نظام معاشی بھی ہے اور خصوصاً یہ کمیٹی یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ ترکستان وقفقار کی مسلم آبادیوں

میں جو نظامِ معاشی جاری ہے اس کو وہاں کے مسلم علماء نے کس بنیاد پر قبول کیا ہے۔ اس لئے میں آپ سے متوقع ہوں کہ سویت روس کے موجودہ نظامِ معاشی کی تائید میں مسلم علماءِ دین کا اسلامی نقطۂ نظر سے لکھا ہوا کوئی لٹریچر اگر انگریزی، عربی، فارسی، ترکی یا کسی اور زبان میں مل سکے تو بعجلت ممکنہ فراہم فرمائیے''۔

نواب صاحب کو اس کام سے انتہائی دلچسپی اور رغبت تھی وہ فرمایا کرتے تھے ''اگر مجھ سے تنہا یہی کام انجام پائے، کچھ اور نہ بن پڑے تب بھی میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کامیاب رہی''۔

''ایک باقاعدہ طریق کار بنالیا گیا اور کام جاری ہوگیا، مرحوم کو اس کام سے اس قدر دلچسپی تھی کہ خود اس کمیٹی کے داعی بن گئے۔ خود روئیداد لکھتے اس کی اہمیت ان کی نظر میں زندگی کے ایک بڑے مقصد کی سی تھی۔ مختلف تقابلی مطالعے کے ساتھ سرمایہ داری، کمیونیزم اور اسلام کے اُصول ماہرین سے مرتب کرائے جاتے۔ ترتیب دیئے ہوئے نقاط کی مطبوعہ نقلیں اراکین میں گشت کرالی جاتیں۔ مطالعہ کے بعد مشترک صحبت میں جرح وتنقید ہوتی۔ جانچ پڑتال کے بعد سارے مباحث اور مسائل کو سامنے رکھ کر ایک باضابطہ تفصیلی سوال بند ترتیب دیا گیا، ان تنقیحات کی روشنی میں تحقیقی کام جاری تھا''۔ (حوالہ : اسلامی اشتراکیت یعنی اشتراکِ دولت کے اسلامی اُصول وآئین عرض حال صفحہ۴ عبدالرزاق خاں ایل-ایل-ایم رکن اسمبلی حکومت آصفیہ، حیدرآباد)

یہ کام جس معیار اور سرعت سے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا ایک سرسری اندازہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم صنعت وحرفت کے موسومہ خط مؤرخہ ۲۵/ جنوری ۴۴ء سے ہوتا ہے کہ صرف پانچ ماہ میں یہ کام کس منزل پر تھا جس میں نظام ہائے معاشی کی یادداشتوں کے مرتب ہونے اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی ماہرِ علومِ معاشیات کی یادداشت نظام اصل داری و اشتراکیت کا ذکر مذکور ہے :

''مکرمی! مسلم نوجوان میں اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے میلانات کو محسوس کرکے میں نے اپنے بعض احباب کے مشورے سے یہ ارادہ کیا کہ دُنیا کے موجودہ نظام ہائے معاشی کو مدِ نظر رکھ کر اسلامی نظام معاشی کا متقابل مطالعہ کیا جائے اور اگر ہوسکے تو کوشش کی جائے کہ اسلامی نظامِ معاشی کو ایک قابل عمل مرتب صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ اس مقصد کی تکمیل

کے لئے میں نے ایک کمیٹی بھی مرتب کرلی ہے اوراس کے محترم ارکان نے دُنیا کے مختلف نظام ہائے معاشی پر یادداشتیں مرتب کرنا شروع کردی ہیں۔ان میں سے ایک یادداشت نظام اصل داری واشتراکیت مرتبہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی چھپ کر تیار ہوگئی ہے۔اس کا ایک نسخہ ملفوف ہے، تمام احباب متفق الرائے ہیں کہ اس کمیٹی میں آپ بھی بحیثیتِ رکن شرکت فرمائیں۔عنقریب اس کا اجلاس منعقد کر کے آپ کی خدمت میں اطلاع کروں گا۔آپ کے تعاون واشتراک عمل کا دل سے متمنی ہوں۔اُمید کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔

''بہادر خاں''

(حوالہ : مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول صفحہ۴-۵ ۲۵/جنوری ۱۹۴۴ء ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی)

''اپنی زندگی کے آخری زمانے میں نواب مرحوم اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ جدید دُنیا میں اور آزادیوں کی طرح قومی معاشیات کی آزادی کو بھی منصوبہ بندی سے بدلنے کی ضرورت ہے اور کمیونسٹ اور سوشلسٹ تحریکوں سے بھی ان کا معقول ومفید اور قابل عمل حصہ لے کر یہ معلوم کیا جائے کہ اسلام اس کی کس حد تک اجازت دیتا ہے، مسلمانوں میں صدیوں سے رواج وروایت جو بھی رہی ہو اگر ان مذکورہ عناصر کی اسلام میں اجازت بھی ملتی ہو تو اس سے استفادہ کیا جائے۔

چوں کہ یہ کام فنی بھی تھا اور کئی جہتی بھی اس لئے انھوں نے اساتذۂ دینیات، اساتذۂ معاشیات اور اسلامیات کی مشرقی ومغربی دونوں قسم کی تعلیم کے جامع افراد کو خاص طور پر جمع کیا، اس کمیٹی میں کامریڈ بھی تھے، ملا بھی تھے، لیکن سب کے سب وطن دوست اور جو یائے حق تھے۔

کمیٹی نے بہت سے اجلاس کئے، کام میں کافی ترقی ہوئی، بنیادی مسائل متعین ہو کر سوال بند تیار ہوا اور سوال بند کی شرح بھی مرتب ہونے لگی تا کہ اس کا صحیح مفہوم سمجھ کر فقیہ اس پر رائے دے سکے۔ان کی اچانک موت سے پہلے جو آخری کام ہوا تھا وہ غالباً یہی تھا''۔

(حوالہ : دکن کی ایک کثیر جہتی شخصیت صفحہ۵-۱۴ روح ترقی ۱۳۶۷ھ از ڈاکٹر حمید اللہ)

میر کارواں کی شہادت کے بعد یہ حسین خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

◆◆◆

اسیرِ گیسوئے اُردو

حصولِ آزادی کے کچھ عرصہ قبل ہی سے یکا یک ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت ہندوستانی تہذیب اور بیس التہذیبی پہلو کی حامل اُردو زبان کی مخالفت میں ایک سیاسی محاذ قائم ہوگیا اور حصولِ آزادی کے بعد تو یہ سلسلہ عصبیت کی علامت کے طور پر پوری طرح اُبھرا اور اقلیتوں کے مطالبات میں اُردو سے انصاف کا مطالبہ ایک مستقل باب بن گیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تنگ نظر فرقہ پرست اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ کوئی جاندار زبان کسی کے بنائے کبھی بنی ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ یہ قومی بدبختی ہے کہ ہندی اور اُردو کو تنگ نظر فرقہ پرست سیاستدانوں نے ایک دوسرے کا حریف بنا کر سیاست کے دنگل میں کھڑا کر دیا۔ اس خصوص میں قومی قائد اور مادری زبان کے محافظ کی حیثیت سے قائدِ ملت نے اس زبان کی قومی حیثیت کو منوانے میں بھرپور حصہ لیا۔ ویسے "اُردو زباں و ادب پر حیدرآباد ہی نہیں ہندوستان (برصغیر) کے اس بے مثل و بے نظیر خطیب نے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی چکا چوند ابھی آنکھوں میں باقی ہے ——— الفاظ کی صنعت گری اور مطالب کی بلند پروازی کو وہ اپنی تقریروں میں عجیب ساحرانہ انداز سے سمویا کرتے تھے۔ اقبال کے اس فقیر بے نوا نے اپنی متاعِ عزیز کو یوں بے غل و غش لٹایا کہ ادب و زبان کے گل چینوں کو تنگیٔ داماں کی شکایت رہ گئی"۔

(حوالہ : ہمارا قائد از مولوی محمد احمد خاں صفحہ ۲۲)

اُردو زبان سے ان کی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہوں یا پرائے اگر کوئی ذرہ برابر بھی اس بات سے بے اعتنائی برتتا تو ان کی طبیعت مکدر اور ان کا مزاج بے مزہ ہوجاتا اور ساتھ ہی ان کا قلم نوکِ نشتر بن جاتا۔ اس خصوص میں ان کے نوکِ نشتر کی جراحت کے یہ چند نمونے اُردو کی رگِ جاں سے ان کے تعلقِ خاطر کی گواہی دیتے ہیں۔

نائب معین امیر جامعہ کو ایک دعوت نامے کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "اُردو زبان کے واحد علمی مرکز جامعہ عثمانیہ کے نائب معین امیر کا مغربی زبان میں لکھا ہوا دعوت نامہ علومِ مشرقیہ کی

کانفرنس کے لئے پہنچا۔ پڑھ کر سخت تکلیف ہوئی''۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول خط نمبر ۱۲۸ صفحہ ۱۸۰)

سکریٹری مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن راولپنڈی کے جوابی خط میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں :

''سب سے پہلے تو مجھے اس کی شکایت ہے کہ ہم سب کانگریس سے گلہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری زبان اُردو کو ختم کرنا چاہتی ہے اور خود پنجاب سے مجھے ایک سات دریا پار کی زبان میں لکھے ہوئے خطوط پہنچتے ہیں جس کو اُردو کا مرکز کہنا چاہئے''۔ (مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول خط نمبر ۲۱۴ صفحہ ۲۵۱)

سردار اورنگ زیب خاں صدر اعظم صوبہ سرحد بھی نواب صاحب کے نوکِ نشتر سے نہ بچ سکے۔ آخر میں ایک چھوٹی سی شکایت ——— کہ لیگ کی ہائی کمانڈ کے ایک رکن اور لیگی وزارت کے ایک وزیر اعظم کا خط ایک اُردو کے خادم کی طرف انگریزی میں آنا، اُردو زبان کی ایسی توہین ہے جس کا دعویٰ آپ ہی کے اجلاس پر پیش ہونا چاہئے۔ (حوالہ : خط نمبر ۴۴۱ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

قائدِ ملت اُردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کا بین التہذیبی پہلو خیال فرماتے جس کی حفاظت کو وہ مقصد اور فرض متصور کرتے۔

وہ مرکز جہاں دو تہذیب، دو نصب العین، دو فرقوں یعنی ہندو اور مسلمان کو یکجا کرتے ہیں وہ اُردو ہے۔ میں اس بین التہذیبی پہل کی ہر ممکنہ حفاظت چاہتا ہوں۔ ہر ہندو اور مسلمان کو چاہئے کہ اس مقصد کے لئے خود کو وقف کردے۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر ازنذیر الدین احمد صفحہ ۵۵۶، ۵۵۷)

مملکتِ حیدرآباد کی سرکاری زبان اُردو رہی۔ ۱۶ اضلعوں میں تعلیمی اداروں میں ابتدائے دسویں جماعت تک اور خود کالج اور جامعہ (جامعہ عثمانیہ) میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم رہا۔ لیکن مراسلت دفتری میں انگریزی کا رواج چل رہا تھا۔ اس خصوص میں وہ سخت احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں اُردو کے کعبہ سے کہہ رہا ہوں ——— پروفیسر ہارون خاں شیروانی، جہاں آپ اُردو پڑھانے کے لئے آئے تھے وہاں اُردو کے گلے پر چھری پھیری جارہی ہے۔ چند ایسے افراد جو پروردہ

آغوش انگریزی تھے ان کا قلم سیدھی طرف سے چلنے کے بجائے اُلٹی طرف سے چلنے لگا، گویا اُلٹی گنگا بہنے لگی۔ میں حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پیشانی سے اُردو کے قتل کا دھبہ مٹائے۔

(بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں از نذیر الدین احمد صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷)

نہ صرف اُمورِ دستوری، تعمیرات، صنعت و حرفت انتہا یہ کہ جامعہ عثمانیہ اور تعلیمات کے محکمہ جات میں بھی یہ سلسلہ چل رہا تھا، اس خصوص میں نواب صاحب اپنے ایک اہم سیاسی خطبہ میں بڑی سختی سے اربابِ متعلقہ کو متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''زباں کو ہر ملک اور ملت میں جو تہذیبی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، سلطنت حیدرآباد کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے۔ یہ بات اب ملک میں نہایت بے چینی کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے کہ محکمہ جات سرکاری جن کو حکومتی زبان کا سب سے بڑا محافظ ہونا چاہئے، اس کی تخریب اور تباہی کے درپے ہے۔ کتنے ہی ایسے محکمے ہیں جن کی زبان رفتہ رفتہ انگریزی ہوتی جارہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

برٹش انڈیا کے سیویلیں یا صوبہ سرحد کے فوجی عہدیداروں کی طرح وہ بقدرِ ضرورت اُردو سیکھ لیں اور کسی انگریز عہدہ دار کا انتخاب حیدرآباد کے عہدہ پر اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک وہ اُردو سے واقف نہ ہوجائیں۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب کہ حیدرآباد میں اُردو، مدارس کی کتابی زبان بن کر رہ جائے گی''۔ (خطبات بہادر یار جنگ از نذیر الدین احمد صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱)

مشترکہ کلچر کے مسئلہ میں اُردو کے افادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کا مسئلہ، ہندوستان کے مشترکہ کلچر کا مسئلہ ہے اس وسیع و عریض ملک میں جہاں دو مختلف مذاہب اور مختلف تہذیب رکھنے والی قومیں آباد ہیں، اُردو زبان ہی وہ نقطۂ اتحاد ہے جو ان دونوں قوموں کو تاریخ کے کسی دور میں ایک مرکز پر جمع کرسکتا ہے ——— اُردو حیدرآباد کی سرکاری زبان ہے اور رفتہ رفتہ بین الاقوامی اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انگلستان، جرمن، جاپان اور ترکی کی لاسلکی مراکز جب ہندوستان کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو اُردو زبان میں مخاطب کرتے ہیں لیکن اُردو زبان کی اہمیت کو اگر کہیں گھٹایا جارہا ہے اور

دوسروں کے نہیں خود حیدرآبادی حکومت کے ہاتھوں گھٹایا جارہا ہے۔ سررشتہ تعلیمات نے جہاں تک دیہاتی مدارس میں ابتدائی تعلیم مادری[1] زبان میں رکھی ہمیں اعتراض نہ ہوا۔ لیکن اب بعض قیود اور بندشوں کے ساتھ ثانوی مدارس میں بھی مادری زبان کو رواج دینے کا رجحان روبہ ترقی ہے جس کو ہم قطعاً برداشت نہیں کرسکتے ——— اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ صدر اعظم بہادر کے اُردوداں شرکاء کار یعنی وزرائے حکومت اپنی مادری زبان پر غیر زبان کو ترجیح دینا باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اگر یہ کفر کعبہ اُردو ہی سے اُٹھنے لگے تو پھر اُردو کا خدا حافظ ہے۔

(خطبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۳۲۳-۳۲۴)

اُردو زبان کی حفاظت اور سرپرستی کے تعلق سے اپنے خطبۂ صدارت میں نواب صاحب نے ارشاد فرمایا :

''مجلس ان تمام ادبی اداروں کی سرپرستی میں اپنی اخلاقی اعانت کا وعدہ کرے جو زبانِ اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے کام کررہے ہیں''۔ اس طرح اُردو زبان کی ترویج وترقی کا پروگرام مجلس کے مقاصد کا جز بنا، کیوں کہ نواب صاحب اپنی سیاسی بصارت وبصیرت کی روشنی میں اُردو کے مسئلہ کو اسلامی تہذیب وسیاست کا ایسا سوال سمجھتے تھے جو کسی اور اہم مسئلہ سے کم اہم نہیں۔

میں اور مجلس ہندوستان میں اُردو کے مسئلہ کو صرف ایک زبان کا مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اسلامی تہذیب وسیاست کا ایسا سوال سمجھتے ہیں جو کسی اور اہم مسئلہ سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس کا کوئی اجلاس اور میرا کوئی خطبہ اُردو زبان کی ترویج وحفاظت کی تائید سے خالی نہیں ہوتا حتی الامکان اُردو زبان کی خدمت کرتا رہتا ہوں۔ انجمن ترقی اُردو کے کاروبار میں اگر میں نے عملی حصہ نہیں لیا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی مولوی صاحب (عبدالحق) نے اس کی دعوت نہیں دی اور میں نے بے وجہ ان کے کام میں دخیل ہونا پسند نہیں کیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے مجھ سے آل انڈیا اُردو کانگریس کی سرپرستی قبول کرنے کی

---

[1] (نوٹ) یہاں لفظ مادری زبان سے مراد تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانیں ہیں۔ مملکتِ حیدرآباد کے ۱۶ ضلعوں میں اُردو علاقائی زبان تھی لیکن ابنائے ریاست کے تلنگانہ علاقے میں رہنے والوں کی مادری زبان تلگو تھی مرہٹواڑہ میں رہنے والوں کی زبان مرہٹی، کرناٹک کے رہنے والوں کی زبان کنڑی تھی۔

درخواست کی تو میں نے اس کو محض اُردو زبان کی خدمت سمجھ کر قبول کرلیا۔ مولوی صاحب (عبدالحق) کے خط سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہ اس کو بھی اپنے خلاف ایک محاذ تصور فرماتے ہیں!

(خط نمبر ۶۰۰ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

نواب صاحب اُردو کی حفاظت و ترقی کو ایک مقدس فریضہ تصور فرماتے تھے کیوں کہ اس کا وسیع پس منظر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے وابستہ رہا ہے۔

''اُردو زبان کی حفاظت و ترقی ہندوستان کا مقدس فریضہ ہے اسی کی حفاظت میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں اُردو ہی ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بنے گی''۔ (حوالہ : خط نمبر ۲۹۳ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

ناگپور میں یومِ اُردو میں اُردو زبان کے افادی پہلو پر نواب صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی اس کے مطالعہ سے اس زبان کے وجود میں آنے کے محرکات اور سماجی مضمرات جس سے اس زبان کے تہذیبی و تمدنی اثرات کے پہلو سامنے آتے ہیں، قابل غور و قابل مطالعہ ہیں۔

''ساری تعریف اس خدا کو سزاوار ہے جس نے انسان کی صورت اور آواز کے ساتھ اس کی زبان کو بھی اپنی نشانی بنایا اور زبان کے اختلاف میں بہت سی حکمتوں کو پوشیدہ رکھا''۔

ہندوستان کی سرزمین جس پر مختلف قومیں آباد ہیں، جن کے مختلف تمدن ہیں۔ ہندوستان کی مختلف قومیں آج تک اپنی تہذیبوں اور کلچروں کو متحد نہ کرسکیں لیکن ہندوستان کسی مقام پر پہنچ کر اگر ایک ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے تو وہ ایک ہی مقام ہے اور وہ اُردو زبان کا مقام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں اور ملتوں کے اختلاف کو دور کرنے اور دوسرے کے نقطۂ خیال کو سمجھنے کے لئے اُردو زبان عالم وجود میں آئی ہے جو فاتحین بیرونِ ہند سے ہندوستان آئے ان کے لئے ہندوستانیوں کی بولی کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا اور اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انھوں نے ایک اچھا طریقہ ایجاد کیا۔ اُردو زبان باہر سے لائی ہوئی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ہندوستان ہی میں ڈالی گئی ہے۔ اگر آپ اُردو زبان کے الفاظ کو سامنے رکھیں اور غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان میں عربی، فارسی کے مقابلہ میں ہندی بھاشا کے الفاظ زیادہ ہیں۔ ہر زبان تین کلمات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسم، فعل، حرف۔ اگر ان تینوں کے لحاظ سے اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ اُردو زبان کے ایک ثلث سے زیادہ

الفاظ ہندی بھاشا سے مشتق ہیں۔ اُردو زبان کے سرمایہ کا جب یہ حال ہو تو یہ کہنا کہ وہ باہر سے آئی ہوئی ہے کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی و تمدنی خصوصیات کو اُردو زبان میں ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں، اس کے دیکھنے کے لئے پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند کا لٹریچر دیکھنا چاہئے ——— واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جس عمدگی اور خوبی سے ہندوستانی تہذیبی اور تمدنی رجحانات کو پیش کیا ہے وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اُردو زبان میں جتنی قوتِ جاذبہ ہے اور اس میں الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی جو صلاحیت ہے وہ دُنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ اُردو زبان کے دروازے کو دوسری زبان کے الفاظ کے داخلہ کے لئے ہمیشہ کھلا رہنا چاہئے''۔

(حوالہ : اُردو زبان شائع شدہ ہماری کتابیں حیدرآباد مارچ، اپریل ۱۹۴۳ء)

''زبانِ اُردو مشترکہ تہذیب کی دوسری سب سے بڑی میراث ہے۔ زبانِ اُردو کو غیر ملکی زبان قرار دینا بیسویں صدی کی سب سے بڑی دھوکہ دہی ہے'' ———

''مسٹر گاندھی جیسے مدبر نے یہ بالکل درست کہا کہ حامیانِ اُردو کو چاہئے کہ ہندی سیکھیں۔ ایک دفعہ مسٹر گاندھی نے مجھے ہندی میں خط لکھا تھا جس کا میں نے اُردو میں جواب دیا''۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقاریر صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۶ مرتبہ نذیر الدین احمد)

اُردو کا یہ محافظ آخر دم تک اُردو کا نگہبان رہا۔ جب بھی لیلیٰ اُردو پر کوئی افتاد آئی یہ سینہ سپر ہو گئے۔ لیلیٰ اُردو کے گیسوئے پریشاں کو اپنے دستِ حکمت سے سنوارا، پھر اپنے قلم، زباں و بیاں سے اس کی نوک پلک کو سنوارا، اور جی جان سے اس کی آن بان کا خیال رکھا۔ ہر قدم پر ہم قدم رہے۔

ان کے نگارخانہ تحریر و تقریر میں ہر سو لیلیٰ اُردو کے جلوے، نگارخانہ دل کو مائل بہ التفات کرتے ہیں اور نطق کی بے چارگی زباں کے بوسوں پر عقیدت کی آخری سانس لینے پر مائل ہو جاتی ہے۔

◆◆◆

خطوط نویسی

کاغذ کے وجود میں آنے سے قبل اور پتھر، تانبے، موم اور لکڑی پر اپنے مدعا کو تحریر کرنے کے زمانے سے خطوط نویسی کی دلچسپ تاریخ کاغذ کے عالم وجود میں آنے تک مختلف ادوار سے گذری۔

مغلوں کے آخری دور سے جب لشکری زبان ترکی لفظ کا لبادہ اُوڑھ کر اُردو کہلانے لگی تو اس زبان میں بھی بڑی کم مدت میں خطوط نویسی نے وہ جوہر دکھائے کہ اُردو خطوط نویسی عرضِ سخن بھی بنی اور گنجینۂ فن بھی۔ اس کے ہر دو پہلو مقصدی رہے ہیں، ایک تو خطوط انسانی تہذیب کے ارتقاء کی اہم بنیاد ہیں اور دوسرے انسان کی بنیادی سماجی ضرورت بھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں پہلی بار ۱۸۵۴ء میں خط امیر و غریب ہر دو کے لئے فیضِ عام بنا اور اسی سن یعنی ۱۸۵۴ء میں ڈاک کے ٹکٹ بھی پہلی بار منظرِ عام پر آئے جسے ڈاک لیبل کہا جاتا تھا۔

غالبؔ سے پہلے خطوط میں استعمال کی جانے والی زبان ''نثر میں نظم'' ہوا کرتی تھی، ساتھ ہی القاب کی طوالت، ہجوم القاب میں مکتوب الیہم کا نام پڑھنا دشوار مسئلہ تھا۔ مروجہ طویل القاب میں سے ''چند مختصر'' کا یہ حال تھا۔

دوست کے نام : دوست مشفق و مہربان، محبّ دل نواز، مجمع مکارمِ اخلاق و منبع محاسن اشفاق، مخلص بہ اخلاص دوست بہ صفا۔

بیوی کے نام : محرم راز، ہمدم و ہمساز، انیس خاطر غمگین، تسکین بخش دل اندوہ گیں، سلامت باش۔

اس خصوص میں مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا تھا :

''اکثر پُر لطف القاب کے ہجوم میں نام کا پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ بعض اوقات خطوط کے مطلب کو سمجھنے کے لئے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی تھی''۔ (مقالات گارساں دتاسی ۱۸۷۰ء)

یہ غالب سے پہلے کے دور خطوط نویسی کا حال تھا۔ ابتدائی دور میں خطوط نویسی پر جو کتابیں

لکھی گئیں ان میں مکتوباتِ احمدی و محمدی، رقعات عنایت علی، انشاءِ اُردو (۱۸۶۳) ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور میں بھی یہی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

۱۸۴۹ء سے غالب کی خطوط نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔

''میں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصل کے مزے لیا کرو''۔

سرسید کے دور میں خط مضمون بن گیا۔ محسن الملک، وقارالملک، شبلی، حالی اور اکبرالہ آبادی تک یہی رنگ غالب رہا۔

۱۹۱۴ء سے داغ، امیر مینائی کے دور تک زبان کی چاشنی اور اختصارِ خط کی خصوصیات بن گئے جنگِ عظیم دوم کے بعد ذہن وفکر کے انقلاب نے خط نگاری کو بھی متاثر کیا۔ اس تاثر کو قبول کرنے والوں میں جوش، فراق اور شوکت تھانوی کے نام آتے ہیں۔

پھر جو دورِ جدید نے ترقی پسندی کا راستہ اختیار کیا تو بات ''زیرلب'' آ گئی، زیرلب، عزیزم کے نام، گویا دبستاں کھل گیا۔ میں سادگی، اظہار مدعا کی بے با کی، خط میں درمیان میں کہیں کہیں رنگینی نے اپنا رنگ جمالیا۔

ابوالکلام آزاد، اقبال، مہدی افادی، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی کے دور میں فاضلانہ علمی شان کے زروجواہر سے خط کا دامن مالامال ہو گیا۔

علمی، ادبی، مذہبی شخصیتوں سے قطع نظر سیاسی شخصیتوں کی خطوط نویسی کی تاریخ، ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور تحریکِ خلافت کی دین ہے۔

اُفق دکن پر ۱۹۳۱ء سے جو آفتابِ خطابت اپنی سحرنواز تقریروں کے ذریعے اُفق سیاست پر پوری آب وتاب سے نمودار ہوا، اس قائدِ ملت لسان الامت کو خدا نے اپنے کرم سے ایسی صلاحیتوں سے نوازا کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اس بہ عظمت انسان کی عظمت کا زبانِ حال سے معترف نہ رہا ہو، میدانِ سیاست کا یہ شہسوار خطیب بھی تھا اور ادیب بھی، شاعر بھی تھا اور نقیب بھی۔

۱۹۳۱ء سے ۲۵/ جون ۱۹۴۴ء تک کے عرصے میں اس مجاہد بہادر خاں کی زندگی شہادت تک

اتنی برق رفتار تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل کے حل اور دکن کے مسلمانوں کی صیانت کے لئے ان کی زندگی کا ہر لمحہ قوم کی امانت بن گیا۔

اسی عوامی تعلق کی بناء پر ہندوستان کے بڑے سے بڑے سیاستداں، عالم، ادیب، اربابِ اقتدار، پیشوایانِ مذاہب، زعماء سے لے کر دوست احباب کے علاوہ ایک معمولی طالبِ علم اور اہل غرض تک کے سینکڑوں خطوط کا انھیں جواب دینا پڑتا۔

قدرت کو نواب صاحب کے ان گراں قدر خطوط کی حفاظت مقصود تھی۔نواب صاحب کے یہ گراں قدر خطوط بھی امتدادِ زمانہ کی نذر ہو جاتے، اگر ان کے مسودات کو محفوظ نہ کر لیا گیا ہوتا۔نواب صاحب اپنے منشی غلام رسول صاحب کو خطوط کے جوابات املا کرا دیا کرتے تھے، یہ مسودات مجلد ضخیم کتاب کی صورت میں محفوظ رہے۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی نے دو جلدوں میں مکاتیب بہادر یار جنگ کے زیرِ عنوان نواب صاحب کے خطوط شائع کئے ہیں جن کا ماخذ یہی مسودات ہیں۔[1]

یہ مکاتیب ایک ایسے زمانے کی یادگار ہیں جن میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری نتیجہ خیز اور حصولِ پاکستان کے لئے کی جانے والی جدوجہد فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو رہی تھی۔ان مکاتیب سے جہاں نواب صاحب مرحوم کی شخصی اور قومی وجاہت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان تحریکات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے سیاسی معتقدات کی نشان دہی کرتی تھیں۔

خط کی مختصر سی تختی میں اس بلا کی لطافت ہے کہ لکھنے والے کی کوئی پوشیدہ کیفیت ایسی نہیں رہتی جو اس میں جھلکتی نہ ہو۔ لکھنے والا اپنے ہاتھ سے اپنے جذبات و خیالات کا ایک آئینہ تیار کر دیتا ہے جس پر پردہ ڈالنا اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

خط اس طرح لکھنا کہ مخاطب کے استعدادِ فہم سے بالاتر نہ ہو، اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، اس کی افتادِ طبع کے مطابق ہو، اسی کے محاورے اور زبان میں راہِ سخن وا ہو اور اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اپنا پیغام مخاطب کے دل کی گہرائی تک پہنچے بغیر نہ رہے بہت دشوار کام ہے، یہ وہی کر سکتا ہے جسے خدا نے حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے الفاظ میں ''سخن'' کے لئے مخصوص کر لیا ہو''۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک ساری سیاسی، معاشی، ادبی اور ثقافتی تحریکیں رونما ہوئیں اور اپنی

---

[1] بحوالہ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی بہ عنوان ''پیش لفظ'' از مولوی صمدانی نقوی

پوری قوت کے ساتھ میدانِ عمل میں آئیں، نواب مرحوم نے اپنے مکاتیب میں غیر ارادی طور پر ایک بے لاگ مؤرخ کا بھی فرض انجام دیا ہے اور اس لحاظ سے نواب مرحوم کے مکاتیب اس دور کا اہم تاریخی ماخذ ہیں۔ (حوالہ : ''مکاتیب سے پہلے'' صفحہ۳۱ تا ۵۹ از صدانی نقوی مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

نواب صاحب کے ان خطوط میں سیاسی، معاشی، اقتصادی، مذہبی موضوعات پر مکتوب الیہم میں ملکی قائدین، علماء و مشائخین، سیاسی مفکرین اور علمی و ادبی دُنیا کی مشہور انام شخصیتوں کی علاوہ عام آدمی اور ان کے احباب کی ایک تفصیلی فہرست ملتی ہے۔

ان کے خطوط میں برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، ادبی، سیاسی جدوجہد کے نقوش اُبھر کر سامنے آتے ہیں، ان خطوط کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس دور کی جدوجہد اور اجتماعی زندگی کے خدوخال اس مکتوبی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے جو ان کے خطوط کی صورت میں بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی اور بہادر یار جنگ اکیڈمی حیدر آباد سے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ (مخفی مبادا بھی کئی سو خط ایسے ہیں جو شائع شدنی ہیں)

نواب صاحب کے خطوط نہ صرف ادب کا عظیم سرمایہ ہیں بلکہ تاریخ سیاست و تمدن کا یہ قیمتی ماخذ ہیں اور اس طرح یہ ایک اہم عہد کی تاریخ ہیں اور خود نواب صاحب کی سیرت نگاری کے سلسلے میں بھی ان کے خطوط سے سوانح نگار کو بڑی حد تک مطلوبہ مواد ——— مل جاتا ہے، ان کے خطوط کے آئینے میں ان کی سیاسی بصیرت، سیاسی جدوجہد کا ایک واضح خاکہ اور ان کی شخصیت کی مکمل تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔

اس بیان کی صداقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ :

''غالب نے خط کو مکالمہ بنا دیا تھا اور بہادر خاں نے مکاتیب کو خطابت کا جامہ پہنا دیا''۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم صفحہ۲۴ مولوی محمد احمد خاں میر مجلس بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی)

نواب صاحب کے تقاریر و مضامین کی طرح ان کے خطوط بھی تین خانوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ مذہبی، سیاسی، ادبی، خالص مذہبی قسم کے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔ سیاسی خطوط میں بھی فکر مومن کی فکر و دانش، ہر خط میں ''آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی'' کی آئینہ دار ہے۔ اپنے ایک

بے تکلف دوست خواجہ نواب کو دعوت کے جواب میں اسلام کی دعوت کے مدعا کو کس دردمندی سے بیان فرماتے ہیں :

''دُنیا کارگہ عمل ہے اس کو بھی تم نے عزلت گزینی ہی میں گذار دیا تو اللہ میاں کے سوال کا کیا جواب دوگے کہ زندگی میں کیا کر آئے، اللہ حجروں کی چار دیواری کے اندر نہیں، آفاق کے ذرہ ذرہ میں، بے کسوں کی آہ و بکا میں، بے وسیلوں کے نالہ وشیوں میں، مظلوموں کی کراہ میں، دادخواہوں کی تڑپ میں، اس کے راستے میں رسوائیوں اور ذلت میں ملے گا۔

باہر نکلو اور دیکھو کہ اشرف المخلوقات انسان، حامل بار امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان کس طرح ذلیل وخوار ہو رہا ہے، اس کی سر بلندیوں کا سامان کرو کہ یہی اصل عبادت اور یہی اصل دین ہے''۔

نواب صاحب نے ایک خط کے جواب میں حالات و واقعات کی روشنی میں مستقبل کے حیدرآباد کا جو نقشہ سپردِ قلم فرمایا تھا وہ ان کی سیاسی بصارت وبصیرت، ان کے تڑپتے ہوئے قلب اور نظر کلیمی کا مظہر ہے۔

''دل چاہتا ہے کہ جذباتِ قلب کو صفحۂ قرطاس پر نہ لاؤں۔ احتیاط گریباں گیر ہے لیکن سنئے کہے دیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ حکومت میری نہیں رہی، میں جانتا ہوں کہ اس کو اسلامی حکومت کہنا اسلام کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے مجھے اعتراف ہے کہ خاک حجاز اقبال کے الفاظ میں خشت بنیاد کلیسا بن گئی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری ساری اُمیدوں کا مرکز اور ساری آرزوؤں کا ٹھکانہ مجبور اور دوسروں کے اشارے کا محتاج ہے۔ میں اس کو بھی سمجھتا ہوں کہ بالآخر مجھ کو شکست ہوگی۔ حیدرآباد کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے جائے گی اور ہندوستان کے سمندر میں حیدرآباد بھی ایک موج کی طرح لہرائے گا۔ دوسو برس کے حاکم، ازلی اور ابدی غلام بن جائیں گے۔ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی عدم جمعیت، خلاف ورزی قوانین الٰہی، سستی عیش پسندی اور کاہلی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس تمام عذابِ الٰہی کا مستحق بنالیا ہے اور خیر اسی میں ہے کہ اگر وہ پھر سے مسلمان نہیں بن سکتے تو کفر ہی کو اپنا دوست بنالیں، خدا کے نہیں ہو سکتے تو شیطان ہی کو اپنا کرلیں۔ لیکن کیا کروں، ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود طبیعت ادھر نہیں آتی۔

اسلامی سلطنت کے تصور میں جی رہا ہوں، اسلامی سلطنت کو پیدا کروں گا یا اسی تصور میں ہمیشہ کے لئے دُنیا سے آنکھ بند کرلوں گا۔ اس کو طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ جن پر چھ سو برس سے حکومت کی ہے ان کے سامنے سر اطاعت خم کردوں کریلا ہوں اور نیم چڑھا، پٹھانوں کے محفوظ خون نے خلقت و جبلت میں آزادی بھردی تھی۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے مطالعہ نے اس کو جلا دے دی۔ یہ خیال نہ کیجئے کہ صرف مندر کے سامنے جھکنا گوارا نہیں ہے، کلیسا کے اقتدار کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ آپ بجا طور پر سوال کر سکتے ہیں کہ اقتدارِ کلیسا کے مقابلے میں کیا کر رہا ہوں۔ معاف کیجئے اس کے مینار و کلس ڈھلے ہوئے نظر آرہے ہیں، کاخ و ایوان کی اینٹوں کو جھڑتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ بنیادوں کا تزلزل محسوس کر رہا ہوں۔ واقعات یقین دلا رہے ہیں کہ باپ بیٹا روح القدس کی بجائے وہاں برہما، وشنو اور شیو کی مورتیاں کھڑی ہونے والی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں خلیج بنگال سے اُمنڈتے ہوئے طوفان کو چھوڑ کر بحیرۂ عرب کے پھٹتے ہوئے بادلوں کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ دیکھنے والی آنکھ منع کر رہی ہے اور سوچنے والا قلب روک رہا ہے۔ رائے کا اختلاف ہے۔ شائد آپ اتفاق نہ فرمائیں لیکن میرا اگر بس چلے تو شائد تھاپی لے کر اپنی زندگی کی خاطر اور مسجد کے مضبوط ہونے تک کلیسا کی دو چار اینٹوں کو مضبوط کردوں''۔ (حوالہ : مولوی غلام احمد وکیل نظام آباد ۲۴/ مئی ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۸ مکاتیب بہادر یار جنگ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

ایک اور خط جو یومِ ظفر کی یاد منانے والوں کی دعوت کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا تھا، اس خط میں بھی اس مردِ مؤمن کے نفس گرم کی تپش سے اللہ کی برہان کا تصور تازہ ہوتا ہے۔

''یومِ ظفر کا دعوت نامہ پہنچا۔ فرزندانِ تیمور اور بابر کی بیداری میرے نزدیک طلوعِ صبح ایشیاء کے برابر ہے۔ میں اس حرکت پر مبارک باد عرض کرتا ہوں اور شاہانِ مغلیہ کے عقیدت مند کی حیثیت میں یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ فرزندانِ تیمور نے جس دن شمشیر و سنان کو چھوڑا اور چنگ و رباب سے دوستی کی، وہی دن ان کی تباہی و بربادی کا تھا۔ آج آپ ظفر کی یاد منا رہے ہیں۔ ان کی ذاتی خوبیوں میں کسی کو کلام نہیں لیکن شاہانِ مغلیہ کے آخری اور شمشیر بردار نہیں، بلکہ شعر گو بادشاہ کی حیثیت میں، ان کی یاد منانے کو فرزندانِ تیمور کا اپنی شکست، اپنی ذلت، اپنی رسوائی اور اپنی بربادی کی یاد منانا سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بزمِ ادب کی شرکت سے معاف فرمائیے جس سے اندیشہ ہے

کہ کہیں بابر و تیمور کی عظمت کو میرے دل سے نہ مٹادے، اس دن کی تیاری کیجئے جس دن آپ تیمور صاحب قرانی، بابر فاتح ہندوستان شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ عالمگیر کی صحیح معنوں میں یاد منانے کے قابل ہو جائیں۔ آنکھوں سے چلتا ہوا آؤں گا اور اپنے عقیدت کے بوسوں سے آپ کے دست و پا کو رنگین کردوں گا۔ حاشا و کلا جو کچھ کہا گیا وہ آپ کی تنقیص کے لئے نہیں بلکہ قلب میں سلگتی ہوئی آگ کی چند چنگاریاں تھیں جو بے ساختہ نکل پڑیں، معاف کیجئے۔ آپ کے دُکھے ہوئے دلوں کو اور دُکھانا مقصود نہیں ہے بلکہ مردہ دلوں میں جو شراب ادب سے موت سرمدی کا سامان کر رہے ہیں حیاتِ ابدی کے لئے تڑپ پیدا کرنا مقصود ہے''۔

آپ کا مخلص اور فاتحین مغلیہ کا عقیدت مند

بہادر

(حوالہ : خط نمبر ا بنام جناب فرخ مرزا ڈسمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۶۳

مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

متذکرہ بالا خطوط کے اقتباسات میں سوز دروں، پلکوں پہ ستارے ایمان کی حرارت، سوز و ساز رومی اور فلسفہ رازی کے جلوے ملے، اب نواب صاحب کے خطوط میں نالہ نَے میں سرورے کا مزہ بھی دیکھئے۔ تمبا کو اور نَے پہنچی، مولانائے روم نے نَے کی زبان سے شکایت کروائی تھی لیکن جب سے آپ کا تمبا کو پی رہا ہوں، میرے حقہ کی نَے سے نغمہ ہائے تشکر نکل رہے ہیں، کمرہ معطر ہے، میں مسرور ہوں اور میری زبان سے پھول اور قلم سے موتی نکل رہے ہیں''۔

(حوالہ : مولوی سید تقی الدین صاحب نائب معتمدِ اُمور دستوری خط نمبر ۲۴۱ صفحہ ۲۷۲

مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

ان کے خطوط میں محبوبانہ ہمنوائی کی جھلک بھی ملتی ہے :

''آپ کی بارگاہِ محبت کا ایسا مجرم ہوں کہ خط کے ذریعہ بھی آنکھ ملاتے شرم آرہی ہے''۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول صفحہ ۷۴۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، کراچی)

اب کی دفعہ تو خط کے لفافے میں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا دل ملفوف ہے۔

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

بعض خط ایسے بھی ہیں جن میں الفاظ کی رنگینی سے مضمون میں رنگ بھر جاتا ہے اور ایسے خطوط لفظی بازیگری سے نہیں رعایتِ لفظی سے معنویت کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

''شربتِ بہار کے دو شیشے پہنچے، اللہ آپ کے گلشن حیات کو ہمیشہ پر بہار رکھے اور آپ کے دوستوں کی مشامِ جاں ہمیشہ شربتِ بہار کی خوشبو سے معطر رہے۔ میں جب کبھی شربتِ بہار پیتا ہوں دل کی کلی پھول بن جاتی ہے اور ان سے آپ کے اخلاص کی خوشبو آنے لگتی ہے۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء

(مکاتیب بہادر یار جنگ جلد دوم خط نمبر ۱۷۹ نواب حکیم فخر الدین خاں ۲۱/ مئی ۱۹۴۲ء)

آم پہنچے۔ گو ان کی شیرینی آپ کی یاد کی مٹھاس سے کم اور ان کا مزہ آپ کے لطفِ صحبت کے مقابلے میں ہیچ تھا جس کی مدتوں سے تمنا ہے۔ (حوالہ : صفحہ ۳۰۸ خط نمبر ۲۸۲ امین الدین خاں مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

ان کے خطوط میں کوئی بات زیرلب بھی آجاتی تو بامِ یار کے جلوؤں کا سما بندھ جاتا ہے، الفاظ کانوں میں رس گھولتے ہیں، مخاطب ان کے خلوص کی شہد آگئیں سانسوں کا مزہ لیتا اور الفاظ کے پھول اس کی مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں۔

ان کے خطوط میں ان کی ادیبانہ شان کے ساتھ ساتھ خطیبانہ اندازِ تخاطب کی جھلک بھی ان کے خطوط کے مزے کو دو آتشہ بنا دیتی ہے، ان کا ہر خط نئے لہجے اور نئے اسلوب کا حامل ہوتا تب ہی تو ہر خط زبانِ حال سے یہی کہتا ہے ۔

ہمارا جو کوئی مکتوب ہوگا
نیا لہجہ نیا اسلوب ہوگا

◆◆◆

خوش مذاقی

ظرافت، خوش بیانی کا دوسرا نام ہے۔ زبان پر قدرت ہو اور مزاج میں شگفتگی اور طبع رواں تو یہ لطف سخن کا عنوان بن جاتی ہے۔

ظرافت کا مدعا، انبساطِ خاطر احباب بھی ہے اور صنفِ ادب کا باب بھی۔ نواب صاحب کی فصاحت آمیز ظرافت کی جھلکیاں اگر چہ ان کی تقریر و تحریر میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں لیکن نجی محفلوں میں ان کی خوش مذاقی سے محفلیں زعفراں زار اور احباب کی محفلیں باغ و بہار بن جاتی تھیں۔

ظرافت دراصل ایک نفسی انبساط ہے جو ہمارے ذہنی اور تخیلی عناصر کو دعوتِ مسرت دیتی ہے۔ یہ انبساط کی لہر دل سے اُٹھتی ہے اور دل و دماغ سے پیامِ مسرت کی یہ سوغات، دیباچہ قلب کا عنوان بن جاتی ہے، چہرہ کھل اُٹھتا ہے اور مزاج میں فرحت و تازگی کے آثار ہویدا ہو جاتے ہیں۔

Thackeray (تھیکرے) کی نظر میں خوش مذاقی، ظرافت اور محبت کے مجموعہ کا نام ہے ــــــــ تھیکرے نے خوش مذاق انسان کی جو تصویر بنائی ہے وہ بڑی دلچسپ اور مکمل ہے، وہ کہتا ہے ''خوش مذاق شخص کا دل انسانی ہمدردی اور کائناتِ عالم کی محبت سے لبریز ہوتا ہے، اس مختصر تمہید کے ساتھ اب بیسویں صدی کے عظیم انسان محمد بہادر خاں، جن کی زندگی اگر چہ سیاست کی پر خار وادیوں میں گذری، مگر ان کی بذلہ سنجی و خوش مذاقی کے واقعات باب لطفِ سخن و خوش مذاقی کے حسن کا حسین عکس جمیل ہیں۔

میں اور میرا خدا

بلادِ اسلامیہ کے دورے میں ایران میں کرایہ کی موٹر درکار تھی، موٹر ڈرائیور نے پوچھا کہ کتنے آدمی ہو۔ نواب صاحب نے (جو واحد تھے) فرمایا ہم دو ہیں۔ ڈرائیور نے کہا فی کس اتنے لوں گا، نواب صاحب کو مذاق سوجھا فرمایا کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن چلیں گے دونوں، اس نے کہا میں تو نہ لے جاؤں گا۔ نواب صاحب نے فرمایا، میں ضرور جاؤں گا اور صرف اپنا ہی کرایہ دوں گا۔

اس تیز مزاج ایرانی کو بہت غصہ آیا تب نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ میں اور میرا اللہ ہم دو ہیں، ڈرائیور یہ سن کر فوراً ہنس پڑا۔ نواب صاحب نے فرمایا، تم نے مجھے تنہا دیکھا پھر بھی تم نے پوچھا آپ کتنے آدمی ہیں، میرے ساتھ کون شخص تھا جو تم نے پوچھا آپ کتنے ہیں، وہ راستہ بھر نواب صاحب کی خوش مذاقی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

قرآن مجید کا ترجمہ

نواب صاحب جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ کے پاس مدعو تھے، شیخ الجامعہ نے دورانِ گفتگو طنزاً فرمایا کہ سنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں۔ نواب صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ''ترجمہ نہیں ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اس میں کیا قباحت ہے'' شیخ الجامعہ نے ہنستے ہنستے فرمایا کہ ''آپ نے بچالیا''۔

میں اور میرا لباس

بلادِ اسلامیہ کی سیر کے سلسلے میں ساحل اٹلی سے گذر رہے تھے۔ مرحوم کے ایک اٹالین دوست (جن سے جہاز کی دوستی تھی) بھی ساتھ سفر کر رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ شام ہوتے ہی یہ شخص (نواب صاحب) صرف شیروانی اُتارتا ہے اور سو جاتا ہے، صبح اُٹھتا ہے تو پھر ان ہی کپڑوں پر شیروانی پہن لیتا ہے۔ اس بے چارے سے رہا نہ گیا کہنے لگا، ہندوستانی واقعی بہت (Backward) ہیں، ان کو لباس کا استعمال تک معلوم نہیں اور نہ ان کا لباس موزوں ہوتا ہے، نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''اچھا تم ہی بتاؤ کہ اچھے لباس کے لئے کیا شرائط ضروری ہیں'' اس سوال پر وہ سٹپٹایا اور کہنے لگا، آپ ہی فرمائیے۔ نواب صاحب نے فرمایا لباس ایسا ہو ۱) جو موسمی اثرات سے محفوظ رکھے ۲) اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سہولت رہے ۳) ساتھ ہی بھدا نہ ہو بلکہ خوش وضع ہو، اس لحاظ سے دیکھو تو میری شیروانی جو گلے سے گھٹنوں کے نیچے تک ہے موسمی اثرات سے پورا پورا تحفظ کرتی ہے۔ میرا پاجامہ میرے اُٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مزاحم نہیں ہوتا اور میرا لباس خوش وضع بھی ہے۔ البتہ اس میں ایک نقص ہے جو تمہارے لباس میں نہیں ہے وہ یہ کہ اس لباس میں انسانی جسم کی فطری تراش خراش ظاہر نہیں ہوتی۔ (بحوالہ قائدِ ملت از مولوی غلام محمد مرحوم)

جانب راست

اب نواب صاحب کے قلم کی زبانی ایک لطیفہ سنئے :

اعلیٰ حضرت نادر شاہ، وزراء سلطنت وغیرہ کے ہمراہ فوجی سپاہیوں کے جمناسٹک کے کرتب ملاحظہ فرمار ہے تھے، دورانِ مظاہرہ جب رسی کشی شروع ہوئی، اعلیٰ حضرت نے مجھ سے استفسار فرمایا کہ کونسی جماعت جیتے گی میں نے جانب راست کی پارٹی کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا، تمام مصاحبین سے استفسار کے بعد فرمایا، نواب صاحب بجانب راست نیست، میں نے کہا ''راستی موجب رضائے خداست'' فرمانے لگے ''کیا کھیل کود میں بھی'' میں نے کہا ''ہاں''۔

سوئے اتفاق سے بائیں طرف کی جماعت جیت گئی، اعلیٰ حضرت نے میری طرف مسکرا کر دیکھا، میں نے کہا، اعلیٰ حضرت یہ خلافِ توقع نہیں ہے کیوں کہ آج کل معاملہ میں راستی مخالف سمت میں حرکت کر رہی ہے، حاضرین اور اعلیٰ حضرت میرا یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے۔

(حوالہ : صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲ سفر نامہ بلادِ اسلامیہ مرتبہ نذیر الدین احمد)

اینٹ سے اینٹ بجادی

۱۲/ اگست ۱۹۳۱ء کو (دورانِ سفر بلادِ اسلامیہ) نواب صاحب سامرہ قدیم کے آثار دیکھنے تشریف لے گئے، بیت الخلفہ المتعصم باللہ دیکھ رہے تھے (بیت الخلفہ دجلہ کے کنارے واقع ہے) یہ عمارت دور دور تک گری ہوئی بصورت کھنڈر ہے، مزدوران کی اینٹیں نکال کر بیچتے ہیں، ایک بوڑھا مزدور اسی کام میں مصروف تھا، نواب صاحب نے اس سے مخاطب ہو کر طنز سے فرمایا، خلیفہ کے محل کی تو نے اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑا۔ (منقول سفر نامہ بلادِ اسلامیہ مرتبہ نذیر الدین احمد)

دال ہضم کر ڈالی

ان کی بذلہ سنجی کا ایک اور واقعہ سن لیجئے، ایک دن ان ہی کی ڈیوڑھی میں حسبِ معمول درسِ اقبال ہو رہا تھا، ایک جگہ ایک لفظ ''د'' کے بغیر چھپ گیا تھا اور وہ لفظ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مختلف اصحاب نے اس لفظ کو سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر قائدِ ملت نے کتاب ہاتھ میں لی۔ ایک دو منٹ غور سے اس لفظ کو دیکھتے رہے، اس کے بعد ہنس کر کہنے لگے کہ یہاں ''د'' کا حرف ہونا چاہئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کے گھر اس روز دال پکی نہ تھی، اس لئے اس نے بھوک کے

مارے دال ہضم کرڈالی، یہ سن کر حاضرین کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

(حوالہ : ہمارا قائد   از مولوی محمد احمد خاں صاحب مرحوم   صفحہ ۱۵۸)

مولانا کی دال خوری

اتحادالمسلمین کے ایک مشہور لیڈر جو مولانا تھے، نواب صاحب کو خط لکھا جس میں اتحادالمسلمین کی بجائے اتحاالمسلمین لکھا، درمیان سے دال غائب تھا۔نواب صاحب نے جواباً استفسار فرمایا کہ ''مولانا یہ دال خوری آپ نے کب سے شروع کردی''۔

برق کی زندگی

آغا محشر حشری نے بمبئی سے برق ہفتہ وار جاری کیا اور برق کی زندگی کے لئے امداد چاہی۔ نواب صاحب نے سالانہ خریدی قبول فرمالی اور جواب میں لکھا ''خرمن دل منتظر ہے'' برق بھیج دیجئے آپ نے برق کی زندگی کے لئے مجھ سے امداد چاہی ہے، جس کو قدرت نے حیاتِ طویل نہ بخشی ہو اس کی زندگی کا ساماں میں بے چارہ کیا کرسکتا ہوں۔

(بحوالہ خط نمبر ۷۹   صفحہ ۱۳۳   مکاتیب بہادر یار جنگ   جلد اول   شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈیمی، کراچی)

خلیفہ پروفیسر ہوجاتے ہیں

پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ نواب صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے، بے تکلفی کے باعث دونوں میں اکثر فقر بازی ہوا کرتی تھی۔ایک دن پروفیسر صاحب نے نواب صاحب کی قوتِ خطابت پر لطیف سی چوٹ کی کہ :

نواب صاحب ''چھوٹے کی زبان بڑی چلتی ہے'' نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''جی ہاں'' تب ہی تو خلیفہ پروفیسر ہوجاتے ہیں۔[1]

ہڈی ٹوٹ نہیں سکتی

جناب نصیرالدین ہاشمی مرحوم دکن کی تاریخ اور ادب کے مستند عالم تھے، ملنسار اور منکسرالمزاج، کئی کتابوں کے مصنف، کسی دبلے آدمی کے تصور کا آخری خاکہ جو آپ کے ذہن میں آئے۔بس اتنے ہی دبلے، نواب صاحب بڑے جسیم آدمی تھے۔نواب صاحب کے سامنے سمجھئے وہ اعشاریہ کے

---

[1] یو-پی، دہلی، لکھنؤ میں مسلمان حجام (اصلاح ساز) خلیفہ کہلاتے ہیں۔حوالہ وغیرہ وغیرہ اخبار جنگ ابراہیم جلیس

مانند تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ واقعہ اور بھی لطف دے گا، خود نصیر الدین صاحب ہاشمی کی زبانی اس واقعہ کو سنئے :

جب کبھی جہاں کہیں یعنی اکثر مجالس، میلاد یا کسی دعوت کی تقریب یا عیدین کی نماز وغیرہ میں ملاقات ہوتی رہی اور بہادر خاں نہایت خلوص اور پر تپاک طریقہ پر ملتے تھے، خصوصاً عید کی ملاقات میں گلے ملتے ہوئے فرماتے تھے کہ "مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں آپ کی ہڈیاں نہ ٹوٹ جائیں میں غالباً (گھبرا کر) جواب دیا کرتا کہ خلوص کی ملاقات میں ہڈی ٹوٹ نہیں سکتی"۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں صفحہ ۳۲۰ مطبوعہ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

قاضی

سماجی اور عوامی زندگی میں خاطر احباب بھی کوئی چیز ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی برائے خاطر احباب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک نوجوان ملازمت کا متلاشی جس کو یہ معلوم ہوا کہ آبکاری میں کوئی ملازمت تقرر طلب ہے، نواب صاحب کی وساطت سے ناظم آبکاری تک رسائی کا راستہ ہموار کیا۔ اس وقت کے ناظم آبکاری ایک خاندانی قاضی تھے، جن کا نام قاضی زین العابدین تھا۔ قاضی کے لفظ کی رعایت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے نواب صاحب نے سفارشی خط لکھا :

"آبکاری میں مسلمان کو بھیجنا مجھے خود پسند نہیں ہے لیکن جب ایک قاضی نظامت پر ہو تو مسلمان کی شرکت جائز ہو جاتی ہے"۔

(حوالہ : مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی خط نمبر ۴۷۵ صفحہ ۴۸۸)

پیٹ پرورش

نواب صاحب کی فقرہ بازی کی زد سے ان کی بیگم صاحبہ تک محفوظ نہیں رہیں۔ نواب صاحب اپنی بیگم صاحبہ کا یہ واقعہ اکثر دوستوں کو سناتے تھے ——— اور خود بھی لطف اُٹھاتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب دولت خان نے ایک دن اپنی بھاوج (بیگم بہادر یار جنگ) سے کہا کہ "بھائی سے کہہ کر مجھے کسی پیڈ پروبیشنری (Paid Prabationerny)

کی جائیداد پر مامور کرادیجئے۔ بیگم صاحبہ نے پیڈ پروبیشنری کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے نواب صاحب سے کہا'' آپ دولت خاں کی پیٹ پرورش کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے ؟ نواب صاحب ہنستے ہوئے فرماتے تھے کہ پیڈ پروبیشنری کا ترجمہ پیٹ پرورش سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔(حوالہ : وغیرہ وغیرہ ازاخبار جنگ ابراہیم جلیس)

ہمت عالی

حکیم محمد یوسف نیؔر نے اپنی شادی کی اطلاع بذریعہ خط نواب صاحب کودی۔نواب صاحب پیری میں شادی پر حیران ہوئے اور محظوظ بھی۔اسی موڈ میں دعوت نامے کے جواب میں تحریر فرمایا :

'' آپ کی ہمت عالی پر رشک آتا ہے اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہم نوجوانوں کو آپ کی پیری نصیب کرے۔(حوالہ : مکاتیب بہادر یار جنگ جلداول ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی خط نمبر ۲۲۰ صفحہ ۱۶۸)

سر اکبر حیدری کو پانچ سلام

حیدرآباد میں تحریک اصلاحات پر نواب صاحب تقریر فرمارہے تھے (ان دنوں سر اکبر حیدری وزیراعظم مملکت آصفیہ حیدرآباد تھے۔ان کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور قوم دُشمنی کی کارستانیوں پر نواب صاحب بے حد برہم تھے۔اس بت خودسر کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئی) جب دورانِ تقریر سر اکبر کا ذکر آیا۔تاب ضبط کی حدیں ٹوٹ گئیں،اندرونی جذبہ بیرونی علامت کے ذریعے اظہار مدعا کا طلب گار تھا،نواب صاحب نے جھکتے ہوئے اپنے ہاتھ کو اپنے قدموں تک پہنچاتے ہوئے فرمایا،جی چاہتا ہے کہ سر اکبر حیدری کو پانچ (پیر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) پھر سیدھے ہوگئے اور فرمایا سلام کروں۔مقصود پانچ سلام نہ تھے،سامعین اس سلام کے مدعا کو سمجھ گئے اور سارا مجمع ہنس پڑا۔(حوالہ : ۹۴ ماخوذ رموز خطابت ازنذیرالدین احمد)

میرے محسن

نواب بہادر یار جنگ عمر میں مجھ سے دو سال بڑے تھے اور بہت محبت فرماتے تھے۔ایک مرتبہ سالانہ جلسہ کے سلسلے میں نواب ورنگل تشریف لائے تھے،دوپہر کے کھانے کا انتظام مولوی سید غزل حسین صاحب ایڈوکیٹ کی جانب سے تھا۔دسترخوان کے ایک سرے پر نواب صاحب اور دوسرے سرے پر میں بیٹھا تھا۔میرے قریب جو اصحاب بیٹھے تھے وہ میری باتوں پر ہنس رہے تھے۔

کھانا ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب کے یہ الفاظ ہمارے کانوں میں پڑے، آپ لوگوں کو شائد یہ معلوم نہیں کہ شکور بیگ صاحب میرے محسن ہیں۔ انھوں نے تشریف لا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے، لوگ مجھے دیکھنے لگے اور میں حیرت سے نواب صاحب کا منہ تکنے لگا کہ آخر وہ کیا احسان ہے جس سے میں بھی واقف نہیں۔

نواب صاحب نے فرمایا، بھئی بات یہ ہے کہ میری پیدائش کا سن ۱۹۰۵ء ہے اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۹۰۷ء میں شکور بیگ صاحب پیدا ہوئے۔ وہ عمر میں دو سال چھوٹے ہیں مگر ہیں میرے محسن۔

میں نے کہا نواب صاحب کی بات پھر بھی صاف نہ ہوئی۔

فرمایا، پیدا ہوئے ۱۹۰۷ء میں اور موسیٰ ندی کی طغیانی آئی ۱۹۰۸ء میں اور اسی طغیانی نے حیدرآباد میں جو تباہی مچائی، اس کی داستاں آپ لوگوں نے سنی ہوگی ——— بہرحال اگر شکور بیگ صاحب پیدا نہ ہوتے تو حیدرآباد والے کہتے کہ نصیب یاور جنگ کے یہاں ایسا منحوس بچہ پیدا ہوا کہ یہ طغیانی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب مجھے کوئی نہیں کہے گا۔ شکور بیگ صاحب نے پیدا ہو کر مجھے گالیوں سے بچالیا۔ اب نحوست ان کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ مجھے کوئی منحوس نہیں کہہ سکتا'' تو کہئے یہ میرے محسن ہوئے کہ نہیں''۔

سب ہنسنے لگے، میں نے کہا نواب صاحب میرے بعد بھی تو طغیانی تک کوئی پیدا ہوا ہوگا تو فرمایا اسے تلاش کرنا آپ کا کام ہے، میں نے تو اپنے محسن کو پالیا۔ اس پر بھی خوب ہنسی ہوئی۔

(ماخوذ مضامین شکور بیگ)

دو بچھڑوں کی لڑائی

تجویز قیام پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے گاندھی جی نے پرارتھنا سبھا میں کہا تھا ''ہندوستان کے دو ٹکڑے کردینا، گاؤ ماتا کے دو ٹکڑے کردینا ہے'' اور ہندو مہاسبھا اور آریہ سماجی لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں اور بیانات میں کہا کہ ''ہندوستان گائے ہے جس کو مسلم لیگی کاٹنا اور باٹنا چاہتے ہیں''۔

نواب صاحب نے اس اشتعال انگیز خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا :

اگر ہندوستان ایک گائے ہے تو اس گائے نے دو بچھڑے دیئے ہیں اور ان میں تصادم اور ٹکر ہونے لگا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان بچھڑوں کو لڑنے سے روکنے کے لئے ان کے تھان بدل دیئے جائیں۔ اس بچھڑے کو اس تھان (ہندوستان) میں اور دوسرے کو اس تھان (پاکستان) میں رکھا جائے۔ (ماخوذ ملت کا درخشاں ستارہ از سید شرف الدین پیرزادہ ۲۷/جون ۱۹۶۴ء حریت کراچی)

گاندھی جی کے دو سیب

مولوی بہادر خان مرحوم، گاندھی جی سے ملنے سیوا گرام گئے۔ گاندھی جی نے کہا میں نے سنا ہے کہ تم مولانا آزاد سے بھی اچھی تقریر کرتے ہو۔ مجھے تم سے ملنے کی خواہش بہت تھی۔ اس وقت گاندھی جی کے درشن کے لئے لوگ آ رہے تھے۔ چرن چھوتے، پھول رکھتے اور چلے جاتے۔ ایک معتقد نے بجائے پھول کے دو نفیس کشمیری سیب گاندھی جی کی خدمت میں پیش کئے۔ گاندھی جی نے اس کو قبول کرلیا۔ گاندھی جی ایک سیب بہادر خاں مرحوم کو دینا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر مرحوم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ایک ساتھ جوڑ کر کھول دیں تاکہ سیب لیں۔ ان کشادہ اور شفاف ہتھیلیوں کو دیکھ کر گاندھی جی نے دونوں سیب یہ کہہ کر رکھ دیئے کہ میں آپ کو ایک ہی سیب دینا چاہتا ہوں مگر اتنی بڑی ہتھیلیوں کو دیکھ کر دونوں سیب دینے ——— طبیعت چاہتی ہے۔

بہادر خاں مسکراتے ہوئے کہنے لگے اب جب کہ آپ نے کشادہ دلی کے ساتھ ہمیں یہ عطیہ دیا تو ہم نہیں چاہتے کہ سب کچھ لے لیں۔ اس لئے آیئے ہم تقسیم کریں۔ یہ کہہ کر ایک سیب گاندھی جی کو دے دیا، پاکستان کی طرف لطیف اشارہ محسوس کر کے گاندھی جی کچھ دیر تک مسکراتے رہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سے قبل گاندھی جی کو اتنا مسرور نہیں دیکھا تھا۔

(حوالہ: چند سیاسی لطیفے ازعزیز الرحمٰن صفحہ ۲۲۰ جلد ۲۰ شمارہ ۲،۱ 'مجلّہ عثمانیہ' عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

بہادر یار جنگ کو بہادر یار جنگ کس نے بنایا؟

ریاست حیدرآباد دکن کے ایک جاگیردار راجہ پرتاب گیر جی کی کوٹھی میں کوئی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں نواب صاحب بھی مدعو تھے۔ اس تقریب میں نواب صاحب کی آمد سے قبل حاضرین کا موضوع بہادر یار جنگ ہی تھے۔ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کے ایک سرگرم رکن ابوالبیان خواجہ بہاؤ الدین حاضرین سے کہہ رہے تھے" پہلے یہ دیکھئے کہ بہادر یار جنگ کو بہادر یار

جنگ کس نے بنایا۔ اگر میں بہادر یار جنگ کو متعارف نہ کرواتا تو آج بہادر یار جنگ کو کون جانتا''
بہاؤ الدین صاحب کا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ نواب صاحب رونق افروز ہوئے۔ ایک نے نواب صاحب کو سلام اور مصافحہ کے درمیان مخاطب کر کے بہاؤ الدین صاحب کا جملہ دہرادیا اور پوچھا ''نواب صاحب'' کیا یہ سچ ہے کہ بہادر یار جنگ کو ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین نے بنایا ہے۔

نواب صاحب بہت ہنسے اور فرمایا ابوالبیان خواجہ بہاؤالدین صاحب نے مجھے بنایا ہو یا نہ بنایا ہو، البتہ انھوں نے آپ سبھوں کو بنایا ہے۔ یہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے اور خود خواجہ بہاؤ الدین صاحب بھی اس پر لطف لطیفے کا مزہ لے کر ہنسنے والوں میں شامل تھے۔

سپاہی کا وار

نواب رحمت یار جنگ کوتوال بلدہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کی حاضری سے فارغ ہو کر دفتر کوتوالی بلدہ آ رہے تھے، جب ان کی موٹر عابد کے چوراستہ پر پہنچی تو کسی عرب سپاہی نے جس کو ان سے کچھ شکایت تھی ان پر گولی چلادی، مگر حسن اتفاق سے وہ بچ گئے، گولی موٹر کی باڈی کو چاٹ کر گذر گئی۔

حسبِ روایت کئی حضرات نے نواب رحمت یار جنگ کے بنگلہ پر پہنچ کر اس حادثہ سے سلامتی پر انھیں مبارک باد دی۔ قائدِ ملت کی عادت نہ تھی کہ وہ کسی امیر یا عہدہ دار کے بنگلہ پر تشریف لے جاتے۔ حادثہ کے چند روز بعد کسی دعوت میں رحمت یار جنگ سے ملاقات ہوئی تو ان کو مبارک باد دی۔ مگر فرمایا کہ نواب صاحب ایک خلش رہ گئی۔

رحمت یار جنگ نے حیرت سے دریافت کیا، وہ کیا ہے؟ تو قائدِ ملت نے فرمایا کہ :

''ایک سپاہی کا وار خالی گیا''۔

تبصرہ اتنا پر لطف تھا کہ رحمت یار جنگ بھی اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

(حوالہ : مکتوب شگاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید، سعید صدیقی)

آہ ——————— ؎

نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطفِ سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

فضائل نفس

''فضائل نفس'' وہ نعمت ہے جو خدا کے ان برگزیدہ بندوں کو عطا ہوتی ہے جو قرآن کی زبان میں صالحین کہلاتے ہیں اور ارشاد فرمایا دو جہاں کے سردار آقائے نامدار صلعم نے :

اللہ کی رحمت صالحین کے ذکر کے وقت نازل ہوتی ہے۔

فقیری و درویشی، سادگی، جود و سخا، اہلیت کی شان از مہد تا لحد، ان کی زندگی کا جزء لاینفک رہی ——— اور ان کی یہ قلندری سکندری سے کم نہیں تھی۔

۱) ایک عمر رسیدہ بزرگ جو حج کے لئے تشریف لے جانا چاہتے تھے، نواب صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے (اس وقت نواب صاحب کی عمر ۲۰، ۲۱ سال کی تھی) اور فرمایا ''میرے پاس صرف چار سو روپئے ہیں اور میں حج کو جانا چاہتا ہوں۔ رقم جمع کرانے کا آج آخری دن ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا آپ تشریف رکھیں، میں ابھی حاضر ہوا۔ کچھ ہی دیر میں نواب صاحب شخص مذکور کی مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوئے۔ مطلوبہ رقم کے طالب نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ نواب صاحب نے اشک بار آنکھوں اور تھرائی ہوئی آواز میں بڑی لجاجت سے فرمایا :

میری یہ مجال و طاقت نہیں کہ میرے ہاتھ کسی مسلمان بھائی کے ہاتھ سے اُونچے ہوں۔ اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر دیئے۔ شخص مذکور کے رخصت ہو جانے کے بعد نواب صاحب اس درجہ متاثر رہے کہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہم احباب بھی ڈیوڑھی سے رخصت ہو گئے۔

(بحوالہ : انٹرویو نواب صاحب کے بچپن کے دوست مولوی بہادر خاں صاحب سرخیل زلی مرحوم حیدرآبادی)

مندرجہ بالا واقعہ کے ساتھ ہی حضرت ابوسہل سعلوکؒ کے بارے میں حضرت شیخ علی ہجویری کی روایت یاد آتی ہے۔

حضرت ابوسہل سعلوکؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ صدقہ و خیرات کبھی کسی محتاج کے ہاتھ پر نہ رکھتے بلکہ زمین پر رکھ دیتے کہ محتاج خود اسے اُٹھالیں۔ مریدوں نے آپ سے اس کا سبب

دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا ہاتھ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اُونچا اور اس کے اُوپر ہو اور نہ درہم و دینار کو میں ایسی باعظمت شئی سمجھتا ہوں کہ کسی مسلمان کا ہاتھ ان کے نیچے ہو۔

(حوالہ : کشف المحجوب از حضرت شیخ علی ہجویری مترجم میاں طفیل احمد صفحہ ۳۲۱)

۲) زبان بندی کے زمانہ میں مصطفیٰ بازار کے عظیم الشان جلسہ میں نواب صاحب نے تقریر فرمائی، حیدری حکومت نے جواب طلب کیا کہ حکم کی خلاف ورزی کیوں کی گئی۔ اس کا جواب مرتب کرنے کے لئے تنہائی کی ضرورت تھی مجھے ساتھ لے کر عنبر پیٹ کے بنگلہ پر پہنچے۔ (اور وہاں جواب مرتب کیا گیا کہ تقریر کی نوعیت سیاسی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی، پابندی صرف سیاسی سرگرمیوں پر ہے۔ مذہبی تقاریر اس حکم کے دائرہ اثر سے خارج ہے)

عنبر پیٹ کے اس واقعہ کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب اپنی جیب میں عادتاً پیسہ نہیں رکھتے وہ ہمیشہ ان کے ملازم خاص سید حسین کے پاس ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ (سید حسین) ساتھ نہ تھے۔ جب باورچی نے آ کر کھانا تیار کرنے کے لئے پیسے مانگے تو نواب صاحب کی جیب خالی تھی۔ مجھ سے پوچھا کہ جیب میں کچھ ہے۔ میرے پاس اس وقت صرف چار روپئے تھے بس اسی سے کام چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے میں سید حسین ہانپتے کانپتے سیکل پر عنبر پیٹ آ گئے اور کھانا تیار ہوا۔ قائدِ ملت کی زندگی کا ہر ایک پہلو سبق آموز ہے۔ (حوالہ : مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

۳) نواب صاحب کے آوردہ میں ایک خاں صاحب تھے۔ ۹ بجے سے کچھ پہلے آئے، صورت اُتری ہوئی تھی، حال بے حال تھا۔ ان کی ڈیوٹی ڈیوڑھی میں ہر گھنٹے پر گھنٹہ بجانا تھا۔ نواب صاحب نے مزاج پرسی فرمائی، فوراً بیٹھ جانے کو کہا، اسی دوران ۹ بجے نواب صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے گھنٹہ بجایا۔ انھیں اُٹھنے نہ دیا۔ سواری کا انتظام کر کے انھیں رخصت کیا اور تاکید فرمائی کہ مکمل صحت یابی تک وہ آرام لیں۔ (بحوالہ : مولوی بہادر خاں صاحب سرخیل زلی مرحوم)

۴) اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اصلاحات کی مہم کا زمانہ تھا اور میں ابھی کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ نواب صاحب سے میرے گہرے مراسم کی ابھی ابتداء ہی ہوئی تھی۔ ایک روز ایک صاحب کے ذریعہ نواب صاحب نے بلا بھیجا، میں وقتِ مقررہ کے کچھ دیر بعد پہنچا۔ ورانڈے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور نواب صاحب ان سے مصروف گفتگو۔ ابھی میں ورانڈے میں قدم ہی رکھا تھا کہ نواب

صاحب معاً اُٹھے۔ اندر ڈرائنگ روم میں گئے۔ ایک کرسی اُٹھائی۔ لاکر میرے قریب رکھ دی اور بیٹھنے کی فرمائش کی، میں اپنے دل میں شرمندہ ہوا۔ ان کی عظمت کا یہ پہلا نقش تھا جو میرے دل پر آج تک باقی ہے۔

۵) ایک اور دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوں۔ کمرہ میں بعض بڑے عہدہ دار ہیں۔ اتنے میں میلے کپڑے پہنے ایک چھوٹی لڑکی کھیلتے کھیلتے وہاں آ گئی۔ دیکھتے ہی فوراً اُٹھے، چمکار کر اپنے گود میں بٹھا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگے اور اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر جھلانے لگے اور تتلی زبان میں بچی سے کہتے جاتے تھے :

میں چھید[۱] کی بیتی[۲] امو ہوں　　چھرکار[۳] کی لاج[۴] دُلاری ہوں
بیدم[۵] کے دل تی[۶] پیاری ہوں　　میں چھوٹی امو ہوں

میں حیران سوچ رہا تھا کہ لڑکی کون ہے۔ بعد میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ قائدِ ملت کے ملازم سید حسین کی لڑکی ہے۔ (حوالہ : ہمارا قائد از مولوی محمد احمد خاں صاحب صفحہ ۱۶۰، ۱۶۱)

سچ ہے۔

نہیں ہے منہ کا نوالہ کچھ آدمی بننا
بہت صفات ہیں درکار آدمی کے لئے

۶) اسی طرح ایک اور واقعہ پیش آیا جب کہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف اپنی بعض مخالف لیگی مصروفیات کے باعث قائد اعظم کے مورد عتاب ہوئے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر لطیف کو ناگپور میں مسلم لیگ کی طلب کی ہوئی پاکستانی کانفرنس کا خطبہ صدارت پڑھنا تھا، قائد اعظم کی ناراضگی کا ناگپور والوں کو علم ہوا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت اور پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دی، غالباً یہ معاملات اس وقت طے پائے تھے جب قائدِ ملت بہادر خاں قائد اعظم سے ملاقات کر کے حیدر آباد سے واپس ہوتے ہوئے ناگپور ٹھہرے تھے۔ ڈاکٹر لطیف کو اس کا علم تھا۔ واپسی کے فوراً بعد ہی ملاقات میں نواب صاحب نے مجھے پس منظر سے آگاہ کر دیا تھا۔ دوسرے دن اور ینٹ پریس میں ڈاکٹر لطیف پہنچے اور انھوں نے وہ بیان دیا، جس میں قائد اعظم کی روش اور بہادر خاں کے کردار پر بھی

---
۱ سید　۲ بیٹی　۳ سرکار　۴ راج　۵ بیگم　۶ کی

کچھ چھینٹے ڈالے تھے، یہی وہ بیان تھا جس سے ڈاکٹر لطیف کے زوال کا آغاز ہوا۔ میں تمام حالات سے واقف تھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے کہنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کی روانگی کے بعد میں نے نواب صاحب کو بیان پڑھ کر سنایا۔ میں اپنی دانست میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے سنسر ——— کرانے کی کوشش کریں گے لیکن فراخدلی اور صحافتی آداب ملاحظہ فرمائیں کہ نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ من و عن مقامی پریس کو بھی دیں اور باہر بھی ضرور بھیجیں۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ میری نظر میں از سلطان احمد صفحہ ۶۲، ۶۳ مشاہیر وطن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد)

۷) نواب صاحب کا ایک ملازم تھا جو جاگیر کے عملے سے متعلق تھا۔ ڈیوڑھی میں ان کی نوکری تھی ملازمین کی تنخواہ کا دن تھا۔ کمند داں مصدی تنخواہ تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔ اس دوران نواب صاحب نے سنا، زور زور سے بحث و تکرار کی آوازیں آرہی ہیں۔ نواب صاحب اس جانب تشریف لے گئے۔ مصدی سے ملازم کی وجہ تکرار دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ شخص مذکور کی غیر حاضری کی تنخواہ کا بھی وہ طالب ہے اور تنخواہ کے علاوہ مزید رقم چاہتا ہے۔ نواب صاحب نے ملازم مذکور سے غیر حاضری اور مزید رقم کی ضرورت کے بارے میں استفسار فرمایا۔ ملازم مذکور نے کہا سرکار بچی ہوئی ہے۔ بیوی بیمار ہے اور مجھے چھ بچیاں ہیں۔ غیر حاضری کی تنخواہ، ایک ماہ کی زائد تنخواہ کا مصدی کو حکم دیا اور اپنی جیب سے مزید ایک سو روپے دیئے۔ حاجت مند دُعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

۸) (مولوی محمد عمر مہاجر مرحوم ایک جادو بیان خطیب تھے۔ غالبؔ کے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ ان کا شاہکار ہے۔ زبان و بیان اور طرزِ ادا سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود غالب نے اپنے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ کیا ہو۔)

بہادر خاں میرے دوست نہیں تھے لیکن میں نے ان کے لاکھوں عقیدت گذاروں کی طرح ان کو دور سے اور قریب سے دونوں طرح سے دیکھا ہے، دور سے دیکھنے والے ان کو عظیم انسان سمجھتے تھے۔ قریب سے دیکھنے والے ان کو عظیم تر جانتے تھے۔ یہ بڑائی ہر شخص کو نہیں ملتی۔ یہ صرف اسی کا حصہ ہوتی ہے جو محبوبِ خلق ہوتا ہے اور اسی وسیلے سے خدا کا محبوب بھی ہوتا ہے۔

میں حیدرآباد کے ایک کالج کے تقریری مقابلے میں اپنے کالج کی نمائندگی کر رہا تھا، دورانِ تقریر میں نے سامنے کی صف میں ایک باوقار، وجیہہ اور شاندار شخص کو دیکھا، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ

اس کی مسکراتی آنکھیں اور اس کا دلنواز انداز مجھے تقریر کی داد دے رہا ہے۔ مقرر اور سامع میں یہ ربط پنہاں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے مگر جب ایک بار یہ ربط قائم ہو جاتا ہے تو جنم جنم کے فاصلے اور بیگانگی سب مٹ جاتے ہیں۔ تقریر ختم ہونے کے بعد جب میں اپنی نشست پر واپس ہوا تو وہ نگاہیں پھر ایک مرتبہ مجھے داد دیتی محسوس ہوئیں، میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ ''یہ نواب بہادر خاں ہیں جو ابھی بلادِ اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آئے ہیں''۔

میں دیر تک انھیں دیکھتا رہا، اس لئے نہیں کہ خواجہ حسن نظامی اور دوسرے مشاہیر کی رائیں میں نے پڑھی تھیں۔ بلکہ میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے انسان کو دیکھا تھا جس سے براہِ راست رسمی تعارف کے بغیر بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ روح اس سے برسوں سے آشنا ہے۔ جلسہ کے اختتام پر سب لوگ ان سے مصافحہ کرنے لگے، میں بھی بڑھا مگر مصافحہ نہ ہو سکا۔ بہادر خاں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے گھر پر ملوں۔

اس واقعہ کے چند دن بعد شہر حیدر آباد میں میلاد النبیؐ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہیں میری دوسری بار ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھ سے کہنے لگے'' آپ میرے گھر تشریف نہیں لائے''۔

اور تاکید کی کہ دوسرے دن تین بجے ان سے گھر پر ملوں۔ دوسرے دن بیت الامت پہنچا (جو ان دنوں مہدوی منزل کہلاتا تھا) اور بہت سے ملاقات کے آرزو مند کمرۂ ملاقات میں بیٹھے تھے۔ میں نے بھی اپنا کارڈ بھیج دیا، کوئی دس منٹ انتظار کیا اور اُٹھ کر چلا آیا۔

ہمارے محلّہ میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ میری اکثر شامیں احباب کے ساتھ وہیں گذرتی تھیں، اس واقعہ کے کوئی تین چار دن بعد شام کے وقت اسی چائے خانے میں ہم سب جمع تھے۔ علی اختر مرحوم اور جوش ملیح آبادی کی شاعری زیر بحث تھی۔ ایک صاحب جھوم جھوم کر جوش صاحب کے رندانہ اشعار پڑھ رہے تھے اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے :

''رندی اور سرمستی کی ان ہی روایات نے ہماری شاعری کو ڈبو دیا ہے''۔

اچانک چائے خانے میں کچھ ہل چل سی محسوس ہوئی۔ چائے خانے کے مالک خوشی سے ہانپتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے۔ ''یہاں بیٹھے ہیں''

ہماری نظر اُدھر اُٹھی ان کے ساتھ بہادر خاں کھڑے تھے۔ وہی متبسم چہرہ، وہی دل نواز نظریں لیکن اس دفعہ نظروں میں معذرت کی ایک جھلک بھی تھی، مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے :

''آپ آئے اور چلے گئے۔ میں اس وقت حمام میں تھا، اب اس کی تلافی کے لئے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں''۔

میری اور ان کی نسبت آفتاب اور ذرے کی بھی نہیں تھی، میں اس خلوص اور وسعتِ قلب کو دیکھ کر حیران رہ گیا، یہ میری اور بہادر خاں مرحوم کی ملاقات کی ابتداء تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میری طرح سینکڑوں عقیدت کیش ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ہر شخص اپنی جگہ یہی سمجھتا تھا کہ لطفِ خاص صرف میرے لئے ہے۔

ان ملاقاتوں میں مسلمانانِ حیدر آباد، مسلمانانِ ہند اور عالم اسلام کے ملی مسائل موضوع گفتگو رہتے تھے۔ تاریخ اسلام اور فرنگی استعماریت کے موضوعات پر بہادر خاں کی گفتگو سن کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ غور و فکر کی سینکڑوں نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر ملتِ اسلامیہ حیدر آباد کی اجتماعی فکر میں مرکوز تھا۔

بڑے آدمیوں کی صحبت اکثر آدمی کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی ہے، مگر بہادر خاں کی صحبت خود اعتمادی کی دولت بخشتی تھی۔

(حوالہ : ایک شخصیت ایک مطالعہ   از مولوی محمد عمر صاحب مہاجر مرحوم   بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں

ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی   صفحہ ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷)

''عمدہ کام، صحیح ایمان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مگر جب تک عمدہ کام نہ کئے جائیں۔ صحیح ایمان قائم نہیں رہ سکتا چہ جائے کہ زیادہ ہو''۔ سرو

(مشمولہ کفایت شعاری   از سیموا سمایلز ۱۹۱۱ء   شائع کردہ کارپردازاں پیسہ اخبار)

۹) چودھری غلام عباس مرحوم صدر کشمیر مسلم کانفرنس، نواب صاحب کے فضائل نفس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر نہایت ہی مؤثر اور رُلا دینے والی

تقریر کے بعد وہ جب بیٹھے تو میں ان کے ساتھ کی کرسی پر تھا۔ میں ان کی تقریر سے بے حد متاثر اور وارفتہ ہو گیا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا۔ لیکن سادہ مزاجی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود اسے چوما اور بعد میں میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اتنی عظیم المرتبت شخصیت اور لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ اور یہ اخلاق، خدا کی دین ہے وہ جسے چاہے سرفراز کرے۔

(پیکر خلق وانکسار از چودھری غلام عباس صاحب صفحہ ۲۴۸ مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں)

۱۰) صدر اعظم حکومت نظام سر اکبر حیدری نے قائدِ ملت کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ انتہا یہ کہ نواب صاحب کو گرفتار کر کے جیل کی سزا دلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ اپنے منصوبوں میں ہزار کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے، جب یہ انتقال کر گئے تو خواجہ حسن نظامی نے نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ سر اکبر معاف کر دیں ——————

اس وسیع القلب قائد کا جواب **تلک الایام ندا ولھا بین الناس** کی تفسیر ہے۔

"**تلک الایام ندا ولھا بین الناس**" حیدری صاحب مر گئے اور ایک دن ہم سب مر جائیں گے۔ خدا ایسی زندگی عطا کرے کہ لوگ ہمارا ذکر اچھے الفاظ میں کریں۔ جو مر گیا، اس سے رنج کیا، میں نے خدا کی طرف توجہ کر کے اکبر حیدری مرحوم کو دل سے معاف کیا اور ان کی مغفرت کے لئے دُعا کی۔

(حوالہ : خط نمبر ۲۰۶ صفحہ ۲۴۶ موسومہ خواجہ حسن نظامی مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

۱۱) ایک چپراسی صاحب، بہادر خاں کے بڑے اعتماد کے کارکن تھے۔ ایک دفعہ جب وہ ملنے گئے اور کمرے میں بلائے گئے تو بے چارے ٹھٹک سے گئے کیوں کہ اس وقت ان کے ناظم صاحب مصروفِ تکلم تھے۔ بہادر خاں نے بات کو تاڑ لیا اور کہا کہ آپ چپراسی ہوں گے دفتر میں۔ میرے پاس تو سب برابر ہیں بلکہ آپ تو میرے رفیق ہیں، یہ کہہ کر ان کو اپنے بازو صوفے پر بیٹھا لیا۔

مولوی سید جلیل اللہ حسینی مضمون کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا ——————

دنگ تھے سب اہل دل اہل نظر اہل کمال

وہ تھی باطن کی تجلی وہ تھا چہرے کا جمال

◆◆◆

تعلیم، تعلیمی مسائل اور طالبِ علموں سے قائدِ ملت کی دلچسپی

قائدِ ملت نے ملت کے مسائل کے سلسلے میں چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو بھی کبھی نظرانداز نہیں فرمایا، تعلیمی مسائل اور طالبِ علموں سے تو انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس خصوص میں وہ خود فرماتے ہیں :

''تعلیم قوموں کی تعمیر میں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے اور جب تک بنیاد مضبوط نہ ہو، قوموں کی اصلاح ممکن ہی نہیں۔ ذرا تنظیم سے فارغ ہو جاؤں تو انشاء اللہ سب سے پہلے تعلیمی مہم ہی کو اپنے ہاتھ میں لوں گا''۔ (حوالہ : مکتوب ۲۳۲ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ، کراچی)

وائس پرنسپل جاگیر کالج کو اپنے ایک خط میں طالبِ علموں کے تابناک مستقبل کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

''اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ وہاں سے ملک کے ایسے سپوت پیدا ہوں جو ہمارے تاریک مستقبل کو اپنے خلوص و عمل کے نور سے جگمگا دیں''۔ (حوالہ : خط نمبر ۱۴۱ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

تعلیم کے وسیلے سے ان میں زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ان کا مطمحِ نظر تھا، ایک غریب طالبِ علم کی قاضی محمد حسین نائب امیر جامعہ کے نام سفارش کرتے ہوئے کس دردمندی کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں :

''خاکِ دکن میں ایسے کتنے جواہر ریزے ہوں گے جن کو غربت چمکنے نہیں دیتی، آپ کے دستِ شفقت کی ایک ادنیٰ حرکت ان کو متجلی کر سکتی ہے''۔

حیدرآباد سے پنجاب اور لاہور جا کر طلبہ علومِ شرقیہ کے امتحانات میں شرکت کیا کرتے تھے جو طلبہ شریکِ امتحان ہوتے تو ایک تو انھیں مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا، دوسرے دروغ بیانی کا

سہارا لے کر ایک صداقت نامہ حاصل کرنا پڑتا کہ طالبِ علم مذکور نے دہلی، پنجاب یا لاہور کے کسی ادارہ میں تعلیم حاصل کی ہے (منشی کا امتحان، حیدرآباد میں میٹرک کے مماثل حقوق کا حامل تھا) اس خصوص میں قائدِ ملت نے اس امر کی کوشش کی کہ یہ امتحانات ملک کی قدیم علومِ شرقیہ کی جامعہ، جامعہ نظامیہ میں ہوں، قائدِ ملت کی مساعی سے علومِ شرقیہ کے امتحانات جامعہ نظامیہ کے تحت حیدرآباد میں ہونے لگے (جامعہ نظامیہ فضیلت جنگ مولوی انوار اللہ خاں صاحب جیسے ذی علم، عالم دین کا قائم کردہ ہے۔ اس جامعہ کے بارے میں قائدِ ملت نے تحریر فرمایا تھا کہ جامعہ نظامیہ ملک کی قدیم درسگاہ ہے اس کے فرزندوں نے ملک کی جو خدمت کی اور اہل ملک کے لئے جو سامان بیداری مہیا کیا وہ ہم سب کے تشکر کا باعث ہے)

طالبات کے لئے علی گڑھ میٹرک کے سلسلے میں قائدِ ملت کی کوششوں سے حیدرآباد میں مرکز قائم ہوا۔ یہ امر موجب سہولت ہو گیا کہ وہ حیدرآباد ہی میں امتحان دیں۔ اس خصوص میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر علی گڑھ نے نواب صاحب کی کوششوں کو اپنے تعاون سے ثمر آور بنایا۔ اس طرح طالبات سفر کی صعوبتوں اور اخراجات بے جا سے بچ گئے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے تحت اور دینی درسگاہوں میں دی جانے والی علومِ شرقیہ کی تعلیم سے بھی نواب صاحب کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، وہ چاہتے تھے کہ طلبہ و طالبات علومِ شرقیہ کے دریائے علم سے سیراب ہو کر چمن اسلام کی سرسبزی کا باعث بنیں اور اخلاص و صداقت کے ساتھ قوم کی خدمت کریں۔ علومِ شرقیہ کے امتحانات کے سلسلے میں مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی کے نام اپنے ایک خط میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جو طالبِ علم، علم تفسیر میں ممالک محروسہ سرکارِ عالی میں بدرجہ اول کامیاب ہو اس کو میری طرف سے ایک تمغہ (طلائی) بطورِ انعام دیا جائے گا تا کہ طلبہ میں تفسیر کا شوق پیدا ہو۔ (حوالہ : مکتوب نمبر ۵۶۳ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ)

اُردو کی ترویج اور اُردو ذریعہ تعلیم کی جامعہ، جامعہ عثمانیہ کی مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام کی اشاعت میں نظام کالج ایک متوازی حیثیت اختیار کر گیا تھا، اس خصوص میں قائدِ ملت نے اپنے اہم سیاسی خطبہ میں جو انھوں نے صدر مجلس اتحاد المسلمین کی حیثیت سے دیا تھا، اس خصوص میں اپنے تعلق خاطر کا اظہار جس انداز میں فرمایا اس سے ان کے تعلیمی نظام سے خصوصی تعلق خاطر کا اظہار ہوتا

ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

''میں حکومت کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہر سمجھ دار فرزند ملک جامعہ کے مستقبل کے متعلق اس وقت بے چین ہے اور اس کی اس بے چینی سے واقف ہونا حکومت کا فرض ہے، مجلس اتحاد المسلمین بھی چوبیس لاکھ مسلمانوں کی آئندہ نسل کے متعلق اظہارِ رائے کا حق رکھتی ہے، اس وقت اپنی قطعی اور تفصیلی رائے کے اظہار سے قاصر ہے جب تک کمیشن کی پوری رپورٹ اس کے سامنے نہ ہو۔

نظام کالج کا مسئلہ جامعہ عثمانیہ سے کچھ کم اہم نہیں ہے، جامعہ کے قیام کے بعد سے نظام کالج اصحابِ فکر کے نزدیک ایک معمہ بنا ہوا ہے، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حیدرآباد نے ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر ایک مستقل جامعہ اپنے یہاں قائم کر لی اور جب کہ یہ جامعہ تجربہ کے تمام ادوار سے گذر چکی اور ہندوستان کے مختلف مکاتیبِ خیال کے زعماء نے اس تجربہ کو کامیاب پایا اور بلا اختلاف اظہارِ استحسان کیا جس میں مشہور کانگریسی زعیم راجہ گوپالا چاری اور مشہور مفکر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرد بھی شامل ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ملک میں نظام کالج کے ذریعہ ایک متوازی طریقہ تعلیم کو جاری رکھا جائے اور اس کا الحاق ایک بیرون ملک کی جامعہ سے باقی رکھا جائے، ہمارے اپنے ملک کے ہندو لیڈرز میں سے مسٹر نرسنگ راؤ جیسے صاحبِ فکر اور مخلص کارکن نے میکنزی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے اس کالج کے جامعہ عثمانیہ کے ساتھ الحاق کو پسند کیا تھا، میکنزی کمیٹی کے سامنے ان کی رائے کو انفرادی حیثیت دی جا سکتی ہے لیکن مجھ سے حیدرآباد کی ساری ہندو قوم کے معتمد علیہ نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے نظام کالج کے جامعہ عثمانیہ سے الحاق کو منظور کیا اور ان کی یہ منظوری حیدرآباد کی ساری ہندو قوم کی منظوری ہے کیوں کہ ان کو اس گفتگو کے وقت حیدرآباد کے سارے ہندو زعماء کا خط اعتماد حاصل تھا۔ مجھے معتبر ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ نظام کالج کو طلباء فراہم کرنے والے تمام مدارس فوقانیہ کو ہمارے سر رشتہ تعلیمات نے اُردو میں تعلیم دینے کی ہدایت کر دی تھی لیکن مجھے یہ سن کر افسوس و استعجاب ہوا کہ پھر سر رشتہ کی پالیسی متزلزل ہو رہی ہے اور ان احکام کو واپس لیا جا رہا ہے۔ میں سر رشتہ تعلیمات سے مطالبہ کرتا ہوں کہ نظام کالج کو بعجلت ممکنہ جامعہ عثمانیہ سے ملحق کرے اور ملک کے تعلیمی اداروں کی اس دو عملی کو مٹائے''۔

(حوالہ : خطبات قائدِ ملت مرتبہ نذیر الدین احمد ناشر بہادر یار جنگ اکیڈیمی، حیدرآباد)

''انجمن ترقی طلبہ حیدرآباد'' کے نام سے مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کے طلباء کی ایک تنظیم تھی جس کا قیام ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم کو قائدِ ملت بہادر یار جنگ کی سرپرستی حاصل تھی اور انھوں نے اس کے قیام اور استحکام میں ذاتی دلچسپی لی تھی، اس کے جلسوں اور دیگر تقاریب میں وہ نہ صرف شرکت فرمایا کرتے تھے بلکہ دامے درمے مدد بھی فرماتے تھے اور دیگر اہل خیر کو بھی اس کی امداد کی طرف متوجہ فرماتے تھے، اس انجمن نے تقریباً دس سال تک طلبہ برادری کی پرخلوص خدمت کی، ان میں علمی وادبی ذوق پیدا کیا اور اس کی جانب سے تقریری وتحریری مقابلوں کے علاوہ مذاکروں اور مشاہیرعلم وادب اور دانشوروں کی تقاریر کا سالانہ پروگرام نہ صرف مرتب ہوا کرتا تھا بلکہ اس پر سختی سے عمل بھی ہوتا تھا، اس انجمن میں اگرچہ ہندو مسلم طلباء شامل تھے تاہم اس کی یہ سرگرمیاں اور بالخصوص قائدِ ملت کی سرپرستی کے باعث یہ تنظیم آریہ سماجی طلباء کے دلوں میں خار بن کر کھٹکنے لگی اور انھوں نے وفاق طلباء سے ایک علاحدہ انجمن کی بنیاد ڈالی۔

اس طرح ہندو مسلم طلباء میں نفاق کا بیج بویا جو آگے چل کر برگ و بار لایا اور اسی ہندو طلباء تنظیم کی شہ پر ہندو طلباء کی ایک خاص تعداد نے ۱۹۳۹ء میں جامعہ عثمانیہ کا بائیکاٹ کیا اور ناگپور یونیورسٹی میں داخلہ لیا، لیکن ان کی یہ مہم ناکام ہوگئی اور بالآخر انھیں واپس جامعہ عثمانیہ میں آنا پڑا۔

اگرچہ مادر جامعہ نے انھیں بخوشی اپنے آغوش میں لے لیا تھا، تاہم ہندو طلبہ کا یہ گروہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا اور اس نے یہ مہم چلائی کہ جامعہ عثمانیہ کا نام اور مونوگرام (**انا مدینة العلم وعلی بابها**) یونیفام نیلی شیروانی بدل دیا جائے اور شعبۂ دینیات (اسلامیات) کو ختم کردیا جائے انجمن ترقی طلباء نے ان کی اس شرارت کا مقابلہ کیا۔ اس طرح ستمبر ۱۹۴۸ء تک جامعہ عثمانیہ کا اسلامی کردار برقرار رہا۔ (حوالہ : مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ ۲۵۱ حواشی از مولوی محمد احمد خاں صاحب)

جامعہ عثمانیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء، جامعہ نظامیہ اور دیگر تعلیمی اداروں سے ان کی وابستگی اور دلچسپی آخری دم تک باقی و برقرار رہی اور جس کی ترقی وترویج میں انھوں نے ہمیشہ امکانی تعاون فرمایا۔

بلوچستان میں ایک ہائی اسکول کے قیام میں مدد کے سلسلے میں جب نواب صاحب سے اربابِ متعلقہ نے ربط پیدا کیا تو اس خصوص میں انھوں نے اربابِ حکومت اور صدراعظم باب

حکومت سے اس خصوص میں جو نمائندگی فرمائی، اس کا حال سن کر حیرت ہوتی ہے کہ ۱۰ کروڑ مسلمانوں کا قائد جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا ایک معمولی ہائی اسکول کی مدد کے لئے کس قدر کوشاں تھا۔

(نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری صدر اعظم دولت آصفیہ حیدر آباد)

جناب مکرم و محترم! بلوچستان کے گذشتہ دورہ میں مجھے اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ کے معائنہ کا موقع ملا۔ بلوچستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت خراب ہے اور یہ ہائی اسکول ان کا واحد تعلیمی ادارہ ہے۔ گذشتہ زلزلے نے اس کی عمارت کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اب قاضی محمد عیسیٰ خاں صاحب اس عمارت کی تعمیر اور مدرسہ کے استحکام کی فکر میں ہیں۔ مدرسہ کی مختصر رپورٹ جو میری معلومات کے لئے مرتب کی گئی تھی رشتہ دوز کر رہا ہوں، جس کے ملاحظہ سے آپ پر تمام حالات روشن ہوں گے۔ بلوچستان کے مسلمان نہایت مفلس ہیں اور ان کی اقتصادی حالت بہت پست ہے، اس لئے اس ادارے کے کارکن ہندوستان کے رؤسا کی خدمت میں دست سوال دراز کر رہے ہیں چنانچہ ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے اس مدرسہ کے لئے ۱۲ ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا۔ قاضی صاحب جب گذشتہ دفعہ حیدر آباد آئے تھے تو انھوں نے آپ کی خدمت میں بھی سلطنت آصفیہ کی طرف سے سرپرستی و اعانت کی درخواست کی تھی، دولت آصفیہ کا دستِ کرم مشرق کے ہر گوشہ پر دراز ہے اور کوئی تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جس کی یہاں سے سرپرستی نہیں کی گئی ہو، دارالعلوم دیوبند، ہندو یونیورسٹی بنارس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، شانتی نکیتن، مدرسہ عالیہ فرنگی محل، آندھرا یونیورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور اور ایسے پچاسوں ادارے ابرِ کرم آصفی سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں، میں بلوچستان کے مدرسۂ اسلامیہ کو ان سب سے زیادہ مستحق سمجھتا ہوں اور اس کی طرف جناب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے دل سے متمنی ہوں کہ اس کے لئے سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے شایانِ شان امداد منظور فرمائی جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ کی وجہ سے خزانۂ آصفی پر آج کل بہت بار ہے لیکن "بر کریما کارہا دشوار نیست"۔ اُمید کہ جناب اس طرف بعجلت ممکنہ اپنی توجہ خاص مبذول فرمائیں گے۔

(حوالہ : مکتوب نمبر ۳۳۴ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ، کراچی)

اسی طرح بلوچستان میں کالج کے قیام کے سلسلے میں نواب صاحب نے سر احمد سعید خاں آف چھتاری کے نام جو بابِ حکومت دولت آصفیہ کے وزیر تھے، قاضی محمد عیسیٰ خاں بیرسٹر معتمد انجمن

اسلامیہ کوئٹہ بلوچستان کی جانب سے ایک درخواست خود مرتب فرمائی اور حکومت میں پیش کی۔

جناب مکرم و معظم!

آپ جیسے وسیع النظر شخص کی نگاہوں سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ ہوگا کہ بلوچستان اپنی ہر جہتی حیثیت کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے زیادہ بدبخت صوبہ ہے۔ یہاں تقریباً تمام آبادی مسلمانوں کی ہے جو مالی حیثیت سے انتہائی فلاکت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں، تعلیمی اعتبار سے یہاں کا اوسط تمام صوبہ جات سے گھٹا ہوا اور نفی کے برابر ہے۔ گذشتہ قیامت خیز زلزلوں نے اس ملک کو تباہی کے انتہائی حدود تک پہنچا دیا، بحمداللہ یہاں کے باشندوں میں اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہوگیا ہے، لیکن عام افلاس اور معاشی پستی نے ان کے احساسات کی تکمیل کے تمام راستے مسدود کر رکھے ہیں۔ بلوچستان کے مخلص قومی کارکنوں نے اور تمام خرابیوں کے دور کرنے کے لئے کامل غور و فکر کے بعد یہ واحد علاج تجویز کیا ہے کہ بلوچستان کی تعلیمی ترقی پر سب سے پہلے توجہ دی جائے اور خدا کے فضل و کرم اور مسلم رؤسائے ملک کی امداد و اعانت کی توقع پر ایک کالج کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس کی عمارت کے لئے مبلغ روپے کے اخراجات کا اندازہ کیا جارہا ہے اور جس کا سالانہ متوالی خرچ تقریباً ——— روپے ہوگا، میں اس امر کے اظہار پر مسرت محسوس کرتا ہوں کہ مسلم رؤسائے ہند نے ہماری اس تجویز پر توجہ کی، چنانچہ ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال نے ۱۲ ہزار روپے کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا۔

سلطنت اسلامیہ آصفیہ کے بذل و نوال کا دریا ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو سیراب کررہا ہے۔ آندھرا یونیورسٹی، شانتی نکیتن، ہندو یونیورسٹی بنارس، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی کے دامن فیض میں پرورش پارہے ہیں۔ ابھی دو سال قبل جلالت الملک سلطان دکن کی فیض بخشی سے ہمارے ہمسایہ صوبہ سرحد کا اسلامیہ کالج بہرہ اندوز ہو چکا ہے لیکن ہم باشندگانِ بلوچستان جو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس سلطنت اور اس کے تاجدار کی عقیدت کا بے پایاں جذبہ رکھتے ہیں اور اس سلطنت کی بقاء کے لئے قربان ہونے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، آج تک محروم ہیں۔ اب جب کہ ہم نے انتہائی نیک مقصد کے لئے عزمِ صمیم کرلیا ہے اور ایسا عزم کرلیا ہے جس کی تکمیل حضرت سلطان العلوم کی دستگیری کے بغیر ممکن نہیں، ہماری

درخواست ہے کہ اس صوبہ کے غیور اور بہادر باشندوں کی تعلیم کے لئے سلطنت آصفیہ سے ہماری شایانِ شان امداد فرمائی جائے جو ہم کو اس عالم دار و گیر میں ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچائے، تعمیر عمارت کے لئے یک مشت امداد کے علاوہ ایسی سالانہ امداد منظور فرمائی جائے جو اس کالج کے بقاء و استقلال کی ضامن ہو۔ (حوالہ : مکتوب نمبر ۱۹۷ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ، کراچی)

اس طرح مسلم تعلیمی اداروں کی مدد کو وہ قومی ضروریات کی اساسی اہمیت کی حامل ضرورت سمجھتے تھے۔

جناب شیخ احمد سی آئی ایس سابق اسپیشل سینئر کرسس پاڈنٹ آل انڈیا ریڈیو جموں و کشمیر اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں :

''میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور میں دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا انوار العلوم میں پڑھتا تھا۔ مولوی علی شبر ہاتمی صاحب مالک کتاب خانہ سائنس ٹیچر تھے، ان کے ہمراہ ڈیوڑھی گیا۔

دورانِ گفتگو میں حضرت قائدِ ملت نے قرآن شریف کی تلاوت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر گھر میں قرآن شریف کا کسی نمایاں مقام پر رکھا ہوا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے، نواب صاحب نے سمجھایا کہ قرآن شریف اگر کسی نمایاں مقام پر رکھا رہے تو ایک نہ ایک دن اس کی تلاوت کی توفیق ضرور حاصل ہوگی۔

نواب صاحب نوجوانوں سے ربط کے سلسلے میں نوجوانوں کو بلاتے اور ان سے دینی اور عوامی مسائل پر باتیں کرتے اور ان کا ذہن بناتے تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران دو سال تک نواب بہادر یار جنگ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ہر تقریب میں طلبہ برادری نواب بہادر یار جنگ کو شرکت کی دعوت دیتی تھی۔ مختلف اقامت گاہوں کی تقریبات میں بھی نواب صاحب شریک ہوتے تھے۔

راقم الحروف بی ہاسٹل میں رہتا تھا، نواب صاحب بی ہاسٹل کی متعدد تقریبات میں تشریف لائے، جس تقریب میں نواب صاحب موجود ہوتے طلبہ برادری ان سے تقریر کی گذارش ضرور کرتی تھی، جامعہ کے سالانہ جلسے میں نواب صاحب ضرور تشریف لاتے تھے، ڈنر کے بعد ان کی تقریر لازمی ہوتی تھی۔

بہادر یار جنگ اپنی تقریر میں لسانیات کا جوہر دکھاتے اور فکر و نظر کی بہار لٹاتے تھے، تقریر کیا ہوتی موتی رولیتے تھے۔ سامعین ان کی تقریر سن کر جھوم اُٹھتے، مسرور اور متکیف ہو جاتے، ان کی گفتگو سے محفل کشت زار زعفران بن جاتی تھی۔

(حوالہ : نواب بہادر یار جنگ-ایک نفسیاتی جائزہ صفحہ۱۶۲ از مولوی محمد انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ)

◆◆◆

بلبل ہند سروجنی نائیڈو

سرزمین دکن کی قابل فخر بیٹی سروجنی نائیڈو (۱۹۴۹ء-۱۸۷۹ء) دُنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بچپن ہی سے ان کا مزاج شاعرانہ تھا، ۱۱ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی نظم لکھی اور اسی دن سے ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی، ان کی ذہانت غیر معمولی تھی، بارہ برس کی عمر میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۶ سال کی عمر میں (Girton) کالج کیمرج میں داخلہ لیا، صحت کی خرابی کے باعث وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں اور لندن سے تبدیلی آب وہوا کے لئے اٹلی چلی گئی، آب وہوا کی یہ تبدیلی راس آئی۔ ۱۸۹۸ء میں وہ وطن واپس ہوئیں جب کہ ان کی عمر ۱۸ سال تھی، اسی سال ان کی شادی ڈاکٹر گوبندراجلو نائیڈو سے قرار پا گئی۔ لیکن ان کا ادبی ذوق پروان چڑھتا گیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں گولڈن تھرڈ شولڈ (The Golden Thre Shold) کے نام سے ان کا پہلا دیوان شائع ہوا، ادبی دُنیا میں پہلی بار وہ پورے آب وتاب کے ساتھ سامنے آئیں، اس دیوان کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور بنگالی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوا (ان کے جملہ چار دیوان اور نثر میں دو کتابیں شائع ہوئیں) شاعری سے ان کی دلچسپی روز افزوں رہی، وہ زندگی بھر پیار کے نغمے گاتی رہیں، شاعری سے ان کی رغبت اور دلچسپی کا اظہار خود ان کے اس خیال سے ہوتا ہے کہ "شاعری ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے میں اپنے جذباتِ قلبی کی ترجمانی کرسکتی ہوں"۔

اگرچہ ابتدائی شاعری میں وہ مغربی طرز، مغربی افکار وخیالات پر تلتی رہیں لیکن اڈمن بوس نے انھیں ہندوستان کے بارے میں اور ہندوستانی طرز پر لکھنے کا مشورہ دیا، اس مشورے کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ہندوستانی طرزِ فکر کو اپنا کر انگریزی زبان میں ہندوستانی تہذیب کو سمو دیا اور اس طرح ادبی دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی نظموں میں مشرق ومغرب کا خوشگوار امتزاج ہے، شری امرناتھ جھا آنجہانی نے ان کی شاعری کے متعلق لکھا تھا :

"مدھر کویتاوں کی خالق کی حیثیت سے ان کا شمار ہندوستان کے بہت ذہین اور باکمال شعراء

میں ہوتا ہے، ان کے الفاظ بدیشی ہیں ۔عروض کا سانچہ انگریزی لیکن خواب اور تصورات سب ہندوستانی ہیں''۔

اسی شاعرہ کی تصویر کے دو رُخ اور بھی ہیں، ایک سماجی خدمت دوسرے سیاسی خدمات، انھیں اپنے وطن حیدرآباد دکن سے محبت نہیں عشق تھا۔اہل حیدرآباد کی سماجی خدمت گذاری کا ایک عظیم پس منظران کی ان خدمات کا معترف ہے۔۱۹۰۸ء میں جب حیدرآباد میں طغیانی آئی تھی۔اس وقت انھوں نے مصیبت زدگان کی جو مثالی خدمت انجام دی جس پر انھیں حکومت برطانیہ نے خطاب سے نوازا تھا۔

۱۹۱۴ء میں وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملیں اور اس طرح ۱۹۱۴ء سے وہ سیاسی طوفانوں کے ساتھ ہوگئیں، اینی بسنت ہوم رول تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔جانبٹ سلکٹ کمیٹی کے سامنے ۱۹ خواتین کی کمیٹی کی نمائندہ کی حیثیت سے نمائندگی کی ۔ جواہرلعل نہرو اور سردار پٹیل سے پہلے وہ کانگریس کی صدر چنی گئی، گاندھی جی کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی۔گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر کی حیثیت سے افریقہ بھیجی گئیں۔۱۹۳۲ء میں گاندھی جی کے ساتھ جیل بھی گئیں۔۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے ضمن میں ان کو گرفتار کیا گیا۔وہ کانگریس کے عظیم مجاہد رہنماؤں میں سے ایک تھیں جنھوں نے جنگِ آزادی میں جان کی بازی لگادی۔آزادی کے بعد وہ ۱۹۴۷ء میں گورنر بنائی گئیں اور دمِ آخر تک اس عظیم عہدے پر فائز رہیں۔

سروجنی نائیڈو کے خطابت کا شہرہ بھی ہرسو تھا۔وہ خطیب بے بدل تھیں، ان کی شخصیت کے اس مختصر تعارف کے بعد قائدِ ملت سے ان کے تعارف اور تعلق کے بارے میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء تک نواب صاحب سے ان کا شخصی تعارف بھی نہیں تھا، البتہ ان کی علمیت اور خطابت کی شہرت سے نواب صاحب واقف تھے اور پہلی بار ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو بطورِ خاص ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر سننے کے لئے نواب صاحب تشریف لے گئے، اس تقریر کا حال نواب صاحب نے اپنی ڈائری میں قلمبند فرمایا تھا وہ تحریر فرماتے ہیں :

''ٹھیک ٦ بجے ٹاؤن ہال کو واپس آیا، اسٹیج کے قریب اچھی جگہ مل گئی، طلباء واساتذہ جامعہ عثمانیہ اور دیگر عہدہ داران وعلم دوست حضرات کا بڑا مجمع تھا، مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب صدر کلیہ

عثمانیہ نے صدارت کی، مسز سروجنی نائیڈو نے ہندو مسلم اتحاد کے عنوان پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس عورت کی قوتِ خطابت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، تقریر ایسی مسلسل اور مرتب تھی کہ ایک سکنڈ کے لئے بھی کسی نے اس کو خاموش ہوتے نہ دیکھا اور ایک جملہ بھی ایسا نہ تھا جو بھرتی کا ہو اور اس روانی کے ساتھ۔ فصاحت کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا شعر پڑھ رہی ہیں"۔

(حوالہ : بہادر یار جنگ کی ڈائری مرتبہ نذیرالدین احمد صفحہ ۲۷ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

جب بھی ان دو عظیم ہستیوں کا تعارف ہوا، یقیناً وہ یادگار لمحات ہیں۔ بعد کی روئیدادوں سے جو تفصیلات ملتی ہیں۔ اس سے اس تعلق و نسبت پر مسرت ہوتی ہے، قائدِ ملت، بلبل ہند سروجنی نائیڈو کو ماں کہتے تھے اور بلبل ہند انھیں اپنا بیٹا۔ ماں کے دل میں اپنے اس آتش بیان، شعلہ نوا، صاحبِ علم و فضل بیٹے کی کس قدر محبت جاگزیں تھیں، اس کا اندازہ، گنیش اُتسو کے جلسے میں نواب صاحب کے بارے میں ان کے گراں قدر ارشادات سے ہوتا ہے۔

۲۶/ اگست ۱۹۴۱ء کو حشمت گنج میں سروجنی نائیڈو کی صدارت میں "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کے زیر عنوان بہادر یار جنگ نے تقریر فرمائی تھی۔ تقریر سے قبل سروجنی نائیڈو نے اپنی فصیح و بلیغ تقریر میں نواب صاحب کا تعارف کروایا، جس کے جواب میں نواب صاحب نے فرمایا کہ :

"صدر محترمہ نے میرا تعارف کراتے ہوئے جو جملے استعمال کئے ہیں، اس کا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ چوں کہ میں ان کو ماں کہتا ہوں اس لئے انھوں نے میری نہیں بلکہ خود اپنی تعریف کر لی"۔

نواب صاحب کی اس یادگار تاریخی تقریر کے بعد سروجنی نائیڈو نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : ایسی تقریر کے بعد میری کیا مجال ہے جو کچھ بیان کروں صرف اتنا کہتی ہوں۔

بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگین سخن مبارک

سروجنی نائیڈو کی ذات، انسانیت کے اعلیٰ جذبات کا پیکر تھی، جیسے کہ خود انھیں اس حقیقت کا احساس تھا جو مبنی بر حقیقت ہے کہ "خدا نے کسی مقصد کے تحت مجھے غیر جانبداری کے منفرد انعام کے

ساتھ تخلیق کیا ہے''۔

جس وقت سروجنی نائیڈو کو بہادر یار جنگ کی روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کی اطلاع ملی تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں، بلبل ہند کی زبان گنگ ہوگئی۔ آنکھوں سے اشک رواں چلے، کئی دن تک وہ اس المناک حادثے کے اثر سے متاثر رہیں، جب کچھ سنبھلیں تو نظم میں اپنے بیٹے بہادر خاں کو خراجِ عقیدت کے آنسو جو سلک گہر تھے، پیش کئے۔ اس نظم میں قائدِ ملت کی شخصیت کی جو تصویر ملتی ہے وہ اس خاکدان ارضی میں ——— ان کی حیاتِ جاوید کی دیدہ وشنیدہ تصویر ہے اور اس نظم میں ایک پرعظمت خاتون کے تاثراتِ قلبی کا مقناطیسی جذب اور جذبہ اندرون کا کرب بھی پوری طرح نمایاں ہے۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو آنجہانی کا نالۂ شیون

اپنی حرماں نصیبی کے نشتر اول سے گھائل ہو کر چوں کہ ہم ابھی اندوہ غم کے سیلاب میں غوطے کھا رہے ہیں اس لئے اس ملی نقصان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے، جو ایسی ہستی کی بے وقت موت کی وجہ سے عائد ہوا ہے، جس نے اپنی زندگی ہی میں وہ عظیم المرتبت حیثیت اختیار کر لی تھی جس کی نظیر صرف ماضی کی داستانوں میں ملتی ہے۔

اس نوجوان دلیر افغان سپاہی کی ذات جو سب کو اس درجہ محبوب اور ہر دل عزیز تھی جسے شباب کی عین فصل بہار میں موت کے پنجہ نے نہایت المناک طریقہ پر ہم سے جدا کر دیا، جس کی مفارقت پر ملک کے وسیع طول وعرض میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

اس کی ذات کہیں زیادہ ان صفات سے متصف تھی جو اس کی اپنی بہادر اور شجیع نسل کی ممتاز خصوصیات ہیں، فطرت نے اس کو جسم، دماغ اور سیرت کے مؤثر اور نمایاں محاسن اس محیر العقول فیاضی کے ساتھ عطا کئے کہ ساری دُنیا اس کی گرویدہ ہو چکی تھی، اس کی ذات، جرأت، حسن باطن، اخلاص، سادگی، پر جوش اور عالی ہمت انسانیت سے متصف تھی جس نے مختلف مذہب اور مسلک کے بے شمار انسانوں کو وابستہ دامن اُلفت بنا لیا تھا۔

اس کی خطابت کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حسن وکمال سے اَن گنت قلوب کے اندر ہیجان پیدا کر دیا، حریت کی راہ میں اس کا جذب دروں نا قابل شکست اور ان تمام مقاصد کے لئے

جس کی اس نے اَن تھک جوش وسرگرمی کے ساتھ حمایت کی اس کا جذبہ اشتیاق بے باک تھا۔ ان تمام نعمتوں کے منجملہ خداداد مسلمہ قیادت کی سب سے بڑی نعمت جو قوموں کی زندگی میں بہت کمیاب ہوتی ہے اس مردِ مجاہد کو حاصل تھی۔ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو زمانہ کا امتداد اس نعمت کے حسن کو دوبالا کر دیتا اور تجربہ کی پختگی اس کو ملت کی ایسی گراں مایہ متاع کی صورت میں تبدیل کر دیتی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلام کی خدمت کے لئے مفید ثابت ہوتی لیکن بہادر خاں جیسے انسان درحقیقت فنا نہیں ہوتے بلکہ ان بے شمار افراد کی مساعی کی بدولت اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں جس کو انھوں نے اپنے مقناطیسی جذب دلکش سے متاثر کیا تھا، دُنیا کی بہت سی بااقتدار ہستیوں کے لئے ان لاکھوں ابنائے وطن کا والہانہ خراجِ عقیدت بجا طور پر قابل رشک ہوسکتا ہے۔ جو اس کے جنازے کے جلوس کے موقعہ پر المناک لیکن پرشکوہ مناظر کی شکل میں ادا کیا گیا۔ یہ اس کی سب سے بڑی فتح اور اس خاکدان ارضی میں اس کی حیاتِ جاوید کا درخشاں تاج ہے۔

(ترجمہ از مولوی عبدالرحمٰن سعید، سعید صدیقی)

◆ ◆ ◆

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء-۱۹۴۱ء) کو بچپن سے شاعری سے دلی لگاؤ تھا، سات سال کی عمر میں انھوں نے پہلی نظم لکھی، ثقافت وتمدن سے متعلقہ علوم، ڈرامہ رقص، مصوری سے ان کا تعلق ان کی فطری دلچسپیوں کا آئینہ دار تھا، وہ فطرت پسند انساں تھے انھوں نے نظمیں، گیت اور غنائیہ لکھے۔ ۱۹۰۹ء میں پہلی بار ان کی گیتوں کا مجموعہ گیتان جلی شائع ہوا۔ اور ۱۹۱۳ء میں انھیں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ یہ ایشیاء کے پہلے ادیب تھے جنھیں اتنا بڑا اعزاز ملا۔ ٹیگور نے نوبل پرائز کی ساری رقم شانتی نکیتن کو دے دی۔ ان کے گیت وطن پرستی سے سرشار قومی گیت ہیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتحاد، وطن دوستی سے مملو جذبات پر مشتمل ان کا کلام ایک پوری نسل کے خیالات میں نمایاں تبدیلی کا وسیلہ بنا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں رابندر ناتھ ٹیگور کے قلم نے احساسِ آزادی کے جذبوں کو اُبھارا۔ ان کے احساس کے جذبوں پر مشتمل کلام صفحہ قرطاس سے قلوب کی دُنیا میں ہلچل پیدا کرنے کا مؤثر وسیلہ ثابت ہوا۔ ٹیگور کا یہ ایقان تھا کہ دُنیا کی تہذیب کے عناصر تہذیب کو صحیح خطوط پر مجتمع کریں۔ نیشنلزم کا نعرہ ہی کافی نہیں، اپنے اس نظریئے کو حقیقت میں بدلنے کیسے انھوں نے شانتی نکیتن کا قیام عمل میں لایا اور اس ادارے کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ شانتی نکیتن تحصیل علم کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۹۱۸ء میں یہ اسکول یونیورسٹی میں متبدل ہوگیا۔ اس یونیورسٹی نے نوآبادیاتی تعلیمی نظام کے مقابلے میں انسانی وسائل کے فروغ کے لئے تحصیل علم کا ایک نیا نظام مہیا کیا۔

یہ عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ اگرچہ کہ گاندھی جی سے ان کے مراسم گہرے تھے، ٹیگور ہی نے گاندھی جی کو مہاتما کا خطاب دیا تھا اور گاندھی جی ٹیگور کو گرودیو کہا کرتے تھے۔ سیاست سے دوری کے باوجود اپنے وطن سے ان کی گہری عقیدت، ان کے حساس قومی جذبات کی پاسباں تھی۔ جلیاں والا باغ کے المناک حادثے سے متاثر ہوکر انھوں نے وائسرے کو ایک سخت خط لکھا تھا اور

ساتھ ہی سر کے خطاب سے دست بردار ہو گئے تھے۔اس عظیم مفکر اور شاعر کے جذبات و احساسات قومی بنیادوں پر استوار تھے، ٹیگور کو ہندو مسلم اختلاف پر بڑا دُکھ تھا۔نئ نسل میں وہ بھائی چارگی پیدا کرنے کے آرزومند تھے۔ان کی نظمیں ان کے گیت اور غنائیہ ہندوستان کا ادبی قومی سرمایہ ہیں جس پر قوم کو بجا طور پر ناز ہے ٹیگور عملی سیاست سے دور رہ کر ادب کی وساطت سے سیاست کی شعوری منزلوں میں شامل رہے۔اس عظیم شاعر کی موت شعر و موسیقی کی دُنیا میں ایک جاں سوز حادثہ ثابت ہوئی۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی نواب صاحب سے پہلی ملاقات

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور سروجنی نائیڈو کے مہمان تھے۔اس عظیم شاعر کی دکن میں بڑی پذیرائی ہوئی۔اہل علم و فن، امراء عظام کی محفلوں میں انھیں مدعو کیا گیا اور حیدرآباد کی سیر کروالی گئی ——— ایک دن جب ٹیگور سیر سے واپس ہوئے تو سروجنی نائیڈو نے پوچھا گرودیو آپ نے حیدرآباد دیکھ لیا۔کہاں ہاں، پوچھا بہادر یار جنگ کو دیکھا (وہ پریشان ہوئے کہ یہ کوئی عمارت کا نام ہے یا کسی تفریحی مقام کا) کہانہیں، تب سروجنی نائیڈو نے کہا کہ پھر تو، آپ نے حیدرآباد دیکھا ہی نہیں۔ٹیگور کا اشتیاق بڑھا پوچھا یہ، کیا چیز ہے۔تب نواب صاحب کی شخصیت اور ان کی جادو بیانی کا ذکر کیا گیا، ٹیگور ان کی تقریر سننے کے مشتاق ہوئے۔نواب صاحب کو اطلاع دی گئی کہ ٹیگور آپ کی تقریر سننے کے متمنی ہیں۔سرامین جنگ کی ڈیوڑھی میں محفل منعقد ہوئی۔ٹیگور نواب صاحب کی تقریر سے حد درجہ متاثر ہوئے۔قائدِ ملت کو شانتی نکیتن بلایا اور اپنا مہمان رکھا اور دمِ آخر تک نواب صاحب سے ٹیگور کی محبت قائم رہی۔حیدرآباد کے قدیم علمی و ادبی ماہنامہ شہاب ستمبر ۱۹۴۱ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کے انتقال پر منعقدہ جلسہ میں قائدِ ملت کی تقریر شائع ہوئی، اس تقریر کی روئیداد سے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کے نواب صاحب اور گرودیو کے تعلقات کی ابتداء کیسے ہوئی، انھوں نے شانتی نکیتن میں کیا دیکھا اور قائدِ ملت کے دل میں رابندر ناتھ ٹیگور کی عزت و احترام کی وجہ کیا تھی، نواب صاحب کی وہ شاہکار تقریر ہدیہ ناظریں ہے جس کے مطالعہ کے بعد کسی مشاطگی کی حسن معنی کو ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آہ ٹیگور

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ عالم کی موت عالم کی موت ہوتی ہے اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ عالم کا دماغ فکر وتصور کی ایک دُنیا ہوتا ہے اور اس کی موت اس دُنیا میں قیامت بن کر آتی ہے۔

ڈاکٹر ٹیگور اصطلاحی شاعر نہ تھے جو آج کل ہر گلی کوچہ میں پائے جاتے ہیں وہ اصلی معنی میں شاعر تھے جن کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔ ایسا شاعر فطرت کائنات کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے وہ قدرت کے رُخ سے نقاب اُٹھاتا اور رموزِ اسرار فطرت اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور دُنیا کی آنکھوں پر آشکار کر دیتا ہے۔ شاعر تفکر وتعقل کے سمندر کا وہ غواص ہوتا ہے جس کے سامنے صدف اپنی ہتھیلیاں کھول دیتے ہیں اور موتی اپنے آپ کو خود پیش کرتے ہیں اور ان کے درہائے معانی کو چنتا اور اپنی نظم کی مالا میں پرو کر فطرت کے گلے کی زینت بناتا ہے فطرت سے اس کا تعلق اتنا گہرا، اتنا مستحکم اور اتنا قریبی ہوتا ہے کہ وہ فطرت میں گم ہوتا ہے۔ فطرت اس کی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے، وہ مسکراتا ہے تو ہوائیں گنگنانے لگتی ہیں، درخت تالیاں بجاتے ہیں سورج کی کرنیں ناچتی ہیں اور ساری کائنات متبسم بن جاتی ہے جب اس کے ابرو پر بل پڑتے ہیں تو بادل رجز پڑھنے لگتے ہیں۔ چاند میں بجلیاں بھر جاتی ہیں۔ سورج آگ برسانے لگتا ہے اور ساری کائنات ایک میدان کارِزار بن جاتی ہے۔ پھول اس کے ہاتھ میں آکر کبھی نظر فریب بن جاتا ہے اور کبھی نظارہ سوز، وہ کبھی رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتا ہے اور کبھی لالے کو شعلہ طور بنا کر عشق کی دُنیا کو خاکستر بنا دیتا ہے۔

دو فطرت شناس

ہندوستان نے اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر میں دو بڑے فطرت شناس اور قدرت آشنا شاعر پیدا کئے۔ ایک شمال مغرب میں دوسرا شمال مشرق میں۔ ایک نے سوتوں کو جگایا، جاگتوں کو کھڑا کیا اور کھڑے ہوؤں کو چلایا، اور چلنے والوں کو دوڑانے کی تعلیم دی۔ دوسرے نے امن وشانتی کا راگ الاپا۔ کپٹ کی چتا میں جلنے والوں کو پریم جل کے چھینٹے دیئے اور دُنیا کو دیکھنے اور سننے کے لئے ایک مجسمہ نغمہ جس میں اقبال کے ''پیامِ مشرق'' اور ٹیگور کی '' گیتان جلی'' میں دو خصوصیتیں پاتا ہوں۔

گذشتہ جنگِ عظیم سے یورپ کی دُنیا تھک چکی تھی تکا پوئے دمادم اور میدان رستخیری

سرگرمیوں نے ان کے اعضاء کونڈھال کردیا تھا وہ پیغامِ امن کے بھوکے تھے، پیغامِ مشرق کی طرف متوجہ نہ ہو سکے اور گیتان جلی نے ان کے نگاہوں کو جذب کرلیا۔

یہ ہے ٹیگور کے نوبل پرائز کی حقیقت جس پر آج ہم سب ہندوستانی بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

نواب سرامین جنگ کی محفل

آج سے آٹھ سال قبل، مجھے مشرق کے اس عظیم الشان شاعر کے سامنے یادا گوئی کے مظاہرے کا موقع ملا تھا۔

نواب سرامین جنگ بہادر کی روایت ہے کہ شاعر کو اُردو کی اچھی تقریر سننے کی تمنا تھی، نہ معلوم کیوں نظرِ انتخاب مجھ ہیچ دان پر پڑھی۔ میرے لئے جو تقریر و خطابت کو ایک کھیل سمجھتا ہے فی الحقیقت وہ دن ایک آزمائش کا دن تھا، میں نے بہت کم اپنی کسی تقریر سے پہلے سوچا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہئے لیکن اس دن مجھے نہ صرف سوچنا بلکہ تیار ہونا پڑا۔ شاعر کی بڑائی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی ہمت افزائی کرکے اور ان کو بڑا بنا کر خوش ہوتا ہے۔ یہی خوبی ڈاکٹر ٹیگور میں تھی انھوں نے نہ صرف میری موجودگی میں بلکہ میرے غیاب میں بھی اس مختصر تقریر کو بہت پسند کیا۔ آج کی محترم صدر مسز نائیڈو سے انھوں نے کہا تھا کہ اس لڑکے کی روانی اور اندازِ بیاں اس کو ہر زبان کا اچھا مقرر بنا سکتی ہے۔ اگر یہ انگریزی میں مشق کرے تو یہ کامیاب مقرر ہوگا میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیوں نہ اس کی کوشش کروں۔ ممکن ہے شاعر کی یہ پیشین گوئی اس کی روحانی قوتوں سے مل کر پوری ہو جائے۔ ان کی یہ محبت آخر تک قائم رہی۔

شانتی نکیتن

میں اپنی زندگی کے ان لمحات کو فراموش نہیں کرسکتا۔ جب کہ مجھے شاعر کے ساتھ شانتی نکیتن میں دو دن گذارنے کا موقع ملا تھا۔ یہ اڑتالیس گھنٹے میرے صفحہ دماغ پر ہمیشہ مرتسم رہیں گے۔ وہ دور دور تک پھیلے ہوئے سرخ میدان مشہور عالم درسگاہ، مشرق میں وہ آموں کے بڑے بڑے پیڑ، ان کے نیچے پوتی ہوئی صاف زمین جس پر بیٹھ کر تشنگانِ علم سادگی اور پرکاری کا درس حاصل کرتے ہیں۔ جا بجا طلبائے فن لطیف کے بنائے ہوئے مجسمے دیواروں پر، ان کی مصوری کے شاہکار ہر چیز میں مشرق کی راندہ اور ٹکرائی ہوئی تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش نمایاں۔ وہ عظیم الشان کتب خانہ جس

میں بیٹھ کر ریسرچ اسکالرس اپنے مقالے تیار کرتے ہیں اور میرے لئے سب سے زیادہ جاذب توجہ وہ شعبۂ اسلامیات جو حضور شاہ دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عطیہ سے شاعر نے اس جامعہ میں قائم کیا تھا، ان سب کی ایک ایک تفصیل آج بھی میری نگاہوں میں پردہ سیمیں کی تصویروں کی طرح پھرنے لگتی ہے۔

میں اپنی ان ملاقاتوں کے بناء پر تصدیق کرتا ہوں کہ شاعر فرقہ وارانہ تصورات سے بالاتر تھا وہ خوبیوں کا متلاشی تھا چاہے جہاں سے اس کو حاصل ہوتے۔ وہ موحد تھا اور اس کا کیش بقول غالبؔ ترکِ رسوم تھا اور وہ ملتوں کے مٹ جانے ہی کو اجزائے ایمان کی تیاری تصور کرتا تھا۔

سیاست اور ٹیگور

اگر ہندوستان کی زمامِ سیاست ٹیگور جیسے مخلص، بے ریا اور حقیقی معنی میں ہندوستان پرست لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی، شائد ہندوستان میں وہ تحریکیں پیدا ہی نہ ہوئیں۔ کاش آج بھی بڑی جماعتوں کی رہبری کرنے والے، ٹیگور کے نقش قدم پر چلیں اور چھوٹی جماعتوں کی بے چینی کو دور کرسکیں۔

طاعت و بندگی

مجھے ڈاکٹر ٹیگور آنجہانی کی وسعتِ قلب کو ظاہر کرنے کے لئے اجازت دیجئے کہ اپنے دو روزہ قیام شانتی نکیتن کا واقعہ بیان کردوں۔ میں شاعر کے اس کمرے میں بیٹھا ان سے باتیں کررہا تھا جو سر سے پاؤں تک مجسم شعر تھا شاعر نے مجھ سے لفظ ''اسلام'' کے معنی پوچھے جب میں نے بتایا کہ اسلام اطاعت اور بندگی کو کہتے ہیں۔ تو انھوں نے فوراً سوال کیا کہ مسلمانوں نے اس لفظ کو اپنے مذہب کے لئے کیوں پسند کیا۔ میں نے ذرا تفصیلی طور سے توضیح کی کہ قرآن مجید اسلام کو کائنات عالم کا فطری مذہب قرار دیتا ہے، جہاں کہیں خدا کی طرف سے کوئی آواز بلند ہوئی اور جس کسی نے خدا کے بندوں کو خدا کا راستہ دکھایا، قرآن کی اصلاح میں اس نے اسلام کے سوا کوئی اور چیز پیش نہیں کی، چاہے وہ ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحٰق کی آواز ہو، جو شوریہ اور فلسطین میں گونجی اور جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے یا وہ زرتشت وہ کنفیوشش اور گوتم بدھ کی ہو جو ایران و چین اور ہندوستان میں بلند ہوئی، چوں کہ قرآن میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے مسلمان ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن قرآن

کے ارشاد لکل امة رسول و ان امته خلافیها نذیر کے مطابق یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ رب العلمین نے مشرق کے ان عظیم الشان ممالک کو اپنی ہدایت سے ہمیشہ محروم رکھا ہوگا۔

مسلمان تنگ نظر نہیں ہے

شاعر نے میری گفتگو کو نہایت توجہ سے سنا اور فرمانے لگے کہ تمہارا بیان تو اس الزام کی تردید کرتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو تنگ نظر کہہ کر لگا دیتے ہیں اور پھر پوچھا کہ موجودہ اختلافات کی حقیقت کیا ہے، میں نے کہا کہ موجودہ اختلافات اصل کی خرابی نہیں، نظر کی دوری کا نتیجہ ہے۔ جیسے جیسے معلمین قانونِ فطرت سے زمانہ دور ہوتا گیا۔ لوگوں نے ان کے مطلب کو سمجھنے میں غلطیاں کیں شریعتیں بدلیں، لوگوں نے ان کو دین کی تبدیلی سمجھ لیا اور آپس میں لڑ پڑے، پھر شاعر نے باوجود اپنے انتہائی علم و فضل کے مجھ سے دین و شریعت کا فرق دریافت کیا۔

میں اس گفتگو میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا مجھے جو چیز بتانی تھی وہ یہ کہ شاعر لیلائے علم کا دیوانہ تھا اور جدھر ناقہ لیلیٰ سے نشانِ قدم پاتا تھا اُدھر چل پڑتا تھا یہاں تک کہ اس میں نجد عراق کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ یہی راز اس کی بڑائی کا ہے اور یہی پہلو اس کی زندگی کا قابل تقلید پہلو ہے۔

◆◆◆

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حکومت حیدر آباد (علاقہ نظام) کے ضلع اورنگ آباد میں ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے (یہ قائدِملت سے عمر میں صرف دو سال بڑے تھے) اورنگ آباد کے ایک بزرگ حضرت قطب الدین قبلہ مودودی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں اور اسی نسبت کی بناء پر اپنے نام کے ساتھ مودودی لکھا کرتے تھے، مولانا کی زندگی کا نصف سے زیادہ حصہ حیدر آباد میں بسر ہوا۔

۱۱ سال کی عمر میں مولانا نے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد سے مولوی کا امتحان کامیاب کیا، اپنے ذاتی مطالعے اور خداداد صلاحیتوں سے علمی دُنیا میں نام پیدا کیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۷ء تک صحافت سے وابستہ رہے، جن اخبارات ورسائل سے ان کا تعلق رہا ان میں مدینہ، بجنور، تاج جبل پور، مسلم اور الجمعیۃ دہلی کے نام شامل ہیں۔

علمی دُنیا میں ان کا قلم ان کے تعارف کا وسیلہ بنا، پردہ، تنقیحات، تفہیمات، رسالہ دینیات، تجدید واحیاء دین اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت روزافزوں رہی اور ان کے رسالہ ''ترجمان القرآن'' نے (جو ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد سے جاری ہوا) ان کی بے پناہ علمی و مذہبی صلاحیتوں کا اہل علم سے لوہا منوایا۔

یہ بات اگرچہ بڑی عجیب سی ہے مگر حقیقت یہی کہ مولانا کی پہلی تصنیف کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا کی پہلی تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' ہے۔ مولانا کی پہلی تصنیف ''دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے دوصد سالہ تعلقات'' نامی کتاب ہے اور دوسری تصنیف تاریخ دکن ہے۔ شاہان قطب شاہ اور تیسری سلاطین آصفیہ۔

مولانا کا منفرد اُسلوب، ادبی چاشنی، منطقی استدلال اور دل نشیں اندازِ بیان ان کے مدعا کی تفہیم کا انداز، علمی حلقوں اور عوام میں یکساں مقبولیت کا باعث بنا۔

۱۹۳۴ء میں ترجمان القرآن کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کی دعوت کے مشن کا آغاز ہوا،

مولانا کے ۱۵۰ عقیدتمندوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ ۱۹۴۱ء سے جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور مولانا امیر جماعتِ اسلامی کی حیثیت سے عالم اسلام کے سامنے آئے اور ہزاروں قلوب کو اپنے پیام سے متاثر کیا۔ نواب بہادر یار جنگ ان کے ہم عصر تھے، بہادر یار جنگ سے ان کی ملاقات اور ان کا تعارف حسن اتفاق سے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس (۱۹۲۹ء) میں نواب صاحب کی تقریر سے ہوا، اس پہلے تعارف کا حال ان کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا جب کہ یہ تعلق دوستی میں متبدل ہو چکا تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن لاہور کے تاثرات

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور

مؤرخہ ۱۲/ شعبان ۱۳۵۸ھ

م ۲۶/ ستمبر ۱۹۳۹ء

مکرمی ومحترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مؤرخہ ۱۹/ ستمبر ملا، میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے محترم دوست نواب بہادر یار جنگ کے متعلق اپنے تاثرات کے اظہار کا موقع بخشا۔

نواب صاحب سے میں سب سے پہلے اس وقت واقف ہوا جب ۱۹۲۹ء میں مجھ کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کا موقع ملا، نواب صاحب اس وقت تقریر فرما رہے تھے اور میں ان کے نام تک سے ناواقف تھا، تھوڑی دیر تقریر سنتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں عام مقررین سے مختلف ایک شخص سے دوچار ہوں جو خطابت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، سلجھے ہوئے خیالات، مرتب اور مربوط بیان، الفاظ کا صحیح انتخاب اور برمحل استعمال، جملوں کی صحیح نشست اور ان میں ادب کی لطیف چاشنی، ان سب چیزوں نے مل جل کر مجھے مقرر کی شخصیت سے فوراً متاثر کیا اور ہم نشینوں سے دریافت کرنے پر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ نواب بہادر خاں صاحب حیدرآباد کے ایک جاگیردار ہیں تو مجھ کو اور زیادہ حیرت ہوئی، کیوں کہ میں حیدرآباد کے جاگیردار طبقہ سے جو واقفیت رکھتا تھا اس کی بناء پر مجھے توقع نہ تھی کہ ایسا اچھا خطیب اور ایسے پاکیزہ خیالات اور وسیع معلومات رکھنے والا شخص اس طبقہ میں پیدا ہوگا۔

اس کے کچھ ہی مدت بعد مجھے نواب صاحب سے شخصی تعارف حاصل ہوا اور چھ سات سال میں متعدد مواقع ایسے پیش آئے جن میں نواب صاحب کے اخلاق، ان کی سیرت، ان کے خیالات اور ارادوں اور ان کی ذہنی صلاحیتوں سے مجھے کافی گہری واقفیت حاصل ہوئی اور میں نے یہ رائے قائم کی کہ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ شخص آگے چل کر ایک نمایاں مرتبہ حاصل کرنے والا ہے، الحمدللہ کہ اب میری وہ توقعات پوری ہو رہی ہیں اور میں یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوں کہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر ایک ایسا لیڈر مل گیا ہے جو لیڈرشپ کے لئے ہر طرح موزوں ہے۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نواب صاحب سے مسلمانانِ دکن کی کوئی یادگار رہ جانے والی خدمت لے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(حوالہ : آفتابِ دکن ازحمیداللہ خان شیدؔا صفحہ ۱۰، ۱۱)

قائدِ ملت، مولانا مودودی کی علمیت اور ان کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ مولانا کے عالم دین ہونے کے باعث بے حد تعظیم و تکریم فرماتے، مولانا مودودی قائدِ ملت سے ملنے کے لئے بیت الامت بھی تشریف لایا کرتے۔

اگرچہ دستیاب خطوط کی روشنی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے موسومہ خطوط کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں ہے، مگر قائدِ ملت اور مولانا ابوالاعلیٰ کی مراسلت بہرحال اتنی مختصر ہو نہیں سکتی، مطلوبہ خطوط میں پہلا خط ۴/ ستمبر ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا ہے یہ خط مولانا نے قائدِ ملت کے نام تحریر فرمایا تھا اور دست بہ دست روانہ فرمایا تھا۔ اس خط میں خاکسار تحریک سے متعلقہ لٹریچر کی فراہمی کی نواب سے خواہش کی گئی تھی، مولانا کا یہ خط اور اس کا جواب ہر دو سے قریبی ربط و تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

محترمی و مکرمی نواب بہادر یار جنگ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے پاس متعدد اصحاب کے خطوط آئے ہیں جس میں تحریکِ خاکساراں کے متعلق اظہارِ

رائے کا مطالبہ کیا گیا مگر میں اس تحریک کے پورے لٹریچر کا غائر مطالعہ کئے بغیر کسی رائے کا اظہار مناسب نہیں سمجھتا اس لئے تذکرہ کا مطالعہ کیا ہے اور وہ میرے پاس موجود ہے، لیکن علامہ مشرق کی تازہ تحریریں اور ان کی تحریک کے اُصول و مقاصد اور ان کا دستور العمل دیکھے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، اگر آپ کے پاس یہ چیزیں موجود ہوں اور آپ کچھ مدت کے لئے مجھے مستعار دے سکیں تو میں ان کو حاصل کرنے کی مشقت سے بچ جاؤں گا لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو براہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں کہ لٹریچر کہاں سے مل سکتا ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

مولانا ہی کے کرم نامے کی پشت پر جواب کے زیرِ عنوان نواب صاحب نے جو جواب تحریر فرمایا تھا۔ درج ذیل ہے :

جواب : تحریکِ خاکساراں سے متعلق کتابیں، ارشادات اور قول فیصل مرسل ہیں اور ان ہی کو تحریک سے متعلق کہا جاسکتا ہے، بہت اچھا ہوا کہ لوگوں نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کی ضرور ملاحظہ فرمایئے اور اپنی رائے کا اظہار فرمایئے۔

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان کتب کے مطالعہ کے بعد اپنے خیالات کے شائع کرنے سے قبل ایک مرتبہ آپ مجھ سے ملاقات فرمالیں، میں آپ کی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔

(حوالہ : یہ خط کسی مکاتب کے مجموعہ میں شریک نہیں ہے۔ قلمی غیر مطبوعہ مگر میرے ذخیرہ میں موجود ہے ——— سوانح نگار)

شرح دستخط آپ کا مخلص

نواب بہادر یار جنگ

دوسرا خط جو ہمیں ملتا ہے وہ ۱۹/ مئی ۱۹۳۸ء کا ہے۔ ۸/ مارچ ۱۹۳۸ء علامہ اقبالؔ کے مشورے پر مولانا مودودی حیدرآباد سے پنجاب منتقل ہوئے اور ادارہ دارالاسلام پٹھان کوٹ کی بنیاد ڈالی۔ حیدرآباد سے روانگی سے چند روز قبل مولانا مودودی نواب صاحب کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گذرے رہے تھے لیکن قائدِ ملت سے وداعی ملاقات کے لئے تشریف نہیں لائے جس کا نواب

صاحب کو بڑا ملال ہوا، اس خط میں مولانا کو دیکھنے کے بعد قائدِ ملت کے اشتیاقِ دید کی پیاس کے بڑھ جانے کا ذکر بھی ہے کہ چہرہ مبارک تبدیلی کے ساتھ دیکھا جس کے بعد بے اختیار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

نواب صاحب نے تو شیطاں کے استرے کو عنفواں شباب سے نفرت کی نظر سے دیکھا تھا انھیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ان کے دوست مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دیر سے سہی مگر شیطاں کے استرے سے دوری اختیار کر کے اپنے علم اور تقویٰ کے تقاضوں کی تکمیل فرمائی۔

مولوی ابوالاعلیٰ مودودی

مدیر ’ترجمان القرآن‘ دارالاسلام پٹھان کوٹ، پنجاب

مکرمی زادت الطافکم!

آپ کی حیدرآباد سے روانگی کے چند روز قبل اپنے محلے میں آپ کو دیکھا تھا اور چہرہ میں اس مبارک تبدیلی کے ساتھ دیکھا تھا جس کے بعد بے اختیار دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا لیکن افسوس کے آپ نے جاتے ہوئے ملاقات کرنا بھی گوارہ نہ کیا۔ بہرحال دُعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو خوش رکھے اور اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ شوال کے پرچے میں آپ نے جو دارلاسلام کا نقشہ کھینچا ہے اس نے اشتیاقِ دید کو بڑھا دیا ہے۔ خدا کرے کسی روز آؤں اور وہاں کے بندگانِ حق پرست کو دیکھوں اور استفادہ کروں۔

والسلام

آپ کا مخلص

بہادر خاں

(حوالہ : خط نمبر ۶۹ صفحہ ۱۲۳ مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ مؤرخہ ۱۹/ مئی ۱۹۳۸ء)

نواب بہادر یار جنگ کے مزید دو خط جس میں ایک ۱۹۴۱ء کا ہے اس خط کا ایک حصہ مولانا کی کتاب دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کے دوصد سالہ تعلقات کے معاوضہ سے متعلق ہے۔ صرف اسی حصہ کو نقل کیا جا رہا ہے اور خط کا دوسرا حصہ جماعتِ اسلامی سے متعلق ہے۔ اسے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے ایک نزاعی خط کے تذکرہ میں اسی باب میں نقل کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

ایڈیٹر ترجمان القرآن، لاہور

مکرمی زادت الطافکم!

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے آپ کی کتاب دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کی دوبارہ اشاعت کی اجازت چاہی تھی۔ حیدرآباد کی عبدالحق اکاڈیمی نے اس کو دوبارہ شائع کیا اور اس پر جو نوٹ ناشر کی طرف سے لکھا گیا اس میں آپ کی ہدایت کے بموجب یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ آپ کی ایک پرانی تالیف ہے۔ میں نے ناشرین سے آپ کا حق تالیف ایک سو پانچ کلدار آپ کی منظوری کی اُمید پر طئے کرلیا تھا جو علاحدہ منی آرڈر کے ذریعہ مرسل خدمت ہے قبول فرما کر ممنون فرمایئے۔ (حوالہ : خط نمبر ۱۸۰ مکاتیب بہادر یار جنگ)

۳۱/ مئی ۱۹۴۲ء کے خط میں عہدِ اسلامی سے سقوطِ سلطنت، قطب شاہی اور آصف جاہ سادس کے عہد تک کی تاریخ جو مولانا مودودی نے مرتب فرمائی تھی اس کی اشاعت اور دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کے تیسرے ایڈیشن کے معاوضہ روانہ کئے جانے کا ذکر مذکور ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر ترجمان القرآن، لاہور

مکرمی! مولوی اقبال سلیم صاحب مہتمم دارالاشاعت سیاسیہ سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے ابتداء عہدِ اسلامی سے سقوطِ سلطنت قطب شاہیہ تک دکن کی تاریخ مرتب فرمالی ہے اور اس کے بعد سے آصف جاہ سادس کے عہد تک کی تاریخ کے نوٹس بھی مرتب فرمالئے۔ دارالاشاعت سیاسیہ کے لئے آپ کی اس تاریخی کاوش کا شائع کرنا باعثِ مسرت وافتخار ہوگا۔ جس قدر کام مکمل ہے وہ بغرضِ اشاعت روانہ فرمادیجئے اور اس کے معاوضہ کا بھی تعین فرمادیجئے تاکہ اشاعت شروع کردی جائے اور جو کام تکمیل طلب ہے اس کے لئے اگر ضرورت ہو تو میں کسی قابل نوجوان کو آپ جب فرمائیں آپ کی امداد کے لئے لاہور روانہ کردوں ''دولتِ آصفیہ وحکومتِ برطانیہ'' کے دوسرے ایڈیشن کا معاوضہ روانہ کر چکا ہوں، تیسرے ایڈیشن کا انشاء اللہ ماہ جون کے ختم تک حاضر خدمت کردوں گا۔ (حوالہ : خط نمبر ۲۹۵ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

اس طرح ان خطوط میں مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ کے دوصد سالہ تعلقات کی اشاعت اور اس کے معاوضہ کے سلسلے میں اور تاریخ دکن کے تعلق سے نواب صاحب کی دلچسپیوں کا اظہار ہوتا ہے اور شخصی تعلقات جو علمی بنیاد پر قائم تھے اس کی جھلک بھی نمایاں ہے ایک علمی اور مذہبی پس منظر سے مولانا ابوالاعلیٰ کی شخصیت اُبھری اور ۱۲/ ستمبر ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کے بعد مولانا جماعتِ اسلامی کے امیر منتخب ہوئے (مخفی مباد قیام پاکستان کے نظریئے کی مخالفت کے باوجود مولانا نے اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ تیار کرنے کے لئے مسلم لیگ کی کمیٹی میں بھی شرکت فرمائی) اب مولانا ابوالاعلیٰ کی فکر ونظر کا حامل ہی وہ مسلماں تھا جوان کا مطلوب انساں تھا۔

تفصیلات سے قطع نظر کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا کی سیاسی سرگرمیاں، انتخابات میں جماعتِ اسلامی کا حصہ، مولانا کو سزائے موت کا حکم، جمہوریت کی بحالی اور دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد وغیرہ مختصر یہ کہ آخری دور میں مولانا مذہبی شخصیت سے زیادہ سیاسی حیثیت کی حامل شخصیت بن گئے

مولانا کی تحریک (جماعتِ اسلامی) کے سلسلے میں نواب صاحب کی رائے معلوم کرنے کے لئے ان کی جماعت کے اصحاب نے نواب صاحب سے ملاقاتیں بھی فرمائیں اور خطوط کا تبادلہ بھی ہوا عنایت اللہ اثری کو اپنے ایک جوابی خط کے ذریعے نواب صاحب نے اپنی جس آزادانہ رائے سے مطلع کیا جو اربابِ متعلقہ کی طبع نازک پر گراں گذرا ذیل کا خط وہی ہے۔ مجھے صرف اس کے طریقہ کار سے اختلاف ہے۔ ایک تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جماعت ایک مستقل فرقہ نہ بن جائے اور اس کے ارکان اس میں شریک نہ ہونے والوں کو اسلام سے خارج نہ تصور کرنے لگیں۔

(حوالہ : خط موسومہ عنایت اللہ اثری مؤرخہ ۱۰/ جنوری ۱۹۴۲ء مشمولہ یادوں کے خطوط خط نمبر ۳۴ صفحہ ۸۹)

متذکرہ خط کے فوری بعد عنایت اللہ اثری صاحب کے خط کے جواب میں پھر ایک تفصیلی وضاحت پر مبنی خط نواب صاحب نے تحریر فرمایا :

عزیز مکرم!

آپ کا تفصیلی خط پہنچا۔ امر بالمعروف کا شکریہ جیسا کہ میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری جماعت میں برے بھی شریک ہیں۔ لیکن حاشیہ نشینان بارگاہِ نبوت میں بھی

عبداللہ بن ابی جیسے لوگوں کی موجودگی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اگر آپ جماعتِ اسلامی کے اُصول کے ساتھ، اس کے طریقہ کار کو بھی اچھا سمجھتے ہیں تو اس میں ضرور شرکت کیجئے۔ میں اس مسئلہ میں فی الحال خاموش رہنا چاہتا ہوں آپ کے استاد جب حیدرآباد تشریف لائیں تو مجھے ان سے مل کر بہت مسرت ہوگی اور ان سے اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ نے دیکھا کہ میرا یہ اندیشہ کہ عنقریب یہ جماعت یہ ایک فرقہ بن جائے گی۔ آپ کے پہلے ہی خط میں نمایاں ہونے لگا اور آپ دوسرے مسلمانوں کی برائی پر قلم اُٹھانے لگے اور مجھے انھیں بروں کے لئے کام کرنا ہے اور ان کو ساتھ لے کر کرنا ہے۔

(حوالہ : خط نمبر ۲۲۰ صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶ مؤرخہ ۳/ جنوری ۱۹۴۲ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ، کراچی)

متذکرہ خط نوکِ نشتر ثابت ہوا۔ جماعت کے بارے میں مولانا ابوالاعلیٰ کے مطلوب انساں کے بارے میں نواب صاحب کی رائے، ان کے ایک خط کے ایک سطر میں جو بیاں کی گئی ہے، طنز کا شاہکار ہے۔ ''دُعا فرمایئے کہ خدا ہندوستان کے ہر مسلمان کو اور خصوصاً مجھے آپ کے معیار پر مسلمان کرے''۔ (صفحہ ۲۹۵ موسومہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مؤرخہ ۳۱/ مئی ۱۹۴۲ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ، کراچی)

خود ابوالاعلیٰ صاحب کو بھی نواب صاحب نے ان کی تحریک کے بارے میں اپنے اختلاف سے آگاہ فرمایا تھا۔

جماعتِ اسلامی سے متعلق آپ کی کوششوں کا غور سے مطالعہ کررہا ہوں اس کے مقاصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن طریقۂ کار میں مجھے بعض اُصولی اختلافات ہیں۔ کئی سال سے ملنے کا متمنی ہوں اگر کبھی ملوں گا تو گفتگو کروں گا۔ اخبارات کے کالموں یا پلیٹ فارم پر اختلاف کو اس وقت تک اچھا نہیں سمجھتا جب تک کسی شدید اجتماعی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

(حوالہ : خط نمبر ۱۸۰ صفحہ ۲۲۶ مؤرخہ ۲۲/ ڈسمبر ۱۹۴۱ء مشمولہ مکاتیب بہار یار جنگ، کراچی)

متذکرہ خط میں ''اگر کبھی ملوں گا تو گفتگو کروں گا'' تحریر فرمایا ہے۔ اس خصوص میں مولوی عبدالرحمٰن سعید (سعید صدیقی) رفیق قائدِ ملت کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ اس خصوص میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور قائدِ ملت کی ایک ملاقات تحریک جماعتِ اسلامی کے سلسلے میں ہوئی۔

جب مولانا حیدرآباد سے ہجرت کر گئے اور جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس سلسلہ

میں ان کا لٹریچر منظر عام پر آنے لگا تو جماعت کی دستور کی بعض دفعات علمی حلقوں میں بحث وتنقید کا موضوع بن گئیں۔

مولانا جب کبھی حیدرآباد آتے تو نواب صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ایک دفعہ مولانا کو نواب صاحب نے ظہرانہ پر مدعو کیا تھا۔مقامی چند خاص افراد کو بھی اس صحبت میں شریک کیا گیا تھا (جن میں رشید صاحب (پروفیسر غلام رشید) اور خود میں بھی شریک تھا) اس موقعہ پر جماعتِ اسلامی کے بعض اُصولوں پر گفتگو رہی۔نواب صاحب نے اورلوگوں کو بحث میں حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔خود نواب صاحب اور مولانا کے درمیان مکالمہ ہوتا رہا۔پوری بحث تو حافظے میں باقی نہیں رہی۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ گفتگو جماعت کے دستور کی بعض دفعات میں شدت پر مذکور تھی۔مولانا کسی طرح دستور میں ترمیم کے قائل نہ رہے۔(مکتوب شکاگو از مولوی عبدالرحمٰن سعید)

سخن گسترانہ بات

جماعتِ اسلامی حیدرآباد کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو ''نائب امیر'' کے عہدے کے لئے کوئی مناسب آدمی مطلوب تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ہزاروں چاہنے والے پیدا ہو چکے تھے اور تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ دوسری طرف بہادر یار جنگ دس کروڑ برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب پر حکمراں تھے اور انھیں جماعتِ اسلامی سے اختلاف تھا۔ایسی صورت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دل میں دکن میں نائب امیر کے عہدے کے لئے بہادر یار جنگ کی یاد کیوں آئی اور پھر بہادر یار جنگ میں بعض خوبیاں ضرور ہیں مگر؟ کے ساتھ اتحادالمسلمین اور مسلم لیگ کی مخالفت بھی اس خط میں شامل ہے۔

اس خط سے جو ۲/ جنوری ۱۹۴۲ء کا ہے صرف یہ تاثر ملتا ہے کہ مولانا نواب صاحب کے بارے میں ان کی جماعت سے نواب صاحب کے اختلاف رائے کے جواب میں ان کے (Image) شخصیت کا اعتادِ عمومی خصوصی متاثر کرنا چاہتے تھے مولانا کے متذکرہ خط میں اختراعی الزامات کی فہرست بھی شامل ہے۔خط ——— ملاحظہ ہو ———

''مجھے اب تک ریاست حیدرآباد کے لئے کوئی مناسب آدمی ایسا نہیں ملا جو وہاں نائب امیر بنایا جاسکتا ہو اور اس لئے وہاں جماعت کی تنظیم میں مشکلات محسوس کر رہا ہوں، وہاں جتنے نمایاں لوگ

ہیں وہ یا تو ملازم ہیں یا وظیفہ خوار یا حکومت کے متوسل۔ کوئی ایسا آدمی، نظر نہیں آتا جو اعلیٰ درجہ کا مدبر بھی ہو اور پھر علم دین بھی رکھتا ہو اور ساتھ ہی لا نـجات فی الله لو متہ لائج اور لم یخش الا اللہ کا مصداق ہو۔

اور حیدرآباد کے خداوند کی بندگی ——— میں بندھا ہوا نہ ہو۔ بہادر یار جنگ میں بعض خوبیاں ضرور ہیں مگر اول تو ان کا ذہن ابھی تک صاف نہیں ہے۔ خلافت الٰہیہ کی آواز بھی بلند کرتے ہیں اور پھر بھی خاکسار تحریک اور کبھی مسلم لیگ اور کبھی حیدرآبادی و غیر حیدرآبادی کے جھگڑوں میں بھی پھنستے ہیں، دوسرے ابھی بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو۔ مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے ——— حالاں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مہاراج گان میسور و کشمیر وغیرہ کی فرمانروائی جتنی غلط ہے اتنی ہی خاندان آصف جاہی کی فرمانبرداری بھی غلط ہے۔ میں اس کو دیانت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ہم محض مسلمان قوم کے مفاد کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تو مذمت کریں مگر نام نہاد مسلمان رئیسوں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تعریف و توصیف اور حمایت کے لئے کھڑے ہو جائیں، اس قسم کی جانبداریوں کے ساتھ ہم نے اسلام کی تبلیغ کی اور خلافتِ الٰہیہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی تو یقین جانئے کہ کوئی غیر مسلم ہمیں اپنی دعوت میں سچا ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ لہٰذا میں حیدرآباد میں کسی ایسے شخص کو جماعت کا ذمہ دار قائد بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں جو دل میں تو اس ریاست کو غیر اسلامی سمجھتا ہو مگر ظاہر میں نظام کی وفاداری کا دم بھرے۔

(حوالہ : یادوں کے خطوط مرتبہ اسلامی مکتبہ حیدرآباد ناشر مولانا محمد یونس خط نمبر ۲۹ مؤرخہ ۲/ جنوری ۱۹۴۲ء)

مولانا نے اپنے اس مکتوب میں الزام عائد کیا ہے کہ ''بہادر یار جنگ میں بعض خوبیاں ضرور ہیں مگر اول تو ان کا ذہن ابھی تک صاف نہیں ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کی آواز بھی بلند کرتے ہیں اور پھر بھی خاکسار تحریک اور کبھی مسلم لیگ اور کبھی حیدرآبادی و غیر حیدرآبادی کے جھگڑوں میں پھنستے ہیں''۔ ۱۹۴۳ء میں نواب صاحب کا خاکسار تحریک سے تعلق باقی نہ رہا تھا۔ خاکسار تحریک سے وہ اس لئے وابستہ تھے کہ آریہ سماج، راشٹریہ سیوک سنگھ ہندو مہا سبھا کی جارحانہ فرقہ پرستی کے جواب میں خاکسار تحریک کو وہ وقت کی ضرورت سمجھتے تھے وہ اس خصوص میں فرماتے ہیں ''اگر عہدِ حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول کی پیروی سے غفلت برت رہے

ہیں۔آقائے دو جہاں کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار، نہ لونڈیاں نہ غلام، نہ املاک تھے نہ تجارت لیکن اُمہات المؤمنین کے تنگ حجرے اگر آپ کے کسی اثاثہ ومتروکہ سے بھرے ہوئے تھے تو وہ آپ کی تلواریں، آپ کی زرہیں، آپ کے خورد اور آپ کی کمانیں تھیں، میں مسلمانوں کو اسوۃ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطورِ خاص متوجہ کرتا ہوں۔ میں ان کے ہر ایک فرزند کو خالدؓ اور ابوعبیدہ کا غلام دیکھنا چاہتا ہوں۔(حوالہ : خطبات قائدِملت صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸ مرتبہ نذیرالدین احمد)

''کبھی مسلم لیگ''، نہیں بلکہ ازابتدا تا انتہا اتحادالمسلمین، مسلم لیگ اور اسٹیٹ مسلم لیگ کے وہ عظیم رہنما رہے کبھی ''حیدرآبادی وغیرحیدرآبادی'' یہ تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں وہ تو سارے ہندوستان (برصغیر) کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں مصروف بہ کار رہے۔ ایک اور دلچسپ اعتراض کہ ''ابھی بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے'' حالاں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مہاراجگاں میسور و کشمیر وغیرہ کی فرمانبرداری جتنی غلط ہے اتنی ہی خاندان آصف جاہی کی فرمانبرداری بھی غلط ہے میں اس کو دیانت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ ہم محض مسلمان قوم کے مفاد کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تو مذمت کریں مگر نام نہاد مسلمان رئیسوں کی غیر اسلامی حکومتوں کی تعریف وتوصیف اور حمایت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

بہادر یار جنگ نے اپنا خطاب اور جاگیر نظام کو واپس کر دی تھی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں اتنا عظیم ایثار کسی مسلمان رہنما نے نہیں کیا، وہ نظام کو صرف مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر سمجھتے تھے۔نظام نے نشہ اقتدار میں ایک شعر یوں کہا تھا

سلاطین سلف سب ہو چکے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

تو بہادر یار جنگ نے دوسرے ہی دن اس کا جواب دیا تھا کہ

سلاطین سلف سب ہو چکے نذر اجل عثماں
مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشاں باقی

بہادر یار جنگ پر شاہ پرستی کے زیرعنوان لگائے گئے اس تفصیلی الزام کے جواب میں خود مولانا اگر اپنی گریباں میں جھانک لیتے تو صدا آتی۔ 'آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا'

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف ''دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ'' کے دوصد سالہ تعلقات نامی کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل میں نے خود ہی اس موقع پر لکھی تھی جب نظام مرحوم نے برار کا مسئلہ ازسرنو چھیڑا تھا۔ (حوالہ : خط نمبر ۴۳ صفحہ ۱۰۰ یادوں کے خطوط)

یہ کتاب سر علی امام، صدر اعظم حکومت آصفیہ نے مولانا کو معاوضہ دے کر لکھوائی تھی۔ سلاطین عہدِ اسلامی سے سقوطِ قطب شاہیہ تک کی تاریخ مرتب وشائع کی اور آصف جاہ سادس تک کی تاریخ مرتب فرمالی۔ ہر دو کتابیں تحقیقی مواد اور منفرد اندازِ بیاں کے باعث حوالوں کی کتابوں میں شامل ہیں۔ دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ والی کتاب میں دستاویزی ثبوت کے ساتھ نظام آف حیدرآباد کے استرداد برار پر دستوری حق کی حمایت میں سیر حاصل مواد سپردِ قلم کیا گیا ہے اور دکن کی تاریخ میں شاہوں کی شاہی کی مدح سرائی کی گئی۔ ہر دو کتابیں مولانا کی شاہ پرستی یا زر پرستی کی زندہ یادگار ہیں۔

فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

یہ ہر دو کتابیں جو مولانا ابوالاعلی مودودی کے قلم کی رہین منت ہیں ان کا یہ کہا خود انھیں پر صادق آتا ہے۔ ''بادشاہ پرستی کا پھندا ان کے دل پر چاہے نہ ہو مگر ان کی گردن میں ضرور پڑا ہوا ہے'' بڑے آدمی جھوٹ نہیں بولتے یہ چھوٹوں کا حسن ظن ہے۔ تحقیق کی صداقت جب اس مفروضے کو آئینہ دیکھاتی ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہوں اور مولویوں کی اَنا کی تسکین کے اس واحد سہارے کو ان سے چھینا نہیں جاسکتا۔ صرف یہی ایک متذکرہ خط ہے جس سے ''سخن گسترانہ بات'' پیدا ہوئی ویسے نواب صاحب مولانا کی بے حد قدر کرتے تھے اور خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دل میں نواب صاحب کا جو مقام تھا اس کا اندازہ ان کے اس تعزیتی بیان سے ملتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں :

''بہادر یار جنگ مرحوم میرے دوست تھے اور میں نے ہمیشہ ان کے خلوص پر اعتماد کیا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ ایسا جوہر قابل بڑے نازک موقعہ پر ان سے چھن گیا۔ اب ان کی یاد منانے سے بڑھ کر ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان ان کی زندہ یادگار بننے کی کوشش کریں''۔

(بحوالہ : انجام کراچی ۲/جولائی ۱۹۵۶ء)

پھر بھی اُونچے تیری مسجد کے منارے نکلے

علامہ اقبالؔ اور

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ

ہم مولانا روم کے کلام میں سورج کی روشنی میں چراغ جلا کر ایک بزرگ کو تلاش کی منزل میں سرگرداں دیکھتے ہیں۔ جب ان بزرگ سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُجالے میں چراغ لئے آپ کس کو تلاش کرر ہے ہیں تو فرمایا کہ ایک مردِ کامل کی تلاش ہے، مولانا روم کو جس مردِ کامل کی تلاش تھی وہ دانائے راز اقبالؔ کی صورت میں، ان کے افکار کا علمبردار، ان کا مطلوبہ مرید، ان کو مل گیا۔

اقبالؔ کا پیام دراصل قرآن کا مطلوب انسان تھا۔ ایک ایسا مردِ مجاہد جس کی زندگی کا نصب العین، ملت کی نشأۃ ثانیہ اور احیاء دین ہو اور جس کا قلب، خلافتِ الٰہیہ کے تصور سے مزین ہو، بارگاہِ رب العزت میں اقبالؔ نے دل کی گہرائیوں سے دُعا مانگی تھی۔

تا خلافت کی بنا دُنیا میں پھر ہو استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

اس طرح خلافتِ الٰہیہ کے تصور پر مبنی، خلافت کے قلب وجگر کی اقبالؔ کو تلاش تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ’’ اُنیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے دور اول تک مسلمانوں میں صرف چار شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کو ماضی کے آئینہ میں دیکھا اور حال کی اُلجھنوں میں پھنسا پایا اور خوش آئند مستقبل سے دور دیکھا۔ پھر ماضی کی عظمت کی حقیقتوں کا جائزہ لیا، حال کو مطابق حال بنانے کی کوشش کی اور مستقبل کے لئے راستے ہموار کئے، ان میں جمال الدین افغانی، علامہ اقبالؔ، قائداعظم محمد علی جناح اور محمد بہادر خاں (بہادر یار جنگ) شامل ہیں‘‘۔

(حوالہ : اقبالؔ اور قرآن از علامہ سلیمان ندویؒ)

’’اقبالؔ اور بہادر یار جنگ کا اصل رابطہ اطاعتِ خدا اور عشق رسول کی رسی سے بندھا ہوا ہے

اقبالؔ نے فنا فی اللہ ہوکر مقام خودی پر فائز ہونے کی جو آرزو کی تھی اس کا حاصل بہادر یار جنگ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ دونوں کا فکری ارتکاز توحید اور رسالت محمدیؐ کے علاوہ کچھ اور نہ تھا‘‘۔

(حوالہ : مردِ مومن از مولوی میاں محمد سعید مشمولہ نظریۂ پاکستان کے عظیم مبلغ صفحہ ۱۲۸)

’’ان کی فکر و نظر کا ایک سر چشمہ شیریں کلام اقبالؔ تھا۔ اقبالؔ کے کلام میں انھیں قلب و نظر کا ایک آئینہ مل گیا تھا‘‘۔

(حوالہ : پروفیسر غلام دستگیر رشید مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۲۹)

اقبال مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ سے محمد بہادر خاں کا کتابی تعلق و تعارف سولہ سترہ سال کی عمر سے رہا۔

آخری دور میں اگر کسی کے کلام نے اقبالؔ کے کلام کا ساتھ دیا تو مولانا روم کی مثنوی تھی۔

(حوالہ : میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا مشمولہ نگارشات بہادر یار جنگ صفحہ ۵۹ مرتبہ نذیر الدین احمد)

۱۹۳۱ء تک مسلمانوں کے قائد اور خطیب سحر البیان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں ان کی شہرت کا ڈنکا بج چکا تھا، اس وقت ان کی عمر صرف ۲۶ برس تھی اور اس وقت تک ان کی نظر اقبالؔ کی فکر کے عمیق گوشوں تک رسائی پا چکی تھی۔ وہ اقبالؔ کی فکر، کام، کلام اور مقام سے اس درجہ واقف اور متاثر تھے کہ اس تاثر نے ان کو اقبالؔ کا گرویدہ بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبالؔ کے الہامی کلام نے انھیں، اقبالؔ کی نوائے عاشقانہ کا حاصل بنا دیا۔ اقبالؔ کے دردِ دل کو جس مردِ حق نے سمجھا اور اوروں کو سمجھایا وہ محمد بہادر خاں کی ذات تھی۔ ابتداء میں خود اقبالؔ کو اس امر کی شکایت تھی کہ اقبالؔ کو شاعر سمجھنے والوں کی تو کمی نہیں ہے لیکن ان کے پیام کو سمجھنے والے کم ہیں۔

’’لوگوں نے شمع کا نور دیکھا، لیکن اس کے سوزِ دل کا اندازہ نہیں کیا۔ جگنو کی چمک دیکھی لیکن اس عاشق وارفتہ کی جگر سوزی اور اضطرار کا راز جان نہ سکے۔ اقبالؔ کو شکایت تھی کہ لوگوں نے انھیں شاعر اور مغنی سمجھ لیا ہے لیکن اس پیام پر ان کی نظر نہیں گئی جوان کی نوائے عاشقانہ کا حاصل تھی‘‘۔

(حوالہ : کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا از محترم المقام مولوی سید خلیل اللہ حسینی قائد مرکزی تعمیر ملت مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں مرتبہ نذیر الدین احمد صفحہ ۲۲)

علامہ اقبالؔ سے نواب بہادر یار جنگ کی پہلی ملاقات

خواجہ حسن نظامی کو قائدِ ملت کی علامہ اقبالؔ سے عقیدت و محبت اور ان کی والہانہ وابستگی کا علم تھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبالؔ نے دہلی کا دورہ فرمایا، دہلی میں وہ ڈاکٹر انصاری کے مکان میں مقیم رہے، نواب بہادر یار جنگ ان دنوں دہلی میں تھے۔ ۱۳/مارچ ۱۹۳۳ء کے دن مولانا خواجہ حسن نظامی کے ہمراہ نواب صاحب نے پہلی بار علامہ اقبالؔ سے ملاقات فرمائی۔

مولانا خواجہ حسن نظامی نے علامہ کی مصروفیات کا ہفتہ وار روزنامچہ دہلی مؤرخہ ۱۶ / مارچ ۱۹۳۳ء میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''۱۳/مارچ ۱۹۳۳ء کو بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم تھے، نواب بہادر یار جنگ ان کے مداح اور معتقد ہیں۔ میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ سے ان الفاظ میں تعارف کروایا۔

''اگر آپ بادشاہ ہیں تو یہ آپ کے سپہ سالار ہیں اور اگر آپ شمع ہیں تو یہ آپ کے پروانے ہیں اور اگر آپ دانا ہیں تو یہ آپ کے دیوانے ہیں''۔ (حوالہ : اوراقِ گم گشتہ ازرحیم بخش شاہین صفحہ ۲۶)

علامہ اقبالؔ سے قائدِ ملت کی دو ایک اور ملاقاتوں کا مزید حال بھی علم میں آتا ہے مگر کتنی مرتبہ نواب صاحب کو علامہ اقبالؔ سے نیاز مندی کا موقعہ ملا۔ اس بارے میں عدم معلومات کے باعث کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔

علامہ اقبالؔ کی نواب صاحب سے خط و کتابت کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبالؔ کی موجودگی میں اقبالؔ کا تصور شاہین پر ——— تقریر کرنے اور داد پانے کا مژدہ بھی سننے کو ملتا ہے۔ اس تقریر کا ذکر نواب صاحب نے یومِ اقبالؔ کے جلسے میں تقریر کے دوران فرمایا تھا :

''آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبالؔ کی زندگی میں اقبالؔ کے تصور مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد اپنا تحفۂ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دُعاؤں کی اُمید پر پیش کر رہا ہوں''۔

۱۹۳۳ء میں علامہ اقبالؔ نے پہلی بار قائدِ ملت کو بذریعہ خط مخاطب فرمایا تھا۔ اس وقت تک

علامہ اقبالؔ نواب صاحب سے غائبانہ تعارف رکھتے تھے۔ یہ خط کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اعانت سے متعلق ہے۔

لاہور ۱۴/ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب نواب صاحب!

السلام علیکم

مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے آپ سے درخواست کے لئے یہ عریضہ لکھا ہوں۔ اس وقت حکومت کی طرف سے ان پر متعدد مقدمات چل رہے ہیں، جس کے اخراجات وغیرہ کے لئے فنڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ اس سے پہلے ایک خط مجھے ایک بزرگ محمد اعظم خاں عثمان آباد کی طرف سے آیا تھا۔ انھوں نے خود بھی چندہ کر کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا اور مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کی توجہ اس طرف منعطف کروں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مسلمانانِ کشمیر کو امداد کا مستحق تصور کرتے ہیں۔

باطبع اور ذہین قوم ایک مدت سے استبداد و ظلم کا شکار ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کا فرض ہے کہ ان کے موجودہ مشکلات میں ان کی مدد کی جائے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ یہ خط خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے معرفت آپ تک پہنچا تا ہوں۔ مجھے آپ کا اڈریس معلوم نہ تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ میرا خط کسی اور طرف چلا جائے۔

مخلص

اقبالؔ

نواب صاحب کے ایک خط سے علامہ اقبالؔ سے نواب صاحب کی خط و کتابت کے سلسلے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مذکور خط نواب صاحب نے شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر شعبۂ معاشیات کے نام لکھا تھا۔

''اس سے قبل بھی تحریر کر چکا ہوں کہ مکاتیب اقبالؔ (موسومہ قائدِ ملت) کا آپ سے زیادہ میں متلاشی ہوں، اپنے کاغذات کا ایک ایک پرچہ تلاش کیا لیکن افسوس ہے کہ وہ طبلق ہاتھ نہ آیا''۔

(حوالہ : خط نمبر ۴۸۲ مکاتیب بہادر یار جنگ جلد اول)

قائدِ ملت علامہ اقبالؔ سے اپنی دوسری ملاقات کے سلسلے میں یہ دلچسپ واقعہ بیان فرماتے

تھے کہ ''ایک بار لاہور گئے اور اس کی انھیں بڑی تمنا تھی کہ وہ اقبال کو شعر کہتے ہوئے حال میں دیکھیں خوش قسمتی سے وہ بہت سویرے آہ سحر خیزی کے وقت جاوید منزل پہنچ گئے، حسبِ عادت اقبال تلاوت سحر کے بعد شعر کہنے میں محو تھے، علی بخش مرحوم کی مدد سے نواب صاحب بڑی خاموشی سے ان کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ اقبال اپنی شعر گوئی اور گنگنانے میں محو تھے۔ یہ مشغلہ ختم ہوا تو باہمی گفتگو ہوئی۔ یہ واقعہ ایک نمونہ اور علامت ہے کہ وہ اقبال اور کلامِ اقبال سے کس طرح دل بستگی رکھتے تھے''۔

(حوالہ : اقبال اور قائدِ ملت بہادر خاں مرحوم از پروفیسر غلام دستگیر رشید (رفیق قائدِ ملت)

مشمولہ بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں صفحہ ۲۹ ناشر بہادر یار جنگ اکیڈمی، حیدر آباد دکن)

نواب صاحب کی علامہ اقبال سے تیسری ملاقات کے بارے میں مولوی عبدالرحمٰن سعید رفیق قائدِ ملت تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس دوسری ملاقات کے تیسرے روز نواب صاحب نے بہ تعیین وقت حضرت اقبال سے ملاقات کی اور ملتِ اسلامیہ کی تنظیم اور اس کے مستقبل کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال کیا۔

بوقتِ رخصت مصافحہ کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا کہ یہ مصافحہ اس امر کا عہد ہے کہ نواب صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدمتِ ملت کے لئے وقف کریں گے۔

(حوالہ : صدق جدید لکھنؤ ۱۷/ اگست ۱۹۷۳ء)

متذکرہ تیسری ملاقات کے بارے میں قائدِ ملت کے ایک اور رفیق مولوی محمد احمد خاں صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ''اس ملاقات کی بہادر یار جنگ نے تفصیلات تو نہیں بتائیں۔ البتہ اتنا ضرور کہا تھا کہ لندن کی گول میز کانفرنس میں مملکتِ حیدر آباد کے تعلق سے سر اکبر کا رول نہایت نامناسب تھا''۔

سر اکبر حیدری کی شخصیت بڑی نزاعی رہی۔ سر اکبر کا ذہن کانگریس اور قومی تحریکوں سے متاثر رہا۔ غیر منقسم ہندوستان کے نقشہ میں حیدر آباد انھیں صرف ایک ریاست ہی نظر آتا رہا۔ ہندو اکثریت سے آباد اور ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی ریاست، سر اکبر حیدری کی سیاسی فہم و فراست کا محور دراصل انگریز ریزیڈنٹ کی چہار دیواری تھی۔ انگریزوں کی اکثریت نوازی حیدر آباد میں سر اکبر کی حکمتِ عملی کی شکل میں کارفرما تھی۔

دین اور آئین او سوداگری ست
عنتری اندر لباس حیدری ست

مذکورہ بالا شعر کے متعلق بہادر یار جنگ نے اقبالؔ سے دریافت کیا تھا کہ حیدری کا اشارہ اکبر حیدری کی طرف تو نہیں ہے، جواب میں اقبالؔ نے لکھا تھا ''میں خوش ہوں کہ آپ میرا کلام اتنے غور سے پڑھتے ہیں''۔ (حوالہ : اکبر حیدری اور اقبالؔ صفحہ ۲۰۸، ۲۰۹)

بہادر یار جنگ سے روایت ہے کہ ان سے خود اقبالؔ نے کہا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کے دوران نجی طور پر وزیر ہند اور انگلستان کے دوسرے مدبرین سے حیدر آباد کے آئینی موقف کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور انھیں اپنے دلائل سے قائل کر دیا کہ حیدر آباد کو اس کے مفوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ مقبوضہ جاتی درجہ دے دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو۔ لیکن بد قسمتی سے خود حیدر آباد کے وفد کے سربراہ سر اکبر حیدری نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایسا عمل قبل از وقت ہوگا اور ممکن ہے اس اقدام سے ہندو جماعتیں ایجی ٹیشن کریں اور دوسری ریاستیں بھی ایسے ہی مطالبات نہ پیش کر دیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں سے مرعوب ذہنیت (سر اکبر حیدری) نے ایک عظیم مدبر (علامہ اقبالؔ) کے تاریخی اور انقلابی مشورہ کو پہلی ہی منزل میں مسترد کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں حیدر آباد کے مستقبل کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈھکیل دیا۔

اس سعی پر خلوص کی ناکامی کا اقبالؔ کو آخر تک افسوس رہا۔

(حوالہ : اقبالؔ اور حیدر آباد دکن از نظر حیدر آبادی)

علامہ اقبالؔ سے قائدِ ملت کی ملاقاتوں میں یہ واقعہ کہ ''جب بہادر یار جنگ رخصت کے لئے کھڑے ہوئے اور علامہ سے مصافحہ کے لئے انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو اقبالؔ نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور فرمایا۔ وعدہ کرو کہ ملت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دو گے''۔

آپ اسے مصافحہ رخصتی کہئے یا عہدِ خدمت، میں تو اس کو بیعت کہتا ہوں، بیعت جو ایک پیر مرد نے ایک جوان رعنا سے لی، گویا شیخ وقت نے سالک طریقت کو رسم و راہ منزل سے باخبر کر دیا۔ دُنیا جانتی ہے کہ اس بہادر جوان نے اپنی عمر کے شب و روز کس طرح گذارے۔ (حوالہ : علامہ اقبالؔ اور

بہادر یار جنگ از مولوی محمد احمد خان صاحب)

سچ تو یہ ہے کہ متذکرہ بالا واقعہ علامہ اقبالؔ کی نظر کلیمی کا مظہر ہے کہ قائدِ ملت کو علامہ اقبالؔ نے رسم وراہ شاہبازی کی منزل سے باخبر کر کے انھیں اپنے منصب کا جانشیں بنا دیا۔

بہادر یار جنگ کی زندگی، اقبالؔ کے مردِ مؤمن کی مکمل تفسیر تھی۔نواب صاحب نے اقبالؔ کے نظریات پر ملتِ اسلامیہ کی سیاست کی بنیاد رکھی، وہ اپنی جادو بیان تقریروں میں اقبالؔ کے آتشیں افکار کی گرمی سے قوم میں حوصلہ اور جذبہ پیدا کرتے اور غلاموں کے لہو کو سوزِ یقین سے بدل دیتے تب ہی تو کنجشک فرومایہ شاہین کے مقابل ہوئے۔

''اقبالؔ کو انھوں نے نہ صرف پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ اس کے کلام و پیام کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اقبالؔ کا قال ان کا حال بن گیا۔مرحوم خود اقبالؔ کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسم نمونہ تھے اور درسِ اقبالؔ کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبالؔ کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا''۔

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، رفیق قائدِ ملت)

درس اقبالؔ میں

طبع مسلم از محبت قاہر است
مومن از عاشق نہ بناشد کافر است

اقبالؔ کا یہ شعر مولوی غلام دستگیر رشید نے پڑھا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے قائدِ ملت سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

نواب صاحب یہاں تو اقبالؔ نے شاعری کی ہے۔اتنا سخت فتویٰ میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا ہے اور اس کا جواز قرآن میں ملتا ہو۔

قائدِ ملت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔اقبالؔ کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔**والذین امنوا اشد حبا للہ** (جو مومن ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبت ہوتی ہے) پھر اس آیت شریف کی تائید میں حدیث شریف پیش کی، جو شرط ایمان کا جزء لاینفک ہے ذات رسالتمآب سے محبت۔**لایومن احدکم حتی اکون احب الیه**

من والدہ وولدہ والناس اجمعین (یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری ذات اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام محبوبین سے زیادہ محبوب تر نہ ہو جائے تب تک وہ مؤمن نہیں)

علامہ اقبآل پر نواب صاحب کی کئی یادگار تقریریں ہیں، اقبآل کا مردِ مومن، اقبآل کا شاہین زادہ اور فکرِ اقبآل پر ان کی یادگار تقریروں میں دو تقریریں تو ایسی ہیں جس میں پوری تقریر اقبآل کی تشبیہات واستعاروں میں کی گئی ہے۔ حسن یار جنگ کے لئے یومِ اقبآل کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے نواب صاحب نے فرمایا کہ :

''میں حیران ہوں کہ یہ فرض میرے سپرد کیوں کیا گیا جب کہ مجھے انوری ہونے کا دعویٰ ہے نہ قانی ہونے کا۔ بہرحال ایک اقبال آفریدہ شاہین زادہ کی بزمِ اقبآل کے اس جلسہ کی تحریک صدارت کے لئے کھڑا ہوں۔

حضرات! آج تہذیبِ مشرق آپ اپنا خون بہانے میں مصروف ہے۔ شاخِ نازک پر بنے ہوئے آشیانے ایک ایک کر کے توڑے جا رہے ہیں، آج کسی کا آداب خود آگاہی سے واقف ہو جانا غلاموں کو شہنشاہی کے رموز سے واقف کرا دینا ہے۔ آج کسی کی ہوس رانی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کر رہی ہے، آج جاوید نامہ کا قلزم خونی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج ہندوستان کے پاؤں کی بیڑیاں وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں اور روح جعفرتن دیگر کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ ان حالات میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک صحیح آدمی ہی اس جلسہ کی صدارت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے جو نگاہ بلند رکھتا ہے۔ جس کا سخن دل نواز ہے اور روح پرسوز، جو آفاق میں گم نہ ہو گی ہو بلکہ آفاق کو اپنے میں گم کر لیا ہو، جس نے خاکبازی نہ سیکھی ہو بلکہ خودی کا درس سیکھ کر دوسروں کو خود آگاہ بنا دیا ہو اور میں یہ جذبہ نواب حسن یار جنگ بہادر میں پیدا ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بانگِ درا بند نہیں ہوئی ہے۔ ضربِ کلیم کی تاب کس کو ہے اور ضربِ کلیم کی تاب لانے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔ جاؤ پیامِ مشرق اس کے بعد کی منزل ہے شائد مسلمانوں کا یہ ڈی جز ئیڈ وہ طبقہ جس کو بیدار کرنے کے لئے اقبآل کھڑا ہوا جس دن وہ بیدار ہو جائے گا۔ اقبآل کو پڑھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس عہد میں جب کہ بانگِ درا کانوں سے اُتر کر قلب سے قریب تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کو ہی مقام شکر سمجھتا ہوں۔

حیدر آباد کے ایک شاہین زادہ کو جس کے اجداد کی شاہنیت حیدر آباد کے ہر باب پر ثبت ہے، جو حیدر آباد کی قسمت کو بدلنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریکِ صدارت کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا ٹھیک نہیں کہ اقبالؔ نوجوانوں کے لئے تڑپ کر مرا ہے اور آج ایک نوجوان اقبالؔ کے جلسہ کی صدارت کر رہا ہے۔ اس طبقہ سے جس سے میں مایوس ہوا جا رہا ہوں۔ یہ اُمید کی ایک کرن سے کم نہیں"۔ (حوالہ : اقبالؔ اور بزمِ اقبالؔ حیدر آباد دکن صفحہ ۹۳، ۹۴ از عبدالرؤف عروج دارالادب، کراچی پاکستان)

میرے نالے فضائے حیدر آباد سے کچھ اس طرح نا آشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبالؔ کی زندگی میں اقبالؔ کے تصورِ مؤمن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفہ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دُعاؤں کی اُمید پر پیش کر رہا ہوں۔

اقبالؔ کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے پورے کلام میں انھوں نے اسی چیز کو بہ انداز مختلف پیش کیا ہے، اس کے لئے انھوں نے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز وفضاء پیماء ہے، اقبالؔ کے کلام کا رنگ شاہ بازی سکھاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبت مرغِ چمن نہیں بلکہ وسعت ارض وسما ہے۔

اس سلسلہ میں انھوں نے فطرتِ انسانی کی بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت ومشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر ان کی باعزت انفرادی واجتماعی زندگی کا مدار ہے، ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبہ عزتِ نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی جبن اور پستیٔ خیال سے بدل جاتی ہے، اسی کو اقبالؔ نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابند قفس کر کے عطائے صیاد کا اُمیدوار بنادو تو چند روز میں بیٹر کے پر کی پھڑ پھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

چو شاہین زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد   تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد

تم غور کرو کہ کیا حیدرآباد کا مسلمان گذشتہ دوسو سال سے اندر قفس بادانہ ساختن کا عادی نہیں ہوگیا ہے اور کیا اسی کا نتیجہ آج شاہین زادہ کی سایۂ بال تدرو سے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک آرام وراحت زاغ وزغن کا کام ہے اور قید وصید کی بندشیں قسمت شاہین کی سعادت اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گذرتا عزت واحترام کے مقامِ رفیع کو حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ کہتے ہیں ۔

شہ پر زاغ وزغن در بند و قید وصید نیست

کیں سعادت قسمت شہ باز وشاہین کردہ اند

انھوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمتی چھوڑیں اور شاہین کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی دہر میں لیکن

شاہیں کا مقام اور ہے، کرگس کا مقام اور

اقبالؔ کے نزدیک علم وفراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ وسپر سے بھی آراستہ نہ ہو، ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مردِ غازی کی تیغ وسپر سے موانست ہے۔ فرماتے ہیں کہ ۔

من آں علم وفراست با پر کاہے نمی گیرم

کہ از تیغ وسپر بیگانہ ساز و مرد غازی را

(حوالہ : تقریر قائدِ ملت بعنوان اقبالؔ کا شاہین زادہ ۲۱/اپریل ۱۹۳۹ء کے جشن یومِ اقبالؔ منعقدہ زمرد محل میں فرمائی۔ مشمولہ بہادر یار جنگ کی غیر سیاسی تقریریں ——— مرتبہ نذیر الدین احمد)

علامہ اقبالؔ کے ایمان افروز انقلابی پیام سے قائدِ ملت اس درجہ متاثر تھے کہ ان کی کوئی تقریر یا تحریر ذکر وفکر اقبالؔ سے خالی نہ ہوتی۔

قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال سے ان کی ذہنی وابستگی دراصل روحانی رفاقت کا نتیجہ تھی۔

—◆◆◆—

محمد عزیز پاشاہ حیدرآباد

ریاست علی انور حیدرآباد

غوث محی الدین مقبول انجینئر

قاضی اشفاق احمد

محمد عبدالصمد دارالشفاء

محمد شہاب الدین انصار حیدرآباد

پربھنی کے سرسید جناب رشید انجینئر نے پربھنی میں ۱۶، ۱۷/ جنوری کو سوانح نگار بہادر یار جنگ کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا تھا۔ ماہ نامہ تاریخ کے خصوصی بہادر یار جنگ نمبر کا رسم اجراء سوانح نگار بہادر یار جنگ کے ہاتھوں عمل میں آیا

چاند پاشاہ واڑی

سید اسمٰعیل

مرزا قمبر علی بیگ حیدرآباد